''چہارسُو''

...... اُردوشاعری کا صدر دروازہ ......

''فیض احمد فیض''

اس حقیقت سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ فیض احمد فیض ایک عہد ساز شاعر ہیں اوران کے ہاں ترقی پسندانہ سوچ وفکر کے ساتھ جولب ولہجہ ہے وہ انہیں کے ساتھ مختص ہے اس حوالے سے وہ نظریہ ساز شاعر ہیں اوران کی تخلیقی فعالیت اور جمالیاتی شعور نے انہیں وہ رنگ وآہنگ عطا کیا ہے جو میر، غالب اوراقبال کے بعداُن کا مقدر بنا ہے یوں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ موافقین اور مخالفین دونوں نے ان کی نظریاتی اقداراوران کی عمر بھر پاسداری کا اعتراف کیا ہے اور یہی ان کی مقبولیت کا سبب بھی ہے کہ ''نسخہ ہائے وفا'' اپنی بھرپور معنویت کی آئینہ داری کرتا ہے۔اورآج کے عہدِ بے ثبات میں یہ بہت بڑی بات ہے اور یہی فیض صاحب کا کریڈٹ ہے کہ مختلف نظریہ اور عقیدہ ومسلک رکھنے کے باوجود ہرقاری ان کی شاعری کا حوالہ دیتا ہے۔اس طرح فیض پوری دنیا میں بسنے والوں کے بلاامتیاز رنگ ونسل مرغوب اور مقبول شاعر بن جاتے ہیں۔بلاشبہ فیض نے جوقلمی جہاد کیا ہے اوراس طرح اپنا مافی الضمیر لگی لپٹی رکھے بغیر لفظوں کی زبانی بیان کیا ہے وہ اُردوشاعری کا روشن ترین باب ہے۔

......ڈاکٹر طاہر تونسوی

قیمت:۶۰۰،دستیابی:جی سی یونیورسٹی،فیصل آباد۔

...... طاق میں رکھا سپنا ......

فریدہ حفیظ ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ان کی فنی تربیت حلقہ اربابِ ذوق میں ہوئی ہے۔جہاں ادب کوموضوع اورفن کا امتزاج سمجھا جاتا ہے۔کوئی موضوع اس وقت تک ادب نہیں بنتا جب تک وہ اس صنف کے فنی تقاضے پورے نہ کرتا ہو۔

فریدہ حفیظ کے افسانوں کا موضوع زندگی ہے،اوروہ اپنے سماجی وسیاسی منظرنامے میں اپنی پہچان کراتی ہیں۔انہیں کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔زبان میں نکھار اوراسلوب میں ایمائیت اُن کی کہانی میں دلچسپی جیسے لوازم کی غمازی کرتا ہے۔اور یہ کسی لکھنے والے کی بنیادی خوبی ہے۔

فریدہ حفیظ اردوافسانے میں اپنی پہچان رکھتی ہیں۔اُن کا یہ مجموعہ بھی اپنے قارئین کی توقعات پر پورا اُترے گا۔

......ڈاکٹر رشید امجد

اشاعت:۲۰۱۶ء، قیمت:۲۰۰روپے،دستیابی:مثال کتاب گھر،امین پور بازار،فیصل آباد۔

...... خوشبو میں نہاتے رنگ ......

''خوشبو میں نہاتے رنگ'' عطاء الرحمٰن قاضی کی۔۔۔رباعیوں کا مجموعہ ہے۔شاید گزشتہ چند برسوں میں صرف رباعیوں پر مشتمل کسی نوجوان شاعر کی یہ پہلی کتاب ہے۔ان رباعیوں میں جمالیاتی تنوع بھی ہے اور موضوعاتی رنگارنگی بھی۔عروض میرا موضوع نہیں ہے۔تھوڑی بہت آہنگ کی شُدھ بُدھ کی گواہی پر کہہ سکتا ہوں کہ فنی اعتبار سے بھی یہ کتاب آپ کو مطالعے پر متوجہ کرتی ہے۔نوجوان شاعر عطاء الرحمٰن قاضی کی یہ خوبصورت کوشش،نئی نسل کے دوسرے شعراء کورباعی کہنے پر مائل کرسکے تو یہ بھی ایک بڑی ادبی کامیابی ہوگی۔اختصار وآہنگ کی دل کش ودل نواز فضا میں نمود کرنے والی یہ صنفِ شعر اگر رواج پاجائے تو یہ کسی بڑے ادبی کارنامے سے کم نہیں ہوگا۔رباعی کے تمام کے تمام چوبیس اوزان میں اپنے جوہر کا اظہار کرتے ہوئے عطاء الرحمٰن قاضی نے رباعی کی شعری جمالیاتی روایت میں متنوع موضوعات کو سمونے کی بہت کامیاب اور خوبصورت کوشش کی ہے جس کی داد دی جانی چاہیے۔

......افتخار عارف

قیمت:۲۰۰روپے،دستیابی:نیلی بار پبلی کیشن،عارف والا۔

متاعِ چہارسو

سرِ ورق ---------------- اسلم کمال
پسِ ورق ------------ شعیب حیدر زیدی
تزئین ---------------- عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ------------------ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

رنگوں کی بہار ---------------- اقبال راہیؔ — ۵
منزلِ قلب ونظر ------------ محمد انعام الحق — ۶
اذنِ حضوری ------------- اعتبار ساجد — ۸
پرسشِ حال بھی نہیں -------- اعتبار ساجد — ۹
براہِ راست ---------------- گلزار جاوید — ۱۱
میرا عہدِ معتبر ------------ عائشہ ممتاز بھٹی — ۱۲
نشیب وفراز کا شاعر --------- احسان دانش — ۲۰
برگِ سبز است تحفۂ درویش ---- سید ضمیر جعفری — ۲۱
یادیں باقی رہ جاتی ہیں -------- انور سدید — ۲۳
مرے موسموں والی ---------- نذیر صدیقی — ۲۵
سسکتی ہوئی نسلوں کے عزادار ---- خیال امروہوی — ۲۷
قرض خواہانِ وفا --------- حسن عسکری کاظمی — ۳۰
نئے آفاق کی تلاش ------------ عذرا اصغر — ۳۳
مرا اجنبی مرا آشنا ---------- سلمان باسط — ۳۶
ہوا کا عطرزا جھونکا ----------- اقبال ارشد — ۳۷
تاریخ کے مطالعے کا منفرد طریقہ ---- ظہیر احمد سلہری — ۳۸
ٹھٹھرتی رات کا مہتاب ------ محمد رفیق خاں — ۳۹
نیازمند کے خطوط ------------ اعتبار ساجد — ۴۳
اندر کی عورت -------------- اعتبار ساجد — ۴۶

افسانے

یہ گھر میں نے بنایا ہے --------- بشریٰ رحمٰن — ۴۸
سوکھے گلاب -------------- ناصر بغدادی — ۵۲
معمولی آدمی ------------- سیما پیروز — ۵۷
ریشۂ نیستاں -------------- سعید نقوی — ۵۹

آسودگیٔ جاں

محمود الحسن، اختر شاہجہاں پوری، غالب عرفان، حسن عسکری — ۶۴
کاظمی، خیال آفاقی، قیصر نجفی، شکیلہ رفیق، اشرف جاوید۔

افسانے

کھنگی ---------------- حنیف باوا — ۶۸
ریشماں -------------- شائستہ عالم — ۷۱
عید کا فرشتہ --------------- رونق جمال — ۷۳
آخری نشان ----------- میر صاحب حسن — ۷۴

کہنہ زنجیر

نعیم الدین نظر، شگفتہ نازلی، یونس صابر، عارف شفیق، سبیلہ انعام صدیقی، حبیب الرحمٰن چوہان، شہاب صفدر، ابراہیم عدیل، عطاء الرحمٰن قاضی، عرش صہبائی، نوید سروش، شفیع ہمدم۔ — ۷۷

اُفق کے اُس پار

خدا دیکھتا ہے مگر دیر سے -------- فیروز عالم — ۸۱

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب ---------- تابش خانزادہ — ۸۴

سفرنامہ

چند سیپیاں سمندروں سے ------ پروین شیر — ۹۲

جبینیں تمتماتی ہیں

محمود شام، شگفتہ نازلی، ریاض احمد، جواز جعفری، کرامت بخاری، یوگیندر بہل تشنہ، وشال کھلر۔ — ۹۶

آئینۂ فن

آئی کنفیس ------------ فیاض احمد وجیہہ — ۱۰۰

نشانِ راہ

کوئی دن زندگانی اور ہے ----- غالب عرفان — ۱۰۶
متاعِ کوثر وزمزم -------- کرامت بخاری — ۱۰۷

آشفتہ سری

زندہ مرحومین ادب ------- ڈاکٹر رؤف خیر — ۱۰۹
رازِ ذوقِ حیات ---------- آپا جمیلہ شبنم — ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

بلراج ساہنی ------------- دیپک کنول — ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین -------- وجیہہ الوقار — ۱۱۸

☆
☆☆
☆●☆
☆☆☆☆

قرطاسِ اعزاز

●☆●

اعتبار ساجد

●☆●

کے نام

☆☆☆☆
☆●☆
☆☆
☆

''رنگوں کی بہار''

اچھا انساں نام اس کا اعتبار
اس کے شعروں میں ہے رنگوں کی بہار
عاجزی سے ہے منور اس کا دل
آ گہی کا ایک مصدر اس کا دل
تازگی لہجے میں پھولوں کی طرح
زندہ ہے زندہ اصولوں کی طرح
بربطِ احساس پر نغمہ سرا
آئینے کے سامنے اک آئینہ
آدمیت کا لبادہ زیب تن
ہے یہ اپنی ذات میں اک انجمن
رنگ خوشبو پھول جگنو تتلیاں
یہ ہے اس کی شاعری کا گلستاں
سچ ہی لکھا جب قلم اس کا اٹھا
جانب منزل قدم اس کا اٹھا
آبیاری کی ہے اس نے پیار کی
ایک مورت عجز کی ایثار کی
جاں ہر تقریب کی ہے اعتبار
قلب میں اس کے ہے جذبوں کی پھوار
درس دیتا ہے محبت کا ہمیں
علم ہے اس کی صداقت کا ہمیں

اقبال راہی
(لاہور)

''منزلِ قلب ونظر''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

پورا نام : سیّد اعتبار ساجد
قلمی نام : اعتبار ساجد
پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۸ء
تعلیم : ایم۔اے اردو

تدریسی خدمات:

گورنمنٹ کالج نوشکی (بلوچستان)
گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ
فیڈرل ڈگری کالج H-9، اسلام آباد
فیڈرل گورنمنٹ کامرس کالج H-8، اسلام آباد
فیڈرل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج H-8، اسلام آباد
سابق پرنسپل۔ پاکستان ریلویز ایکسیز کالج فار بوائز، لاہور

ادبی خدمات:

موجودہ ایڈیٹر اردو ڈیولپمنٹ کمیٹی۔ یونیورسٹی آف دی پنجاب۔ لاہور

شعری تخلیقات:

دستک بند کواڑوں پر	۱۹۷۶ء	
آمد	۱۹۸۲ء	
پذیرائی	۱۹۸۶ء	انعام یافتہ
پورے چاند کی رات	۱۹۹۰ء	
وہی اک زخم گلاب سا	۱۹۹۳ء	
ہم بھی کسی کا خواب تھے	۱۹۹۷ء	دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد
مجھے کوئی شام ادھار دو	۱۹۹۹ء	انعام یافتہ، پانچ ایوارڈ

(اب تک اس کتاب کے سترہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں)

تمہیں کتنا چاہتے ہیں	۲۰۰۱ء	
ہم بھی کسی کا خواب تھے	۲۰۰۲ء	گلناز پبلی کیشنز۔ کراچی
سرخ گلابوں کا موسم	۲۰۰۵ء	
یہ موسم یونہی بیت گیا	۲۰۰۶ء	
روز یاد کرتے ہیں	۲۰۰۷ء	
وہ سنہری دھوپ کہاں گئی	۲۰۰۸ء	
بات مگر اظہار کی ہے	۲۰۱۲ء	
اجنبی گلیوں میں شام	۲۰۱۴ء	امتزاج ۲۰۱۶ء

صحافت سے وابستگی: (۱۹۸۰ء تا حال)

بحیثیت منیجر، رائٹر کالمسٹ، تجزیہ نگار، قطعہ نویس،
انچارج ادبی میگزین الاخبار اسلام آباد، اذکار اسلام آباد، پاکستان، لاہور، دن لاہور، سماء لاہور، ندائے ملت لاہور۔
ہماری منزلیں (ڈائیوو) ٹرین ٹریولز (PRACS)

نثری تخلیقات:

شاعری کیسے کریں؟	(تفہیمی ادب)
بھارت میں چند روز	(سفرنامہ)
دیارِ حبیب میں	(سفرنامہ، عمرہ وزیارت)
صفدر میر کے بارہ ٹی وی ڈرامے	(ترتیب وتالیف)
میرے اجنبی میرے آشنا	(مشاہیر کے انٹرویوز)
قلم کی کہانی	(تخلیقی سفر کی روداد)
ریت میں گلاب	(افسانے)
سیتا پور کی آگ	(افسانے)
بھونچال	(افسانے)

دلاری (تحریک پاکستان کے تناظر میں ناول)، انعام یافتہ

گلوب پر اجنبی	(کالموں کا مجموعہ)
قلم کاریاں	(کالموں کا مجموعہ)
مزید قلم کاریاں	(کالموں کا مجموعہ)
کارستانیاں	(فکاہیہ کالموں کا مجموعہ)
جا بیل اسے مار	(فکاہیہ کالموں کا مجموعہ)

بچوں کا ادب:

۱۔ راجو کی سرگزشت (ناولٹ)
۲۔ آدم پور کا راجہ (ناولٹ)
۳۔ سیلاب (ناولٹ)
۴۔ فکاہیہ کہانیاں۔ کلاسیک لاہور

ٹی وی ڈرامے:

۱۔ ہمزاد
۲۔ پیاس
۳۔ صحرا میں بارش
۴۔ پندار
۵۔ مور کے پر
۶۔ ریت میں گلاب

(یہ ڈرامے پی ٹی وی کوئٹہ اور PTV-2 اسلام آباد سے ٹیلی کاسٹ ہوئے)

ٹیلی فلم:
پنجرے میں پرواز
ریڈیو پروگرام:
گلدستہ (کوئٹہ)
نگارش (پنڈی)
ادبی پروگرام (لاہور)
تشریحی و تنقیدی کام:
تفہیم ادب

اعتبار ساجد پر کیا جانے والا کام:
دستاویزی فلم (کشف پروڈکشنز۔جنوری ۲۰۱۶ء
مقالات۔بی۔اے آنرز۔ایم اے۔ایم فل
موجودہ پتہ:
158، علامہ اقبال روڈ۔لاہور۔
فون:
0333-5226995
aitbar_hussain@hotmail.com

مستقبل گیر امکانات

میں اس سے پہلے اعتبار ساجد کی شاعری کے بارے میں اجمالاً ایک سے زیادہ بار اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں۔اب مجھے اسی اجمال کو ذرا تفصیل سے عرض کرنا ہے۔۔۔اور عرض یہ کرنا ہے کہ اعتبار ساجد نے اُردو کی نئی غزل کو سر بلند کیا ہے اور اسے وقار بخشا ہے۔محض جدید بننے یا کہلانے کے لیے اس نے نہ غزل کی لفظیات بدلی ہے اور نہ دوسری بوالعجبیوں سے کام لیا ہے۔دراصل اسے یہ اعتبار حاصل ہے کہ جدت اس کے موضوعات اور اس کے لہجے میں موجود ہے اور یہ اس کا درست اعتماد ہے۔اس نے غزل کو غزل ہی رہنے دیا ہے مگر اس میں دنیا جہان کے مشاہدات و تجربات نہایت سادگی اور بے ساختگی سے بھر دیے ہیں۔پھر کہیں کہیں وہ قدیم زوال پذیر تہذیبی اور معاشرتی اور سیاسی اقدار پر طنز کا خنجر لیے اتنے موثر انداز میں حملہ آور ہوتا ہے کہ اس کا شعر تو غزل ہی کا شعر رہتا ہے مگر اس کا نوکیلا پن اور جوشیلا پن اپنا کام دکھا جاتا ہے۔اس لحاظ سے اعتبار ساجد جدید اُردو غزل کا ایک معتبر نام ہے۔

وہ بنیادی انسانی جذبات و احساسات بھی جنھیں عہدِ قدیم میں غزل کا واحد موضوع سمجھ لیا گیا تھا، اعتبار ساجد کے ہاں موجود ہے کہ ان کے بغیر ہر فن ادھورا رہ جاتا ہے۔یہ وہ جذبات و احساسات ہیں جن سے انسانی سائیکی محروم کر دی جائے تو انسان اور مشین میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔اعتبار ساجد نے ان کے اظہار کے لیے بھی کسی پینترے سازی سے کام نہیں لیا، بلکہ اسی سچائی سے اظہار کر دیا ہے، جس طرح وہ اس کے دل و دماغ پر وارد ہوئے۔اس طرح اس کے ہاں محبت کی ایک بے تکلفانہ فضا پیدا ہو گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل کے کسی ایک مصرعے پر بھی تکلف یا تصنع کا شبہ نہیں گزرتا۔اعتبار ساجد کا یہ ایک اور کمالِ فن ہے۔

غزل ایک کافر ادا صنفِ سخن ہے۔اس نے بڑے بڑوں کا چکرایا ہے۔میر تقی میؔر کے سے بڑے شاعر نے بھی اس کے ہاتھوں رطب و یابس کے انبار لگائے ہیں۔مصحفؔی کے سے استادِ فن کا کلام پڑھیے تو صفحہ در صفحہ پڑھتے چلے جایئے۔آخر کار ایک ایسا شعر دستیاب ہوتا ہے جسے جانِ تغزل کہا جا سکتا ہے۔یہی عالم بیسویں صدی کے بیشتر اساتذۂ غزل کا رہا ہے کہ شعر پر شعر کہتے چلے جائیں گے مگر دل و دماغ کو گرفت میں لانے والا شعر کم ہی مل پائے گا۔یہ سعادت چند جدید غزل گو شعرا کا مقدر تھی کہ ان میں سے بیشتر کی پوری کی پوری غزلیں موصع ہوتی یا یوں کہہ لیجیے کہ ان میں کوئی کمزور یا ڈھیلا شعر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔اعتبار ساجد انہی جدید غزل گو شعراء کی صفِ اوّل میں شامل ہے۔اس کی غزلیں صحیح معنوں میں مرصع ہیں اور یہ اس کی ریاضتِ فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔صنفِ غزل میں جو مستقبل گیر امکانات پوشیدہ ہیں، وہ اعتبار ساجد کی غزلوں میں سے جھانکتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔

احمد ندیؔم قاسمی

''اذنِ حضوری''

اعتبار ساجد

الحمد للہ

شکر ہے خداوندا ، انکسار قائم ہے ہم نیاز مندوں کا ، اعتبار قائم ہے
ایسے خشک موسم میں، تیری ہی عنایت سے گلشنِ تمنّا کا کاروبار قائم ہے
شکر ہے میرے مالک، بھیڑ میں کتابوں کی اپنے چند لفظوں کا اعتبار قائم ہے
آج بھی مہکتی ہیں اپنے حرف کی کلیاں آتے جاتے موسم میں یہ بہار قائم ہے
اہلِ دل کی محفل میں، اہلِ فن کی مجلس میں اعتبارؔ ساجد کا اعتبار قائم ہے

...... O ......

نعت

جو کام کرتا ، شریعت کے ماتحت کرتا
اگر میں شہرِ نبیؐ میں ملازمت کرتا
میں اس دیار میں جاروب کش ہی بن جاتا
سو، کیا مجال کہ قارونؔ مسابقت کرتا
خزاں بہار کا موسم، سماں بدلتے ہوئے
یقیں ہے کہ مجھی سے مشاورت کرتا
بس اُس نگر کے کسی طاقچے میں جلتا میں
مزاجِ موجِ ہَوا بھی مصالحت کرتا
کچھ اور ہی مرے اشعار کی مہک ہوتی
کچھ اور طرز میں سب سے مخاطبت کرتا
یہاں بکھیرتا پھرتا میں کا ہے خاکِ وجود
جو ملتا اذنِ حضوری ، مراجعت کرتا
یہاں شکستہ ستارہ ہوں، وہ بھی ناکارہ
وہاں میں کاوشِ تسخیرِ شش جہات کرتا

O

سلام

غم و ابتلائے حُسینؑ کا ابھی اختتام نہیں ہُوا
مرے نینواؔ کے مسافرو! یہ سفر تمام نہیں ہُوا
ابھی قافلہ ہے رَواں دَواں، ابھی نبضِ وقت نہیں تھمی
ابھی راستے میں پڑاؤ کا کوئی اہتمام نہیں ہُوا
سرِ رہگذر ہے مکالمہ ابھی اِک امیرِ سپاہ سے
ابھی سنگ موم نہیں بنا، ابھی حُرؔ غلام نہیں ہُوا
ابھی رنگ سُرخ نہیں ہوا، کسی موجِ نہرِ فُرات کا
ابھی کوئی خیمہ نہیں جلا، ابھی وقتِ شام نہیں ہُوا
جو شہید ہے وہ شہید ہے جو یزید ہے وہ یزید ہے
فقط اپنے قصر و سپاہ سے کوئی نیک نام نہیں ہُوا
مرے تشنہ لب کے عروج تک مہ و مہر بھی نہ پہنچ سکے
مرے سُرخ رُو کے مقام کا کوئی اور امام نہیں ہُوا
اُسی ایک دَر کی گدائی نے مجھے اعتبارؔ بنا دیا
کہاں میری بات نہیں بنی، کہاں میرا کام نہیں ہُوا

O

''پرسشِ حال بھی نہیں''

اعتبار ساجد

جون بھائی اپنے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آئے تو میں نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔شہر کے خاصے ادیب،شاعر،صحافی،فوٹو گرافر اور خوش ذوق سامعین جمع ہوئے۔ بڑی اچھی تقریب ہوئی۔تقریب کے بعد میں نے ان سے کہا کہ وہ کل کو تیار رہیں میں ان کا انٹرویو کرنے آؤں گا۔کہنے لگے''میری جان ۔ مجھ آشفتہ سر سے پیشگی وقت لینے کی کیا ضرورت ہے آ جاؤ جس وقت تمہارا جی چاہے۔''

اگلے روز میں نے اپنے اخبار کے فوٹو گرافر کو ساتھ لیا اور تلاش بسیار کے بعد اس گھر تک پہنچا جہاں جون بھائی ٹھہرے ہوئے تھے بہت لہک چہک کر ملے بولے''آخاہ۔ سبحان اللہ۔ میری جان آؤ کلیجے سے لگ جاؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

فوٹو گرافر کو کسی وزیر کے پاس کانفرنس کی کوریج کے سلسلے میں جانا تھا اس لیے اسے جلدی تھی اس کی سہولت کے پیش نظر میں نے جون بھائی سے کہا ''تھوڑا سا رسمی طور پر ہاتھ منہ دھو لیجیے کنگھا کر لیجیے واسکٹ وغیرہ پہن لیجیے۔''

بولے''وہ کس خوشی میں میری جان''

میں نے کہا''انٹرویو کے لیے آپ کی تصویر بنوانی ہیں۔''

''بہت بن چکیں ہماری تصویریں۔ وہ ہاتھ لہرا کر بولے''اقبال مہدی جیسے مصور نے ہمارا کیری کیچر تیار کر دیا۔اب اس کے بعد کون سی گنجائش ہے؟

''پھر بھی۔''

لہک کر بولے''جیسے ہم بیٹھے ہیں ویسے ہی بنوا دو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم نہیں بنواتے جیسے وہ بیٹھے تھے ویسی تصویریں بنتیں تو اقبال مہدی کی بنائی ہوئی''شاید'' کے ٹائٹل کی تصویر کا سارا شاعرانہ امیج تباہ ہو جاتا اور یہ میں کیسے چاہتا بڑی منتیں کیں مگر وہ موڈ کے بادشاہ آدمی تھے نہیں مانے۔ میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ بلاوجہ ان کا موڈ خراب کر کے انٹرویو سے بھی جاؤں لہٰذا طوعاً و کرہاً فوٹو گرافر کو رخصت کر دیا پھر ان کے پاس آ بیٹھا کوئی خاص سوالنامہ ترتیب نہیں دیا تھا کچھ انتظار ان کے موڈ کی بحالی کا بھی تھا جس کا اہتمام کرنے وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے تھے۔واپس آئے تو بازو میرے گلے میں حمائل کر کے ایک شاہانہ تمکنت سے اجازت دی''پوچھو کیا پوچھنا ہے؟''

میں نے پوچھا''آپ نے شاعری کا آغاز۔۔۔''

بس یہیں سے ان کا موڈ آف ہو گیا کہنے لگے۔''جب کوئی شاعر یا تخلیق کار گفتگو کا آغاز اس انداز میں کرتا ہے تو میری جلتی پر تیل ڈالتا ہے۔ مجھے بھسم کرتا ہے جو شخص مجھے برسوں سے جانتا ہے انشاء عالمی ڈائجسٹ کے زمانے سے میرے پاس آتا رہا ہے اس بدبخت نامراد کو اگر میرے بارے میں یہ آگہی حاصل نہیں کہ مجھے کھولنے کے لیے کونسا پیچ کس استعمال کرے اسے مجھ سے انٹرویو کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔''عزیز،عزیز من،مہربان من انٹرویو پر لعنت بھیجو کوئی اور بات کرو'اب ظاہر ہے بپھرے ہوئے آشفتہ سر جون بھائی سے کیا بات ہوتی میں نے ان دنوں کا ذکر چھیڑ دیا جب ان کے گارڈن ایسٹ والے گھر کے ہال میں تخت بچھتا تھا اور اس پر محمد تقی،رئیس امروہوی یا جون ایلیا متمکن ہوتے تھے انور شعور کا غذات کے انبار میں سرگرداں ہوتے تھے کیسے پرسکون دن اور کیسی دوپہریں ہوتی تھیں۔سنّاٹا اور خاموشی۔کون سوچ سکتا تھا کہ ایک دن اس شہر کا سکون تہ بالا ہو جائے گا انسان انسان کو بھوننے،بھنبھوڑنے اور نوچنے پر تل جائے گا۔ بھائی بھائی سے جدا ہو جائے گا۔زاہدہ حنا اور جون ایلیا میں علیحدگی کا واقعہ بھی ظہور پذیر ہو جائے گا اس پر جون بھائی نے ہلکی سے جھرجھری لی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

خاصی دیر،صبر آزما حد تک خاصی دیر اس کمرے میں رہے۔واپس آئے تو قیس عامری،نجدی کی طرح خاک بہ سر ڈانواڈول تھے۔دھم سے جہاں مناسب سمجھا خود کو بچھا دیا۔ بلک بلک کے رونے لگے۔

''ہائے اس نے بہت دکھ دیا۔ بہت رلایا۔وہ جو اک بننے سنورنے اور خود کو سنبھال بچا کے رکھنے کی امنگ پیدا ہوئی تھی مجھ سے چھین لی۔اب خود کو ڈبو رہا ہوں۔بس مستول سطح آب سے اوپر ہے۔میرے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ کبھی مشاعروں میں،کبھی رسالوں میں۔ ورنہ تو میں کب کا ڈوب چکا۔کسی نے خوب کہا ہے:

مجھے کیا تلاش کرنے مری جان آ گئے ہو
تہ آب جا چکا ہوں پس آب سو رہا ہوں

یہ کہہ کے پھر بلکنے لگے۔میرا دل بھر آیا۔اب کیا انٹرویو اور کہاں کا انٹرویو؟ میں جانے کو اٹھا انہوں نے کھینچ کر بٹھا لیا۔''سنو،عزیز از جان من۔سنو عہد اپنے شاعر کے اندر ہوتا ہے۔شاعر اپنے عہد کے اندر نہیں ہوتا۔ یہ میری بات لکھ لو۔اسی کو انٹرویو سمجھ لو۔ یہ تحفہ ہے میری جان میری طرف سے۔رہی یہ بات کہ انٹرویو نگار کسی شخصیت کو کھوجتا ہے تو وہ کیا کھا کے کسی شخصیت کو کھوجے گا۔ پہلے شخصیت سازی کے مراحل تک پہنچے۔انگنت زخم ہماری طرح کھائے،ٹوٹے اچھی طرح ٹوٹے،بکھرے، پھر جمع ہو۔ پھر جمع جتھا لے کر ہمارے پاس حاضر ہو۔تب سوال کرے۔تب اس کے سوال میں وہ پیچ کس ہو گا جو ہمیں کھولے گا۔ ورنہ تو یہاں پندار کا صنم کدہ مقفل ہے۔سر ٹکراتے رہو۔کوئی اذن باریابی نہیں

دے گا۔‘‘

وہ خاصی دیر آشفتہ سری کے عالم میں رہے۔ پھر مصور منصور زبیری انہیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ جب خاصی دیر ہوگئی تو میں کمرے میں موجود حاضرین و ناظرین سے دوبارہ حاضری کا وعدہ کر کے اٹھ آیا۔ گھر آ کر میں اس ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے شاعر کی حالت زار پر کڑھتا رہا۔ چونکہ اخبار میں جون بھائی کے انٹرویو کا اعلان چھاپ چکا تھا اور آئندہ ایڈیشن کے سلسلے میں اگلے ہی روز مواد درکار تھا اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ بہرحال ایک ترکیب سوجھ گئی جس نے آگے چل کر ایک نئے ادبی سلسلے کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ تھا ’’شاعری سے ملاقات کا سلسلہ‘‘ میں نے اپنے قارئین سے جس پہلے شاعر کی شاعری سے ملاقات کرائی وہ جون بھائی تھے۔ ان کے بارے میں مَیں نے لکھا تھا:

کوئی عام شاعر ہو تو اس کی شاعری اور شخصیت پر بات کرنے کے لیے زیادہ تردد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لگے بندھے الفاظ اور جملوں کی ترکیب سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے تعریفی کلمات لکھ دیئے جاتے ہیں لیکن جب جون ایلیا جیسے شاعر کا معاملہ ہو تو محض رسمی باتوں سے کام نہیں چلتا جون ہمارے عہد کے بہت قابل ذکر شاعر ہیں۔ بہت متنوع شخصیت ہیں جتنے سادہ نظر آتے ہیں اتنے ہی پیچیدہ اور گنجلک ہیں۔ ایک دور تھا کہ پوری ایک ادبی نسل جون کی تقلید کرتی تھی حتیٰ کہ کہ لوگوں نے ان کے انداز بیاں کے علاوہ ان کے بالوں تک کا اسٹائل اپنا لیا۔ جون فلسفے، منطق اور تاریخ کے آدمی ہیں۔ شاعری ورثے میں ملی ہے بڑے بھائی رئیس امروہوی نے ملک گیر سطح پر نام پیدا کیا عم زاد کمال امروہوی نے فلمی صنعت میں جھنڈے گاڑ دیئے۔ جون نے انشا نام سے رسالہ نکالا جو بعد ازاں عالمی ڈائجسٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس رسالے نے ڈائجسٹوں کی دنیا کو شکیل عادل زادہ جیسا ایڈیٹر دیا جسے پوری اردو دنیا میں سب رنگ کے مدیر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے قاطیغوریاس۔ بارامانیاس جومطریا ایساغورجی اور کتاب الطّواسین جیسے تخلیقی نوعیت کے کارناموں کے حوالوں سے پہچانے جانے والے جون ایلیا کی اصل شناخت شاعری ہے اپنی شاعری کے بارے میں ان کی ایک خاص منطق اور فلسفہ ہے۔

اخبار کے ساتھ جب ہمارا ادبی ایڈیشن چھپ کر مارکیٹ میں آیا تو لوگوں نے اس سلسلے کو بہت پسند کیا۔ جنہوں نے جون بھائی کو نہیں دیکھا تھا یا جنہیں ان کی شاعری کو کم پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا وہ اتنی غزلیں اور نظمیں یکجا دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ خاص طور پر ان کی یہ غزل تو بہت مقبول ہوئی۔ اب جو غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں تو یہ ان کے مزاج اور حالات پر کل بھی منطبق ہوتی تھی اور آج بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جون بھائی کی جس غزل نے لوہے سریے اور کنکریٹ کے شہر اسلام آباد کے باسیوں کو رلایا وہ یہ تھی:

حال یہ ہے کہ خواہش پرسش حال بھی نہیں
اس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں

اے شجر حیات شوق ، ایسی خزاں رسیدگی!
پوشش برگ و گل تو کیا جسم پہ چھال بھی نہیں

مجھ میں وہ شخص ہو چکا جس کا کوئی حساب تھا
سود ہے کیا، زیاں ہے کیا، اس کا سوال بھی نہیں

مست ہیں اپنے حال میں دل زدگان و دلبراں
صلح و سلام تو کجا، بحث و جدال بھی نہیں

تو مرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے
شوق کمال بھی نہیں، خوف زوال بھی نہیں

خیمہ گہ نگاہ کو لوٹ لیا گیا ہے کیا؟
آج افق کے دوش پر گرد کی شال بھی نہیں

اف یہ فضائے احتیاط کہیں اڑ نہ جائیں ہم
باد جنوب بھی نہیں، باد شمال بھی نہیں

وجہ معاش بے دلاں، یاس ہے اب مگر کہاں
اس کے ورود کا گماں، فرض محال بھی نہیں

غازہ روز و شب تو دیکھ وقت کا یہ غضب تو دیکھ
کل تو نڈھال بھی تھی میں، آج نڈھال بھی نہیں

میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب
صبح فراق بھی نہیں، شام وصال بھی نہیں

پہلے ہمارے ذہن میں حسن کی اک مثال تھی
اب تو ہمارے ذہن میں کوئی مثال بھی نہیں

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

براہِ راست

اللہ ربّ کریم کے ہر کام میں حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔کسی کو علم تھا کہ جس بچے کا نام اُس کے والدین اعتبار ساجد رکھ رہے ہیں وہ ایک دن اُردو شاعری کا اعتبار بن کر جہانِ ادب کو متوّر کرے گا۔جی ہاں! آج کی محفل جناب اعتبار ساجد کے فنّی اعتراف میں آراستہ کی گئی ہے۔ ہرچند آپ پہلے سے جناب اعتبار ساجد کے فنّی کمال کے معترف ہیں۔منشا و مقصود صرف یہ ہے کہ اُن کے فنّی محاسن کو مربوط شکل میں پیش کیا جائے تاکہ دُور دراز کے وہ احباب بھی جناب اعتبار ساجد کے کمالِ فن سے استفادہ کر سکیں جن کی نظر سے کسی سبب یہ کلام نہیں گزرا۔ہم نے ایک سے زائد بار کلام کا ذکر کیا حالانکہ اعتبار بھائی نے نثر میں بھی اپنی طرز کے ایسے منفرد پھول بوٹے کاڑھے ہیں کہ جو ایک مدت تک قاری کے دردل پر دستک دیتے رہیں گے۔سو آیئے آج کی نشست سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جناب اعتبار ساجد کی فنّی جہات کو جانچتے، پرکھتے ہوئے ایک ٹھوس رائے قائم کرتے ہیں۔یہ ٹھوس رائے کیا ہے اس کی بابت پیشگی بتانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

گلزار جاوید

☆ ذکر چھڑ گیا جب بچپن کا بات پہنچی تیری پیدائش تک؟

☆☆ مخاطبت کا شکریہ،ابتدا اپنے اس شعر سے کر رہا ہوں:

سنا ہے روئے تھے جس دن جنم لیا ہم نے
اس عمر میں بھی مری جان، روتے رہتے ہیں

تعلق جون پور(یوپی) کے ایک معزز سادات گھرانے سے ہے۔ پیدائش ملتان کی اور بچپن لڑکپن ملتان میں لہلہاتے، کھلکھلاتے، جگمگاتے گذرا۔خوبصورت اور معصوم خوابوں جیسا زمانہ تھا۔گاچنی مٹی سے پُسی ہوئی تختیاں، ہرے بھرے کھیت،قدیم گھر،سانولے سلونے محبت بھرے لوگ، آم، جامن اور نیم کے پیڑ۔برف کی رنگ برنگی قلفیاں،سوندھی مُنگ پھلیاں، چنے کے سوختہ کھلے کھلے دانے،صبح دم کھیتوں سے شہروں کی طرف آتی ہوئی اونٹوں کی قطاریں۔گنڈیاں اور خربوزوں کی اشتہاانگیز مہک۔برسات میں سبز پتوں پر رینگتی ہوئی سرخ ریشمی بیر بہوٹیاں۔گرمیاں اور کمپنی باغ۔

☆ لفظوں کی انگلی تھام کر شعور کی آنکھ نے کیا کچھ دیکھا،سُنا اور سہا؟

☆☆ لفظوں کی انگلی پکڑی تو منظر کے پیچھے منظر دکھائی دینے لگے۔کئی کئی پہلوؤں سے انہیں دیکھا۔لکھنے کی کوشش کی۔ ہر طرح کی آوازیں سنیں۔کرخت، کھردری، گمبھیر رسیلی،مٹھاس بھری اور سہے وہ تمام دکھ جو سفید پوش اوسط درجے کے گھرانوں کے بچے سہتے ہیں۔اور پھر اسے ایثار کے تسلسل کے حوالے سے لکھا بھی۔مثلاً:

رہا، پا برہنہ وہ خود مگر، نیا بوٹ مجھ کو دلا دیا
مرے باپ کے اسی روپ نے مجھے باپ جیسا بنا دیا

☆ تعلیمی ایام کو آواز دی جائے تو کس طرح کے مناظر ذہن میں تازہ ہوتے ہیں؟

☆☆ حساب کے ماسٹر اللہ دتہ کا بے رحم ڈنڈا۔ایک اصلی اور ایک پتھریلی آنکھ والے آنہ لائبریری کے مالک صوفی صاحب۔کرشن چندر کی ''چڑیوں کی الف لیلیٰ'' کی خوبصورت باتصویر پاکٹ سائز کتابیں۔ایمرسن کالج کے مباحثے۔اپنی ہرکیولس سائیکل۔روانگی یا واپسی کے وقت دروازے کا ایک پٹ کھولے سفید چادر میں لپٹا ہوا اماں کا چہرہ۔انتظار اور اشتیاق بھری آنکھیں۔وہ ڈاگ شوٹر جس نے ہمارے کرائے کے گھر کی دیوار کے ساتھ سہمے اور سمٹے ہوئے کتے کو مٹی سے سرخ کارتوس سے کتا مارمہم کے دوران اس مظلوم کتے کو مارا تھا جو نہ بھونکتا تھا نہ کاٹتا تھا۔اماں باقاعدگی سے اس کے آگے رات بچ ڈالتی تھیں۔پانی سے بھری ہوئی طنار رکھتی تھیں۔وہ خوش ہو کر کھاتا پیتا اور اظہارِ ممنونیت میں دیر تک دم ہلاتا رہتا۔جس روز وہ مارا گیا میں نے اور اماں نے کھانا نہیں کھایا۔

☆ چودہ، پندرہ کا سن کھیلنے کودنے کا ہوتا ہے۔آپ صاحب کتاب بن گئے؟

☆☆ حالات اوپر بتا آیا ہوں۔حساس ترین طبیعت کھیل سے زیادہ مطالعے کی طرف مائل تھی سو لکھنا بھی شروع کیا۔خالد بک ڈپو، چوک نواں شہر ملتان کے خالد صاحب نے میری کتاب ۶۰ء کی دہائی میں چھاپ دی۔یہ زرد مسطر پر کتاب کا زمانہ تھا۔وِنڈ امِک اور آفسٹ پیپر کا زمانہ نہیں تھا۔عموماً کتابیں پیپر بیک پر چھپتی تھیں مجلد کتابیں بھی چھپتی تھیں لیکن بہت کم۔

☆ شہرت و ناموری کے عالم میں ابتدائی دور کے شعر کی بابت آج آپ کا حسنِ ظن کیا ہے؟

نامور ہیں، نہ کوئی شہرتِ فن رکھتے ہیں
ہم فقط حرمتِ دستارِ سخن رکھتے ہیں

☆☆ اس شعر کے مصرعہ ثانی میں جو بات تب میں نے کہنے کی کوشش کی تھی اسی فلسفے پر اب بھی میرا ایقان ہے۔رہی شہرت اور ناموری تو یہ اللہ کے کام ہیں۔میں نے کبھی اس کے لیے شعوری کوشش نہیں کی۔

☆ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور سنورا شاعر افسانہ نگار، مزاح نگار، ناول نگار، کالم نگار بن جائے تو کیا کہنا چاہیے؟

☆☆ اسے اللہ کی عنایت، کرم اور مہربانی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں کہ اس نے مجھے بگڑنے سے بچائے رکھا۔

☆ آغاز آپ کا نثر سے ہوا نام آپ نے شاعری میں پایا۔ کچھ تفصیل اس اجمال کی بتلایئے؟

☆☆ نثر آپ سے طویل نشست مانگتی ہے۔ شاعری آپ سے اظہار مانگتی ہے اور خیال چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے آپ کے اندر مجتمع ہوتا رہتا ہے اور ٹوٹتا پھوٹتا، بنتا بگڑتا رہتا ہے جب زیادہ پریشان کر دے تو کاغذ اور قلم ڈھونڈتا ہے۔ غالبًا افسانے سے شاعری کی طرف آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ باقی وجوہات روائتی ہیں۔ مثلاً غم عشق، غم روزگار، سلوکِ دنیا، جیسا بھی ہو، اچھا یا بُرا۔ شائد میرے اس شعر سے مزید وضاحت ہو جائے:

دُھوپ کے دشت میں شیشے کی ردائیں دی ہیں
زندگی! تُو نے ہمیں کیسی سزائیں دی ہیں

☆ اُس واقعہ کی تفصیل بھی جاننا ضروری ہے جب آپ کو افسانہ لکھنے پر قتل کی دھمکی دی گئی؟

☆☆ نادانی، ناسمجھی کا زمانہ تھا جو ذہن میں آیا لکھ ڈالا، نہ سوچا نہ سمجھا۔ ظاہر ہے ردعمل کچھ نہ کچھ تو ہونا تھا۔ شعور پختہ ہوا تو اپنی ناسمجھی، نالائقی پر شرمندگی بھی ہوئی، افسوس بھی ہوا۔ اب تک ہے۔ مگر یہ آپ کو سوجھی کیا؟ بجھے ہوئے الاؤ کو کریدنے بیٹھ گئے:

جو بیت گئی سو بیت گئی اب اس دُکھ کو کیا یاد کریں؟

☆ آپ کے افسانوں میں اشتہا انگیزی یا تلذذ کی بہتات کا جواز کیا ہے؟

☆☆ بہت اچھا کیا آپ نے کٹہرے میں کھڑا کر کے مجھ سے وضاحت طلب کر لی۔ جن افسانوں کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ مارشل لائی دور کی گھٹن سے جنم لینے والے مسائل پر مشتمل تھے۔ اب میرے افسانوں کے موضوعات مختلف ہیں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ آپ نے نئی راہ تلاشنے، تراشنے کے بجائے بزرگوں کے نقشِ پا کو رہنما بنایا۔ ہمارا اشتیاق بجا طور پر اُس کی تفصیل سے آگاہی کا ہے؟

☆☆ ذرا غور کیجیے گا کہ جنہوں نے اپنے بزرگوں کے نقشِ پا کو رہنما بنائے بغیر نئی راہ تلاشنے اور تراشنے کی کوشش کی وہ کس حد تک کامیاب رہے؟ بزرگ تو آئینہ ہوتے ہیں ان میں دیکھ کر ہی آپ اپنے خدوخال میں مناسب تبدیلیاں کر پاتے ہیں۔ آئینہ سامنے نہ ہو تو شعر تو شعر آپ اپنے بال بھی ڈھنگ سے سنوار نہیں سکتے۔

☆ ”اعتبار ساجد وصول آسانی سے کیے جاتے ہیں اور قبول مشکل سے“ قول سید ضمیر جعفری کا وضاحت آپ کی؟

☆☆ مرشدی ضمیر جعفری مجھ سے بہت محبت رکھنے والے بزرگ تھے۔ جانتے تھے کہ میری پذیرائی تو بہت ہوتی ہے البتہ قبولیت کا شرف پذیرائی کے برابر نہیں ملتا۔ اسی لیے میں نے انہی کے ایک سوال کے جواب میں عرض کیا تھا:

ہم اپنے بیج میں زیرِ زمیں ہیں پوشیدہ
نہیں! ہمارا زمانہ ابھی نہیں آیا

☆ بنا کسی وسیلے اور رہنمائی کے ادب بالخصوص اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنا ممکن ہے؟

☆☆ آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔ اختلاف کی ذرہ بھر گنجائش آپ نے نہیں چھوڑی۔ ورنہ میں کچھ اس قسم کا مصنوعی اور جعلی جواب دیتا۔ ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے کسی وسیلے یا رہنمائی کی نہیں فقط صلاحیت (تخلیقی وفور) کی ضرورت ہے مگر میں نے ایسے ایسے بے شمار مناظر دیکھے ہیں:

کوئی نہیں کہ جو ان موتیوں کی قدر کرے
گھروں میں صاحبِ دیوان روتے رہتے ہیں

وجہ وسیلے، رہنمائی اور پبلک ریلیشنگ کا فقدان ہے۔ کئی اچھے شاعر زندگی بھر لکھتے رہتے ہیں۔ بیمار پڑتے ہیں تو چند ایک کے علاوہ انہیں کوئی پوچھنے نہیں جاتا۔ مرتے ہیں تو محلے داروں، رشتہ داروں اور ادب برادری سے تعلق رکھنے والوں کی مل ملا کر تعداد ڈیڑھ دو سو سے زائد نہیں بنتی۔ بعد میں ان پر کالم اور مضامین لکھے جاتے ہیں:

ٹوٹی جا رہی ہیں آج نبضیں اور بیاضیں
ہمارے بعد ہم کو دیکھا بھالا جا رہا ہے

☆ سنا ہے آپ نے پاپڑ بہت بیلے ہیں۔ محاورتاً یا عملاً؟

☆☆ اس میں چھپانے یا شرمانے کی کیا بات ہے۔ بے شک میں نے زندگی کی بے پناہ کٹھنائیاں برداشت کی ہیں۔ بڑے صبر آزما دن گذارے ہیں۔ اور اب بھی کونسی جنت میں رہ رہا ہوں۔ دکھ انسانوں کے لیے بنائے گئے ہیں اور انہیں قبر کی دہلیز تک انسان کے ساتھ رہنا ہے اور بھگتنا ہے۔

☆ آپ کی شاعری کو دھوکے سے پاک شاعری کہنے والوں نے دوسری قسم کے شاعروں کی نشان دہی نہ کر کے زیادتی کی ہے؟

☆☆ یہ سوال تو آپ کو ان سے کرنا چاہیے تھا جو میری شاعری کو دھوکے سے پاک شاعری کہتے ہیں۔ مجھے تو سارے ہی پاکیزہ نظر آتے ہیں۔

☆ آپ شاعری کی بنیاد ”محبت“ بتلا کر اپنے امکانات کم نہیں کر رہے جبکہ فیض صاحب بہت پہلے کہہ گئے ہیں:

”اور بھی غم ہے زمانے میں محبت کے سوا“

☆☆ میری کیا، ساری دنیا کی شاعری کی بنیاد محبت ہے۔ محبت کے بغیر شاعری حالاتِ حاضرہ کی رننگ کمنٹری ہے۔ رہے فیض صاحب تو ان کا معاملہ دوسرا ہے وہ ایک مخصوص نظریے کے شاعر تھے لیکن جو لوچ اور رومانویت انہوں نے نظریے میں بھر کر پیش کی اسے مہدی حسن اور نور جہاں نہ ملتیں تو فیض بھی عوام کو نہ ملتے۔ نظریہ جہاں نعرے سے یا سلوگن میں بنتا ہے وہاں مجاز اور ساحر بھی اپنی مقبولیت کا گراف کم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ آپ نے شاعری کو محبت گردان کر حقیقی محبت کی

پردہ پوشی کی ہے۔قارئین پر اعتماد کیجیے اور آج کی نشست میں اپنی صوفیہ لورین کا تعارف کرا ہی دیجیے؟

☆☆ لیجئے! پھر آپ نے نہاں خانۂ دل کے زینے اترنے شروع کر دیئے۔ بے شک شاعری میرا عشق ہے اور یقیناً اس کے پیچھے بھی کچھ ہوگا۔ظاہر ہے کوئی پتھر کا ستون تو نہیں ہوگا کوئی جیتا جاگتا انسان ہی ہوگا۔اور اس کا کوئی نام بھی ہوگا۔کوئی کوچہ بھی ہوگا اور میرا جیسا کوئی فرید جاوید کوچہ گرد بھی ہوگا جو اپنا حال یوں بیان کرے گا:

ترے کوچے اس بہانے، مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

☆ جب آپ اپنی شاعری کی بنیاد محبت گردانتے ہیں تو وہ لوگ حق بجانب ٹھہرتے ہیں جو احمد فراز کی طرح آپ کی شاعری کو نوجوانوں کی شاعری گردانتے ہیں؟

☆☆ میری شاعری ستر اسّی برس کے معّنک بوڑھوں کے پڑھنے کی چیز نہیں ہے بس یہی میرا اور فراؔز صاحب کا قصور ہے کہ ہمیں نوجوان پسند کرتے ہیں۔اور اس پر ستر اسّی برس سے اُوپر کے نقاد اور دانش ور توصیفی کلمات لکھتے ہیں۔ویسے مجھے یقین ہے کہ شعر کہتے ہوئے نہ کبھی فراؔز صاحب کے ذہن میں یہ خیال آیا ہوگا نہ میرے کہ یہ شاعری نوجوانوں میں مقبولیت حاصل کرے گی۔پلاننگ کر کے تو شاعری کی نہیں جاتی یہ تو بس ہو جاتی ہے جیسے محبت ہو جاتی ہے کسی سے بغیر کسی شیڈول کے۔

☆ آپ کے ہاں جدید اور قدیم شعری رویے باہم متصادم کیوں دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ شائد اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ میں نے قدیم و جدید شعراء کو تواتر سے پڑھا ہے۔ان کے اسلوب اور صدائے بازگشت سے انکار تو نہیں کر سکتا۔

☆ رُت کی بے مہر ہواؤں سے پھول بچانے کی دہائی یا فریاد کس سے کر رہے ہیں؟

☆☆ یہ فریاد نہیں استغاثہ بحضور پروردگارِ عالم ہے۔حاؔلی نے بھی نعت میں کہا تھا:

اے خاصۂ خاصان رسلؐ وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

☆

باغبان شہادت کی گنتی گنتے تھک گئے ہیں
میرا تخلیقار اب کس چیز کی بشارت دے گا

اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ درختوں کے کٹاؤ سے پیدا ہونے والی فضائی آلودگی اور دیگر مسائل ایک ہمارا نہیں ساری دنیا کا مسئلہ ہے۔درختوں کے قتل عام پر شاعری نہیں روئیں گے تو کیا لکڑ ہارے اور ان کے کلہاڑے روئیں گے؟

☆ چہار جانب آپ کی جدت طرازی کا ڈنکا بج رہا ہے جبکہ ایک طبقہ آپ کی زبان کو روایتی زبان سے تشبیہ دیتا ہے؟

☆☆ ایک طرف آپ یہ خوشخبری دے رہے ہیں کہ چہار جانب میری ناچیز شاعری کی جدت طرازی کا ڈنکا بج رہا ہے اور دوسری طرف ایک طبقہ میری زبان کو روائتی قرار دیتا ہے۔یہ خوشخبری ہے یا اطلاع، بہر حال میں فریقین کی آراء کا شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

☆ پہلے آپ کی غزل ٹیلی کاسٹ ہوتی تھی تو دھوم مچ جاتی تھی۔آج خبرناک اور ہولناک کی دھوم مچی ہوئی ہے۔یہ عمل کس رویہ کی نشان دہی کرتا ہے؟

☆☆ یہ ادبی، فکری، ثقافتی اور سماجی روایات کی بے دریغ پامالی کا منظر نامہ ہے۔لیکن میں جانتا ہوں کہ ہولناک اور خبرناک جیتے جی ہی مر جاتے ہیں، ہم اپنے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔اگر واقعی ہم نے ایسا کچھ کیا ہے جو ذہنوں اور دلوں میں باقی رہ سکے۔

☆ احسان دانش نے روح کی تلخی ضمیر کے جس زہر کی بات کی تھی آج اُس کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆ وقت کے ساتھ روح کی تلخی میں شائد کمی آئی ہے البتہ ضمیر کے زہر کی تلخی بدستور قائم ہے۔اگر یہ کسی ڈبے میں بند ہوتا تو میں اس کا ڈھکن کھول کر اتنی مقدار میں شہد انڈیل دیتا کہ اس کی کڑواہٹ زائل ہو جاتی اور میں اس قسم کے اشعار لکھتا:

زمانہ خوبصورت ہے نہایت خوبصورت ہے

☆ فرمان فتح پوری نے آپ کی نسبت اردو کو کوکھ سے جنم دینے والی بات کس حوالے سے کہی؟

☆☆ شائد یہ تاثر انہوں نے میری بول چال کے نستعلیقی لہجے سے لیا ہوگا۔حالانکہ پیدائش میری ملتان کی ہے۔گاچنی مٹی کے دیس کا آدمی ہوں لیکن بزرگوں میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے شین قاف ذرا صاف ہو گیا ہے۔

☆ فرمان صاحب نے ایک بات اور ''آپ کی شاعری ہماری زندگی کی اُتھل پتھل کی آئنہ دار ہے'' اگر مراد آئنہ دکھانے سے ہے تو ہمارے خیال میں اس کا فائدہ کم نقصان زیادہ ہوا یعنی ہم لوگ برائی کے آگے ڈھال بننے کے بجائے خود اُس کا حصہ بن گئے؟

☆☆ معاف کیجیے آپ نے غلط مفہوم اخذ کیا۔زندگی کی اتھل پتھل سے ان کی مراد تغیر و تبدلِ حیات ہے جس کی آئینہ برداری (عکس بندی) شاعر اپنے اشعار میں ذاتی نظریات و جذبات و احساسات کو سموتے ہوئے کرتا ہے۔کوئی آئینہ دکھانے والا، عکس بندی کرنے والا ڈھال کیسے بن سکتا ہے۔ایک بار سویڈن کی ایک صحافی نے دوران گفتگو بتایا تھا کہ ہمارے ہاں ڈبل ٹرپل ایکس فلموں کے دوران عکس بندی کے دوران جو لوگ موجود ہوتے ہیں وہ پتھر کی طرح بے حس ہو کر کیمرے آپریٹ کرتے ہیں روشنیاں فکس کرتے ہیں اور پروفیشنل ڈائریکٹر کی طرح ہدایات دیتے ہیں۔اداکاروں سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کی جاتی کیونکہ وہ اسے بزنس کی طرح سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

☆ آپ کی فکر کے حوالے سے بھی صورت حال مبہم ہے۔آپ دومتضادفکر کے حامل احمدندیم قاسمی اوروزیرآغا سے تعلق کوزندگی کا اثاثہ گردانتے ہیں؟

☆☆ میری بچپن ہی سے ایسی تربیت رہی ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے بڑوں کا احترام کیا ہے۔جن دوشخصیات کا آپ ذکر کررہے ہیں وہ بھی میرے بزرگوں کی صف میں آتے ہیں۔بے شک آپس میں ان کے درمیان کوئی بھی اختلاف ہو،فکری یا شخصی۔میں نے ہمیشہ ان کا احترام کیا ہے اور جواب میں شفقت حاصل کی ہے۔ بڑوں کی شفقتیں اور محبتیں اثاثہ نہیں تو اور کیا ہیں؟ میں گروہی سیاستوں پر ایمان ہی نہیں رکھتا اس معاملے میں معتدل اور متوازن ہوں۔اس لیے:

محاذِ جنگ کا خاموش اک مبصّر ہوں
نہ اس طرف ہوں میں شامل، نہ اس طرف شامل

☆ آپ کے مشاہدے کا ذکر بڑی شدومد سے کیا جاتا ہے کچھ خلافِ شرع نہ ہوتو تفصیل بتلایئے۔

☆☆ خوبصورت ہی نہیں زندہ دل بھی ہیں آپ۔میرے مشاہدات کی تعریف کرتے کرتے خلافِ شرع مشاہدات بھی پوچھ لئے۔حالانکہ خلافِ شرع اُمور تو مشاہدے کی چیز ہی نہیں ہوتے۔البتہ مراد زندگی کے دیگر مشاہدات سے ہے تو بے شک گہرائیوں سے جزئیات تک سفر کیا ہے۔زندگی ایک طویل سفر کے دوران بے تحاشہ انٹ شنٹ، لکھنے کے بعد اب آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے بعض باتیں اپنے سیاق وسباق کے ساتھ سمجھ میں آنے لگی ہیں۔لہٰذا ٹھہر ٹھہر کے انہیں لکھ رہا ہوں۔

☆ سکہ بند ادیب، نقاد اور دانشور کو ناکام، محروم اور مایوس کہنا ذاتی پرخاش پر مبنی تو نہیں؟

☆☆ ایک دو نقادوں کے حوالے سے شائد میرے رویے میں آپ نے کچھ ایسا محسوس کیا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔نقاد میرا مسئلہ نہیں ہے تخلیق میرا مسئلہ ہے۔عالم تو یہ ہے کہ جس نے چار چھ کتابیں پڑھ لیں دانشوروں کی صف میں جا کر بیٹھ گیا۔جو لکھنے لکھانے کی تخلیقی صلاحیتوں کو منوا نہ سکا اس نے تنقید کا لٹھ تھام لیا۔وہ اچھا لکھ نہیں سکتا اچھے لکھنے کو بُرا تو ثابت کرسکتا ہے۔اپنی مُردہ تحریروں میں زندگی پیدا نہیں کرسکتا مگر زندہ تحریروں کا پوسٹ مارٹم تو کرسکتا ہے۔رہے سکّہ بند نقاد اور دانشور تو یہ بچارے وقت، سازگارِ حالات، تعلقات عامہ اور وسائل کی فراہمی کی پیداوار ہیں۔انہی کے بارے میں آلڈس ہکسلے نے کرٹیکس مافیا کینوپی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

☆ احمد ندیم قاسمی نے نہایت پُرکاری سے آپ کو میؔر اور مصحفؔی جیسے اساتذہ سے بہتر شاعر گردانتے ہوئے آپ کے کلام کو مرصع کہہ کر کس کے ساتھ زیادتی کی؟

☆☆ توبہ توبہ کہاں مصحفؔی، کہاں میؔر اور کہاں یہ فقیر۔چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔بس بزرگوں کی یہی غلط بخشیاں ہم جیسے چھوٹوں کا دماغ خراب کرتی ہیں۔لیکن خدا کا شکر ہے میں اپنی اوقات جانتا ہوں۔اسی لیے سر جھکائے اپنے کام میں مگن رہتا ہوں۔ادھر لاہور میں ایک علامہ ماہرِ عروض ہیں جو پہلے تو اصلاح پر اصلاح دے کر تلامذہ کی کتابیں مکمل کرواتے ہیں۔پھر انہیں چھپوانے کا حکم دیتے ہیں جیسے ہی کتاب چھپ کر آتی ہے یہ فوری صدارتی آرڈیننس جاری کردیتے ہیں کہ فلاں دن، فلاں جگہ، فلاں وقت اس کی تقریب رونمائی ہوجانی چاہیے۔ظاہر ہے صدارت آپ کے سوا کون کرسکتا ہے خطبہ صدارت میں زور دے کر فرماتے ہیں ''غالب نے اتنی بحروں میں غزلیں کہیں، اقبالؔ نے اتنی بحروں میں طبع آزمائی کی لیکن ہمارا پتر عبدالغفور دانشُور نے ان دونوں سے زیادہ بحروں میں غزلیں لکھ ماری ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے۔۔۔۔''اب تک علامہ موصوف دس پندرہ اقبالؔ اور غالبؔ پیدا کرچکے ہیں۔ایک مرتبہ مجھے علامہ اقبالؔ بنانے کے لیے میرے کاندھے پر دستِ شفقت رکھا۔میں نے نرمی سے ان کا دستِ شفقت ہٹاتے ہوئے کہا۔''حضرت! علامہ اقبال ایک ہی کافی ہے مزید بنا کر نصاب سازوں اور طلباء کے لیے دشواریاں نہ پیدا کریں۔''

☆ آپ کی آپ بیتی میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ژاں ژاک روسو کی پیروی کا شائبہ کیوں ہوتا ہے کہیں آپ خود کو فطرت خلقی کا مظہر تو نہیں گردان رہے؟

☆☆ ژاں ژاک رُوسو مجھے پسند تو ہے لیکن اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی وہ میرے ذہن میں نہیں آیا۔ویسے ذاتی طور پر مجھے اُردو کا فراموش شدہ بڑا ادیب محمد خالد اختر بے حد پسند ہے۔ان سے خط وکتابت بھی رہی اور ملاقاتیں بھی۔وہ انگریزی انداز میں دل کو موہ لینے والی اردو لکھتا تھا۔ بالکل آرٹ بکوالڈ کی طرح جوار دو انداز میں رواں انگریزی لکھتا رہا۔ان دو حضرات کے نام میں نے اس لیے تحریر کیے کہ دونوں کا اسلوب مجھے ہمیشہ پسند آیا مگر اثر میں نے کسی سے بھی قبول نہیں کیا:

مرے خاروخس ہیں اپنے، مرا اپنا ہے الاؤ

☆ آپ کا ناول ''دلاری'' اس حوالے سے متنازعہ کہلاتا ہے کہ آپ نے تقسیم سے قبل کے حالات درست پس منظر میں دیکھنے کے بجائے سنی سنائی باتوں کو من وعن تحریر کردیا؟

☆☆ نہیں۔ایسا نہیں ہے۔اس ناول نے مجھے کھپایا ہے خاصا وقت لیا ہے۔تقسیم سے قبل کا حقیقی پس منظر جاننے کے لیے مجھے خاصی کتابیں کھنگالنی پڑیں۔بے شمار وڈیو فلمیں اور گزیٹرز دیکھنے پڑے۔مشاعروں کے سلسلے میں دو ایک بار بھارت بھی جاچکا تھا اس لیے کہانی کے پلاٹ پر ناول کی عمارت تیار کرنے کے لیے خاصا مواد موجود تھا۔اس ناول کو میں نے ناول کے روایتی انداز میں نہیں لکھا موِنتاژ کے پیٹرن پر لکھا ہے۔

☆ آج کے جدید دور میں دو ملکوں یا دو قوموں کے تعلقات کسی ایک شعبے تک محدود رکھنا سادہ لوحی کے سوا کچھ نہیں۔آپ پڑوسی ملک بھارت کے ساتھ صرف ادبی تعلقات کی بات کس بنیاد پر کرتے ہیں؟

☆☆ بدقسمتی سے ہم دو پڑوسیوں کے درمیان معاملات کچھ اتنے الجھ گئے ہیں کہ انہیں سلجھانے کا ایک راستہ ادب بھی نظر آتا ہے دونوں ممالک کے درمیان غیر متنازعہ رسائل وجرائد وکتب اور غیر سیاسی دانشوروں کی آزادانہ آمد ورفت سے شائد

دھیرے دھیرے موسم کچھ معتدل ہو۔ رہے بڑے مسائل تو ان کا آبرومندانہ حل نکالنا حکومتوں کا کام ہوتا ہے۔ ادیب تو امن کے سفیر کا رول ادا کرسکتا ہے اور صرف یہی کہہ سکتا ہے:

ان کا جو کام وہ اہلِ سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

☆ منشایاد مرحوم بڑے دوست دار اور وضع دار انسان تھے پھر انہوں نے سی۔ڈی۔اے کے مشاعرے میں آپ کو بطور شاعر مدعو کیوں نہ کیا؟

☆☆ منشایاد صاحب ۶۰ء کی دہائی میں عام قسم کے فلمی پرچوں مثلاً شمع لاہور وغیرہ میں افسانے لکھتے تھے۔ میں غیر ادبی قسم کے رسائل مثلاً آداب عرض لاہور میں کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ اس کا ذکر ایک دفعہ میں نے ان سے کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ خاصے معروف افسانہ نگار بن چکے تھے۔ میری بات کا ردِ عمل ان کے چہرے پر صاف نظر آیا۔ بعد میں جب بھی ملے سرسری انداز میں ملے۔ حالانکہ میں احتراماً انہیں بھائیا جی کہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ شمع لاہور کا حوالہ برسوں تک ان کے اعصاب پر سوار رہے گا اور جب سی ڈی اے کا مشاعرہ ہوگا تو وہ مجھے بطور شاعر نہیں، بطور سامع مدعو کریں گے اور جو مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ دنیا ہے جب بھی آپ کسی کو اس کا ماضی یاد دلائیں گے وہ آپ سے یقیناً روٹھ جائے گا۔ بھائیا جی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

☆ ہمارے نصاب میں بقول آپ کے بے وقعت چیزیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ہم دریافت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ بطور ادیب، شاعر، دانشور اور اُستاد آپ نے اس کے خلاف کس کس فورم پر آواز اُٹھائی اور اُس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟

☆☆ اس میں کیا شک ہے کہ ہمارے نصاب میں بہت سی ایسی چیزیں ڈال دی جاتی ہیں جو طالب علم کے کسی کام نہیں آتیں۔ مثلاً ایف اے کی اردو ٹیکسٹ بک میں ایک مرتبہ آتش کی یہ غزل بھی شامل کر دی گئی جس کا مقطع ہے:

مہِ دو ہفتہ بھی ہوتا تو لطف تھا آتش
اکیلا پی کے شرابِ دوسالہ کیا کرتا؟

اب آپ میری جگہ کلاس روم میں ہوں تو اٹھارہ انیس برس کے طلباء و طالبات کو اس شعر کا مفہوم بے ضرر، معصوم اور مظلوم الفاظ میں سمجھا دیجیے۔ ظاہر ہے اسی قسم کی لغویات کے خلاف میں نے کالم لکھے، مضامین لکھے، جہاں جہاں بول سکتا تھا جی کھول کر بولا۔ اس کا یقیناً یہ فائدہ ہوا کہ اگلے سال اردو نصاب سے یہ غزل خارج کر دی گئی۔ اور ہم یہ سمجھانے سے بچ گئے کہ ''شرابِ دوسالہ'' کیا ہوتی ہے اور اسے پینے کے لیے مہِ دو ہفتہ کی کیا ضرورت یا اہمیت کیا ہوتی ہے؟

☆ مشاعروں اور متاشاعروں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ مشاعرے کبھی انسٹی ٹیوشن ہوا کرتے تھے اب میل ملاقات کے بہانے بن گئے ہیں۔ متاشاعروں سے غالباً آپ کی مراد متشاعر ہے تو صاحب عرض یہ ہے کہ متشاعر تو شاعر ہوتا ہی نہیں اس پہ کیا تبصرہ کریں۔ آخر شوقیہ فنکار بھی کسی نہ کسی فلم میں کام آ ہی جاتے ہیں نا۔

☆ ادب کے نمبر دو لوگ یعنی جو خود نہیں کہتے دوسروں سے لکھواتے ہیں کی بابت آپ کی رائے جاننا بھی ضروری ہے؟

☆☆ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو شاعری کو شہرت کے حصول کا آسان ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جنہیں مطالعے، محنت اور ریاضت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ ڈمی لوگ ہیں۔ آپ نے انہیں دو نمبر کہہ کر زیادتی کی ہے، انہیں دس نمبری کہنا چاہیے۔

☆ کچھ لوگ آپ پر بھی تلخ وشیریں مشروب کے عوض یہ خدمات بالخصوص خواتین کے حوالے سے انجام دینے کا الزام لگاتے ہیں؟

☆☆ جن خواتین کو شاعری سے دلچسپی ہوتی ہے وہ مشاورت یا رہنمائی کے لیے عموماً بوڑھے شاعروں سے رجوع کرتی ہیں ہم جیسے، چہرے سے بوڑھے نظر نہ آنے والوں کو در خورِ اعتناء اس لیے نہیں سمجھتیں کہ کہیں کوئی اسکینڈل نہ بن جائے۔ کہیں بات لیک آؤٹ نہ ہو جائے۔ رہی بات تلخ وشیریں مشروبات کی تو اس کا میں نہ عادی ہوں نہ متحمل ہوں۔ لہٰذا اب تک تو کسی خاتون نے متذکرہ مشروبات سے میری تواضع نہیں کی زیادہ سے زیادہ چائے کافی یا بسکٹوں سے تواضع کی ہے اور اس میزبانی کے صلے میں نہ مجھ سے کچھ مانگا نہ میں عورت بن کر عورتوں والی شاعری لکھ سکتا ہوں۔ اس لیے جن مہربانوں نے میرے حوالے سے ایسی افواہیں اڑا رکھی ہیں انہیں یہ جواب پڑھ کر بڑی مایوسی ہوگی۔ ان سے کوئی ثبوت مانگ لیجیے گا۔

☆ یہ خیال کہاں تک درست ہے کہ دیگر شعبوں کی طرح اہل قلم نے بھی کمرشل ازم کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ اس کے نتائج آپ کے خیال میں کیا ہوں گے؟

☆☆ جس معاشرے کی بنیاد ہی مادیت پرستی ہو وہاں کمرشل ازم ہی فروغ پائے گا۔ اہل قلم بھی اسی معاشرے کے فرد ہیں اگر پبلشر کے ساتھ پیٹ لگا ہوا ہے تو کیا اہلِ قلم بے شکم ہیں؟

☆ آپ کے نزدیک بڑے ادب کا معیار اُس کی مقبولیت ہے۔ تو پھر پاپولر ادب کو اچھوت کیوں گردانا جاتا ہے؟

☆☆ مقبولیت الگ چیز ہے بڑا ادب الگ چیز ہے۔ قطعاً ضروری نہیں کہ مقبول ادیب یا شاعر بڑا بھی ہو۔ بڑائی کے علیحدہ معیار اور پیمانے ہیں۔ بہت کم خوش نصیب ہوں گے جنہیں یہ دونوں چیزیں بیک وقت حاصل ہوں۔

☆ اس بات سے تو اختلاف ممکن نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے ہوئے اکیسویں صدی میں داخل ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ رویہ ہمیں کس اُور لے کر جا رہا ہے؟

☆☆ تباہی اور بربادی کی طرف۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں:

مُردوں کے درمیان رہائش کے جُرم پر
مجھ زندہ آدمی کو تو مر جانا چاہیے

''میرا عہدِ معتبر''

(محترم اعتبار ساجد کے غزلیہ کلام سے کشید)

عائشہ ممتاز بھٹی (لاہور)

تو کیا یہی ہے مرا عہدِ معتبر مرے دوست؟ کہ اس کے سائے میں مُنصف ہوں دربدر مرے دوست
انہیں تو خون پسینہ بہا کے سینچا تھا کہاں گئی مری تاریخِ بام و در مرے دوست
تری تو منطقیں اپنی ہیں، اپنے دعوے ہیں مرے سوال پہ پھر سوچ، غور کر، مرے دوست
دُعا بدست ہے گلیوں میں، مسجدوں میں ہجوم ملے جو وقت، انہیں دیکھ اک نظر مرے دوست
گل و ثمر تو ہوئے خاکِ جشن میں معدوم ہیں قمقموں سے سجائے ہوئے شجر مرے دوست
انہیں نظر نہیں آتی یہ صورتِ حالات؟ کہاں گئے مرے شہروں کے دیدہ ور مرے دوست

...... ○ ......

☆

رہا پا برہنہ وہ خود مگر، نیا بوٹ مجھ کو دلا دیا
مرے باپ کے اسی روپ نے مجھے باپ جیسا بنا دیا
جو گلاب تازہ تھے، رکھ دیئے، کسی ٹوٹی پھوٹی سی قبر پر
وہ جو خار دار سی بیل تھی اسے راستے سے ہٹا دیا
کسی خالی طاق میں، روشنی کی لکیر، لمبی سی کھینچ دی
کہیں اک شکستہ فصیل پر کوئی مور اُجلا بنا دیا
میں تماشا دیکھنا چاہتا تھا سَروں کی اُونچی قطار سے
مرے پیر کاندھے پہ رکھ لئے، مجھے دوسروں سے بڑھا دیا
جو گلہ کیا کہ شدید دھوپ میں یہ سفر ہے بہت کٹھن
تو رِدا میں مجھ کو چھپا لیا، کڑی دھوپ، لُو سے بچا دیا
کبھی سردیوں میں ہوا چلی تو ٹھٹھرتی رات کو فرش پر
مرا باپ چپکے سے سو گیا، مجھے اپنا کھیس اُڑھا دیا
وہ جو ایک عمر مرے پاس تھا، مری آس، میری اساس تھا
اُسی رہ نمائے حیات نے مجھے درسِ صبر و رضا دیا

○

☆

وہ سنہری دھوپ کہاں گئی، وہ حسین گلاب کدھر گئے
وہ زمانہ کیسے گزر گیا، مرے تیرے خواب کدھر گئے
کہیں تتلیوں کی سراؤں میں، کہیں پھول بن کی گپھاؤں میں
چلو ایک دن انہیں ڈھونڈنے، وہ ورق، وہ باب کدھر گئے
جنہیں گال رکھ کے زمیں پہ ہم، بڑے انہماک سے دیکھتے
بھری دوپہر کے وہ نیلگوں، وہ ہرے سراب کدھر گئے
مرے آسمان کی چھت پہ تھے وہ جو نیلے پیلے سے قمقمے
وہ ستارے کس نے بجھا دیئے، مرے ماہتاب کدھر گئے
کئی سالِ ہجر گزر گئے، یہی سوچتے، یہی کھوجتے
وہ خلش تمہاری کہاں گئی، وہ مرے عذاب کدھر گئے
کہاں کھو گئیں وہ عبارتیں، جو مرے ہنر کا کمال تھیں
تری ڈائری میں جو درج تھے، مرے انتخاب کدھر گئے
پسِ اختتامِ مشاعرہ میں اکیلا کمرے میں آ گیا!
اب اکیلا کمرے میں کیا کروں، مرے ہمرکاب کدھر گئے

○

☆

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں، مرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں مجھے کوئی شام ادھار دو

مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں مرے خال وخد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، مرے سارے زنگ اتار دو

کسی اور کو مرے حال سے نہ غرض ہے کوئی نہ واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو

مری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے جدائیوں کے عذاب نے
مرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا، مری دھڑکنوں کو قرار دو

تمہیں صبح کیسی لگی، کہو، مری خواہشوں کے دیار کی
جو بھلی لگی تو یہیں رہو، اسے چاہتوں سے نکھار دو

وہاں گھر میں کون ہے منتظر کہ ہو فکر دیر سویر کی
بڑی مختصر سی یہ رات ہے اسی چاندنی میں گذار دو

کوئی بات کرنی ہے چاند سے کسی شاخسار کی اوٹ میں
مجھے راستے میں یہیں کہیں کسی کنج گل میں اتار دو

...... O ......

☆

کسی کو ہم سے ہیں چند شکوے، کسی کو بے حد شکایتیں ہیں
ہمارے حصے میں صرف اپنی صفائیاں ہیں، وضاحتیں ہیں

قدم قدم پر بدل رہے ہیں مسافروں کی طلب کے رستے
ہواؤں جیسی محبتیں ہیں، صداؤں جیسی رفاقتیں ہیں

کسی کا مقروض میں نہیں، پر، مرے گریباں پہ ہاتھ سب کے
کوئی مری چاہتوں کا دشمن، کسی کو درکار چاہتیں ہیں

تری جدائی کے کتنے سورج، افق پہ ڈوبے، مگر ابھی تک
خلش ہے سینے میں پہلے دن سی، لہو میں ویسی ہی وحشتیں ہیں

مری محبت کے رازداں نے یہ کہہ کے لوٹا دیا مرا خط
کہ بھیگی بھیگی سی آنسوؤں میں تمام گنجلک عبارتیں ہیں

میں دوسروں کی خوشی کی خاطر غبار بن کر بکھر گیا ہوں
مگر کسی نے یہ حق نہ مانا کہ میری بھی کچھ ضرورتیں ہیں

O

☆

بالآخر یہ حسیں منظر مٹا دینا ہی پڑتا ہے
کسی کے سر کو شانے سے ہٹا دینا ہی پڑتا ہے

کسی دیر آشنا کو جھوٹے سچے کچھ حوالوں سے
تعارف کے لیے سب سے ملا دینا ہی پڑتا ہے

جو سانسوں میں مہکتے ہیں جو آنکھوں میں دمکتے ہیں
اچانک ایک دن ان کو بھلا دینا ہی پڑتا ہے

دیئے جو ہم جلاتے ہیں نہایت شوق سے ہر شب
انہیں خود اپنی پھونکوں سے بجھا دینا ہی پڑتا ہے

کوئی جب پوچھتا ہے ہم سے، کیسا حال ہے ساجد
ہمیں محتاط ہو کر مسکرا دینا ہی پڑتا ہے

چمک اٹھتے ہیں ساجد جب ستارے اس کی پلکوں پر
اسے دل سے لگا کر حوصلہ دینا ہی پڑتا ہے

O

☆

آنے والی تھی خزاں، میدان خالی کر دیا کل ہوائے شب نے سارا لان خالی کر دیا
ہم ترے خوابوں کی جنت سے نکل کر آ گئے دیکھ، تیرا قصر عالی شان خالی کر دیا
دشمنوں نے شست باندھی خیمۂ امید پر دوستوں نے درۂ امکان خالی کر دیا
بانٹنے نکلا ہے وہ پھولوں کے تحفے شہر میں اس خبر پر ہم نے بھی گلدان خالی کر دیا
لے گیا وہ ساتھ اپنے، دل کی ساری رونقیں کس قدر یہ شہر تھا گنجان خالی کر دیا
ساری چڑیاں اڑ گئیں مجھ کو اکیلا چھوڑ کر میرے گھر کا صحن اور دالان خالی کر دیا
ڈائری میں سارے اچھے شعر چن کر لکھ لئے ایک لڑکی نے مرا دیوان خالی کر دیا

...... ○ ......

☆

محبت میں محبت کی صفائی دے رہے ہیں ہم
عجب عاشق ہیں عذر آشنائی دے رہے ہیں ہم
ہمارے حال پر جاناں بہت خوش فہم مت ہونا
دکھانے کے لیے ایسے دکھائی دے رہے ہیں ہم
کوئی تحفہ تمہیں دینا تو تھا اپنی محبت کا
تمہیں لو، آج زخم آشنائی دے رہے ہیں ہم
ہمارے رت جگوں کا تم کو کچھ احساس تو ہوگا
دم رخصت، تمہیں شام جدائی دے رہے ہیں ہم
جنہیں خون جگر سے پیش رو تحریر کرتے تھے
اب ان لفظوں کو دل کی روشنائی دے رہے ہیں ہم
ہم اتنے شور میں سب سے مخاطب بھی نہیں ساجد
جو سن سکتے ہیں بس ان کو سنائی دے رہے ہیں ہم

○

☆

آشنائی تھی فقط وہ، آشنائی کی طرح
ہم نے کیا حالت بنالی جون* بھائی کی طرح
اتنی شدت سے انہیں سوچا نہیں لیکن ہمیں
اور بھی دکھ تھے کڑے تیری جدائی کی طرح
جھیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا سی بات پر
ذہن میں الفاظ جم جاتے ہیں کائی کی طرح
تجھ کو خط لکھتا ہوں اور کاغذ پہ ہر آنسو مرا
جذب ہو جاتا ہے پھیکی روشنائی کی طرح
جیسے بے قابو ہوں لہجے کی طنابیں آج کل
تجھ کو اب آواز دیتا ہوں دہائی کی طرح
جانے ساجدؔ ہم نے کیا سے کیا بنا ڈالا اسے
ہجر تھا بس عام لوگوں کی جدائی کی طرح

○

* جون ایلیا

''چہارسُو''

☆

کہا: دن کو بھی یہ گھر کس لئے ویران رہتا ہے؟
یہاں کیا ہم سا کوئی بے سرو سامان رہتا ہے؟

در و دیوار سنّاٹے کی چادر میں ہیں خوابیدہ
بھلا ایسی جگہ زندہ کوئی انسان رہتا ہے؟

مسلسل پوچھنے پر ایک چلمن سے جواب آیا:
یہاں اک دل شکستہ صاحبِ دیوان رہتا ہے

جھجک کر میں نے پوچھا: کیا کبھی باہر نہیں آتا؟
جواب آیا: اسے خلوت میں اطمینان رہتا ہے

کہا: کیا اس کے رشتہ دار بھی ملنے نہیں آتے؟
جواب آیا: یہ صحرا رات دن سنسان رہتا ہے

کہا: کوئی تو ہو گا اس کے دکھ سکھ بانٹنے والا؟
جواب آیا: نہیں۔ خالی یہ گھر، یہ لان رہتا ہے

کہا:اس گھر کے آنگن میں ہیں کچھ پھولوں کے پودے بھی
جواب آیا: کہ خالی پھر بھی ہر گلدان رہتا ہے

کہا: کیا اس محلے میں نہیں پرسان حال اس کا؟
جواب آیا: خیال اس کا مجھے ہر آن رہتا ہے!

خدا کا شکر ہے ہم اک فضا میں سانس لیتے ہیں
اگر ملتے نہیں، اتنا تو اطمینان رہتا ہے!

...... O ......

☆

ڈھونڈتے کیا ہوان آنکھوں میں کہانی میری
خود میں گم رہنا تو عادت ہے پرانی میری

بھیڑ میں بھی تمہیں مل جاؤں گا آسانی سے
کھویا کھویا ہوا رہنا ہے نشانی میری

میں نے اک بار کہا تھا کہ بہت پیاسا ہوں
تب سے مشہور ہوئی تشنہ دہانی میری

یہی دیوار و در وبام تھے میرے ہم راز
انہی گلیوں میں بھٹکتی تھی جوانی میری

تو بھی اس شہر کا باسی ہے تو دل سے لگ جا
تجھ سے وابستہ ہے اک یاد پرانی میری

کربلا دشت محبت کو بنا رکھا ہے
کیا غزل گوئی ہے کیا، مرثیہ خوانی میری

دھیمے لہجے کا سخنور ہوں، نہ صہبا[1] ہوں نہ جوش[2]
میں کہاں اور کہاں شعلہ بیانی میری

O

[1] صہبا اختر [2] جوش ملیح آبادی

☆

کسی دن تجھ سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
چلو، پھر سال پہلے کا زمانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

اندھیرا کتنا ہی گہرا ہو، راتیں کتنی کالی ہوں
پرندے اپنا اپنا آشیانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

کئی درکھل بھی جاتے ہیں جو اک در بند ہوتا ہے
ہم ایسے لوگ اپنا آب و دانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

چھتیں جن کے سروں سے چھین لی جاتیں وہ بے گھر
کہیں بھی سر چھپانے کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

گلے ہم سے بھی آ لگتا ہے کوئی درد کا مارا
کسی دل سوختہ کا ہم بھی شانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

خدا محفوظ رکھے، ان کی زد پہ ہم نہ آ جائیں
شکاری اپنے مطلب کا نشانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

انا کی جنگ میں آخر بھرم قائم بھی رکھنا ہے
تو یوں کرتے ہیں، رستہ درمیانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

O

نشیب و فراز کا شاعر

احسان دانش
(●)

اعتبار ساجد نئے خیال نئی فکر اور نئی دھج کا نوجوان ہے۔ میں اسے عرصے سے جانتا ہوں اور شروع ہی سے اس میں شاعری کے بلند پرواز جراثیم غول درغول دیکھ رہا ہوں۔ میں اس دور کی شاعری دبیز ابہام اور مفہوم کے الجھاؤ سے متفق نہیں، ہر چند کہ ابہام ایک حسن اور حریری اجمال ہے جو شاعر کے مافی الضمیر پر باریک آئینے اور ہلتی ہوئی چلمن کا کام دیتا ہے لیکن اگر ابہام میں مفہوم کا جھلکار نہیں تو شاعر ناکام اور شاعری بے مقصدیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

اعتبار ساجد کے کلام میں نہ گنجلک ہے نہ مستوری۔ وہ اپنے ایک خاص انداز نظر سے دیکھتا اور اچھوتے اسلوب نگارش سے لکھتا ہے اس کے خیالات و جذبات الفاظ کا ایسا لباس اختیار کرتے ہیں جس سے افسون بیاں دوبالا اور زود اثر ہو جاتا ہے اور معنی اپنے اپنے دریچوں سے گردنیں نکال کر سامعین (یا قارئین) کو متوجہ کرنے لگتے ہیں۔

اعتبار ساجد ملازم ہے اور ملازم ایسا ہوتا ہے جسے اپنے جذبات و عزائم کے اعلان اور احساسات کے اظہار کا حق نہیں پہنچتا مگر اعتبار ساجد جیسے لوگ اپنے سحر زبان کے بل پر بڑے نازک نازک مسائل ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرنا جانتے ہیں اور سچ پوچھو تو یہی شاعری کا حسن اور شاعر کا کمال ہے۔

میں اعتبار ساجد کی عمر کو دیکھتے ہوئے حیران ہوں کہ غم روزگار کے گھیراؤ کے باوجود وہ کہیں بھی مایوسانہ روش اختیار نہیں کرتا اور وزندگی کو خوش انداز رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر قاعدہ ہے کہ حقائق دیر تک پردے کے عادی نہیں ہوتے چنانچہ کہیں نہ کہیں ان کی روح کی تلخی اور ضمیر کا زہر نمایاں ہو ہی جاتا ہے اور یہ زہر وہی ہے جو کردار کی جان اور فن کی زینت کہلاتا ہے۔ وہ جس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے اس قبیل کا شاعر کوئی خاص روش اختیار نہیں کرتا وہ تو صرف معاشرے کے نشیبوں اور انسانیت کے زخموں پر گہری نظر ڈالتا ہے چنانچہ اعتبار ساجد نے بھی پس ماندہ طبقوں پر نظر ڈالی ہے اور اس میں وہ انہیں تہوں تک پہنچا ہے جہاں اچھے سے اچھا اور بلند فکر سے بلند فکر شاعر پہنچ سکتا ہے۔ اس نے پس ماندہ طبقوں کا استحصال کرنیوالوں کے لیے وہی کچھ لکھا ہے جو شاعر کو لکھنا چاہیے۔

یہ اعتبار ساجد ہی کی تخصیص نہیں ہر زندہ احساس شاعر جہاں لالہ و گل کی بہاروں سے متاثر ہوتا ہے وہیں زخموں اور ناسوروں، ویرانوں اور کھنڈروں پر بھی اسی توجہ سے نظر ڈالتا ہے۔ اور اس کا تاثر آخر میں اشعار کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایسے اشعار ہی شاعری میں عمر طویل لے کر اترتے ہیں۔ ہنگامی مشاہدہ ہمیشہ ایک طائرانہ رفتار سے گزر جاتا ہے مگر زندگی کے اقدارِ مشترک جب متزلزل ہوتے ہیں اس وقت معیاری شاعر تڑپ اٹھتا ہے اسے انجام کی پرواہ نہیں رہتی جیسے کہیں کہیں اعتبار ساجد کے ہاں بھی یہ جذبہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

اعتبار ساجد کے اشعار اس کی شاعرانہ عظمت اور ماہرانہ برتری کے ترجمان ہیں کیونکہ فنکار کی زندگی فن کی زبان سے اپنا تعارف کرواتی ہے اور اس کے فن کا روپ ہی اس کی عظمت و قیمت بتاتا ہے۔ اعتبار ساجد کی ذہنی اُپج اور فکری استعداد کے ساتھ اس کا محاکاتی رجحان اس کی شخصیت کا تعارف کراتا ہے جس سے اس کے طبعی میلانات، اخلاقی خصوصیات اور سماجی کیفیات کھل کر سامنے آ جاتی ہیں اور انہیں باتوں کا سلیقہ اور حسنِ بیاں اس کی شخصیت کا تعین اور اس کے سفر کی راہ متعین کرتا ہے۔

میرے سامنے اعتبار ساجد کی پوری کتاب نہیں لیکن جس قدر اشعار مجھ تک پہنچے ہیں ان سے وہ آج کے جدید شعراء کی صف میں آتے ہیں۔ ماحول سے علیحدگی کے باوصف ان کے کلام میں وہ تمام مشروط خوبیاں موجود ہیں جو آج کے اُونچے درجے کے شاعروں میں ملتی ہیں۔

اگر ان کی مشق و مزاولت نہ رکی اور تحسین کے لاسے نے ان کے پر و پرواز نہ باندھ دیئے یا حالات کی گرفت نے ان کی سانس نہ روک دی تو ان کی شاعری مستقبل کی نشاندھی سے عاری نہیں۔ میری نظر میں اعتبار ساجد کا مستقبل تابناک ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے اور صحت مند رکھے۔ آمین

☆

برگِ سبز است تحفۂ درویش

سید ضمیر جعفری

(●)

اعتبار ساجد سے ہم کب ملے یہ تو یاد نہیں۔بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایسا شخص ہے کہ اس کو یاد رکھنے کے لیے اس سے دوسری مرتبہ ملنے کی ضرورت نہیں۔وہ اگر ساتھ ساتھ نہ بھی ہو تو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرح آس پاس موجود ہوگا۔شاید ہی کوئی ادبی رسالہ ہو جس میں اس کی نثری یا نظمی تخلیق نہ ہو۔''ہول سیل'' ترسیل کے لیے اپنا رسالہ پذیرائی بھی نکال رکھا ہے اور اب تو ہم دن کو روزنامہ الاخبار اسلام آباد میں ان کے کالم ''روزن خیال'' کے روزنوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں۔اس لحاظ سے وہ ہمارے ''پیٹی بھائی'' ٹھہرے۔ تقریبات کی تنظیم وتزئین میں بھی ان کو تقریبات کے فیلڈ مارشل ڈاکٹر غضنفر مہدی کا ''کرنل سٹاف'' سمجھئے۔جب تک اعتبار ساجد کا اپنا ''ولیمہ'' نہیں ہوا تھا ان سے جب بھی ملاقات ہوئی وہ عموماً کسی ولیمہ سے آ رہے ہوتے یا جا رہے ہوتے۔اس کتاب کے مطالعے سے بھی کہ دراصل یہ خاکوں کی کتاب ہے۔۔۔یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا زیادہ تر وقت اہل قلم کے نظام شمسی میں گھومتے گزرتا ہے مگر شوق کے اس عالم میں بھی احتیاط کا یہ عالم کہ اس آمدورفت میں وہ کسی ستارے سے ٹکراتے نہیں حالانکہ گردش ان کے اپنے ہی ستارے کی سب سے تیز معلوم ہوتی ہے میں خیال کرتا ہوں کہ اگر وہ استاد نہ ہوتے تو اپنی متفرق مصروفیات کے ہجوم میں وہ اتنی تحریریں شاید ہی لکھ سکتے۔یہ ان کی مزید خوش قسمتی تھی کہ پروفیسری ان کو اس عہد میں ملی جس کے بارے میں اسمبلی کے ایک امیدوار نے اپنے منشور میں یہ بشارت دی تھی کہ تعلیم ہوگی عام:فیس دیں گے عوام۔

خیر،ہم اب تک ان کو جتنا کچھ دیکھ سکے اور سمجھ پائے اس سے یہ تاثر قائم ہوا جو غلط بھی ہو سکتا ہے کہ اعتبار ساجد ان لوگوں میں سے ہے جو ''وصول'' آسانی سے کئے جاتے ہیں مگر ''قبول'' بمشکل ہی کئے جاتے ہیں۔کبھی ساجد زیادہ اور اعتبار کم۔کبھی اعتبار حاضر اور ساجد غائب۔ان کی ذات میں خوبیوں کا اتنا اژدہام ہے کہ بعض خوبیاں ہندوستان کے سابق والیان ریاست کی بیگمات کی طرح غیر مستعمل رہ جائیں یا ہماری جمہوریت کی طرح ''زنگ آلود'' بلکہ ''جنگ آلود'' ہو جائیں تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔اعتبار ساجد کی سب سے بڑی دشواری، اس کی راہ کا سب سے بھاری پتھر۔۔۔خود اس کی اپنی ذات ہے۔۔۔ہمارا زمانہ بڑے زمینداروں۔۔۔بڑے کارخانہ داروں اور بڑے زرداروں کو تو قبول کر سکتا ہے،مگر بیک وقت دل ودماغ کی اتنی خوبیاں رکھنے والے شخص کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتا جو لکھے تو تحریر میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔شعر میں خواب مجسم ہو جائیں اور بولے تو جمنا اور جہلم کے دھارے پہلو بہ پہلو بہہ نکلیں۔پھر مزاج میں انکسار کا یہ عالم کہ گویا کسی ''سٹاکسٹ'' کے ہاں انکسار کی ''بوریاں'' بھری پڑی ہوں۔عقل۔۔۔علم سے زیادہ۔۔۔تجربہ زندگی سے زیادہ۔۔۔مجھے تو اعتبار ساجد فرد کی بجائے کوئی ملک معلوم ہوتا ہے جس کی تاریخ تو ہو مگر جغرافیہ نہ ہو۔ مجموعی طور پر ایسا شخص معلوم ہوا کہ جس سے دور رہا نہ جائے اور قریب جانے سے خوف آئے۔جس طرح کالجوں کے مشاعروں میں ان لڑکوں سے بھی جو نہ جانے کس وقت داڑھی رکھ لیں۔غیر معمولی لوگ شاید تضادات سے ہی نمو پاتے ہیں۔ اعتبار ساجد باہر سے بہت کچا اور لج لجا سا معلوم ہوتا ہے اس کا اعتبار ہمیں اس دن آیا جب وہ اردو کے منفرد مزاح نگار کرنل محمد خان سے انٹرویو لے آیا۔کرنل محمد خان ''مورچے'' کے آدمی تو تھے مگر ''میدان'' کے آدمی نہیں۔وہ ہٹلر کے سامنے اتنا نہیں بھاگے جتنا ''ٹیلی ویژن'' کے کیمرے سے بھاگتے تھے۔وہ اس عہد کے چند مشہور ترین ادیبوں میں سے ہیں مگر شفیق الرحمٰن کی طرح ہمارے ملک کے دوسرے ادیب ہیں کہ شہرت ان کے گھر آتی ہے وہ چل کر شہرت کے گھر نہیں گئے۔ان کا شمار ایسے یگانہ روزگار شوہروں میں ہوتا ہے جو اپنی بیوی سے بھی بہت کم بات کرتے ہیں۔مگر اس کم آمیز شرمیلے اور درویش کرنل نے بھی اپنی ''بندوق'' اعتبار ساجد کے ''شہہ'' کے سامنے رکھ دی اور اردو ادب کو ایک نادر دستاویز نصیب ہوگئی۔ایک اعلیٰ سفارت کار کی کارکردگی کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ملک کے مفاد میں کتنی عمدگی کے ساتھ جھوٹ بول سکتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اعتبار ساجد اگر امور خارجہ کی خدمت سے وابستہ ہوتا تو وہ اتنا اچھا سفارت کار ہوتا کہ اگر وہ کسی سے کہتا کہ جہنم میں جاؤ تو وہ شخص بخوشی جہنم میں چلا جاتا۔

اعتبار ساجد ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی زندگی کا راستہ اپنے عزم و عمل سے بناتے ہیں۔میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے ''عمل'' نے اس کے کردار کی تشکیل میں کتنا کردار ادا کیا ہے مگر اس کی عادات پر اس کے نمایاں نقوش دکھائی دیتے ہیں۔

اعتبار ساجد کے فن کا افق وسیع بھی ہے اور بہت روشن بھی۔گفتگو جیسا کہ پہلے عرض کیا مختصر ہوگی۔ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جب ہم وقت ضائع کرتے ہیں تو وقت بھی ہمیں ضائع کرتا ہے۔میرے نزدیک ایک اچھا ادیب وہ ہے جو ایک اعلیٰ جرنیل کی طرح معرکہ جیت کر دکھائے اور اعتبار ساجد نے ہر معرکہ جیت کر دکھایا ہے۔یقیناً وہ اس لمحے کی بات بھی کرتا ہے جو اس کی مٹھی میں ہے۔اس کے بعض مضامین میں اپنے معاشرے کی ناہمواریوں کی نشاندہی بھی ملے گی۔مگر اس کا آرٹ شگفتگی میں گندھا ہوا ہے اس کا کمال یہ ہے کہ وہ کرخت باقرخوانی بنانے والے تندور میں سے کریم والا نرم کیک نکال لاتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ وہ خیال کے مقابلے میں اپنے فن کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔مجھے اس کے ہاں ایسے جملے بہت کم دکھائی دیے جن پر مصنف کی توجہ کم دکھائی دی ہو۔زیادہ بولنے کی

طرح زیادہ لکھنے میں بھی زیادہ غلطیوں کا احتمال ہوتا ہے مگر اعتبار ساجد کو آپ کہیں ''تھڑتے'' یا ''اکھڑتے'' نہیں پائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر پائیدار بھی ہے اور موسلا دھار بھی۔ اس کے افق پر دھند نہیں۔ یہ راولپنڈی کے راجہ بازار کی بغلی گلیوں کے بجائے شاہراہ اسلام آباد پر چلنے والا مزاج ہے۔ اس کے ہاں ایسے ایسے خوبصورت جملے ملتے ہیں کہ قاری ان کے چہرے کی طرح ان کی پیٹھ بھی دیکھتا رہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اس کی ہر کتاب کو اسی لیے پڑھ سکا کہ یہ اپنے آپ کو پڑھوا لیتی ہے۔ اس کی کامیابی کا راز فن پر جانکاہ ریاضت کا عمل ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ سونا تپائے بغیر نہیں نکھرتا اور ریاضت کے اسی عمل نے اس کی ہر کتاب کو اردو ادب کے مزاج میں ایک اضافے کا امتیاز بخش دیا ہے۔ خدا اسے زندگی دے اور وہ اسی طرح لکھتا رہے۔ اپنی تو بس یہی دعا ہے!

تحریر سے اعتبار ساجد کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ بلیک اینڈ وائٹ فوٹوگراف کی طرح واضح اور صاف ہے۔ ایک آئیڈلسٹک نوجوان۔ کہہ دینے کا متوالہ۔ گرد و پیش میں حسن دیکھنے کا عادی۔ نیک تمناؤں سے بھرپور۔ کھلا دل۔۔۔ کھلا قلم۔۔۔ کھلی بات۔ وہ حسن کی پچکاری چلاتا ہے اور پڑھنے والے کو اپنے رنگ میں بھگو دیتا ہے۔

ممتاز مفتی

اعتبار ساجد کے الفاظ کومل اور سوچ پوتر ہے۔ وہ آسان لکھنے والا مشکل لکھاری ہے۔ زندگی کو جس آنکھ سے وہ دیکھتا ہے ویسی آنکھ سب کے پاس نہیں ہوتی۔ گہری۔ ہمدرد اور دل میں اتر جانے والی۔

کشمیری لال ذاکر

معاشرے کی ناہمواریوں اور روزمرہ کے گوناگوں مسائل پر اعتبار ساجد کی گرفت خاصی مضبوط ہے اور ان کی طبع رواں کسی موضوع پر بند نہیں۔ یہ معمولی سے معمولی مسئلے کو بھی اپنی سادہ اور دلنشیں تحریر سے قابل توجہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے طنز میں تلخی کا ذرا سا شائبہ نہیں۔

شفیق الرحمٰن

اعتبار ساجد کی شاعری سے تو ایک عرصے سے تعارف تھا اور بڑا خوشگوار تعارف۔ لیکن ان کی نثر خصوصاً مزاحیہ نثر سے آشنائی نہ تھی تا آنکہ ان کا ایک مختصر مگر دلچسپ خط وارد ہوا۔ اسے پڑھا تو خط کے اختصار کے باوجود اس کے لکھنے والے کے انداز تحریر میں ایک فن کار یعنی مزاح نگار چھپا نظر آیا۔ اظہار مدعا کے لیے سہل سبک اور صحیح الفاظ کا انتخاب اور ان کے استعمال میں کاریگری مگر بے ساختگی اور شگفتگی کے ساتھ۔ یہی اعلیٰ درجے کے مزاح کی علامتیں ہیں۔

ہر چند کہ بادۂ شاعری پر ساجد خاصا تیز پا ہے تاہم مستقبل میں اگر مزاح نگار ساجد شاعر ساجد کو دو قدم پیچھے چھوڑ گیا تو مجھے تعجب نہ ہوگا اور اپنی برادری میں اضافے کی خوشی الگ ہوگی۔

کرنل محمد خان

اعتبار ساجد سے میری رسم و راہ اس زمانے سے ہے جب ساجد کی نثر اور شاعری کا اعتبار صحیح طرح جما نہیں تھا۔ بلوچستان کی سنگلاخ پہاڑیوں سے اب یہ اسلام آباد کے خوشگوار جھونکوں کے مزے لوٹ رہے ہیں ابھی گھریلو جھنجھٹوں میں پڑے نہیں لہٰذا کتابوں کی رفتار خاصی تیز ہے۔ عنوانات رکھنے اور موضوع چننے میں انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ ہر وقت مسکراتے رہنے کی عادت کی وجہ سے پی آئی اے سٹاف سے مشابہت رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں تو اپنی اور پڑھنے والوں کی جان ایک کر دیتے ہیں۔

کارٹونسٹ جاوید اقبال

غزل میں اپنی انفرادیت پیدا کرنا اور اپنی انفرادیت سے اپنی غزل تراشنا ایک ایسا جانکاہ مگر منفرد تخلیقی مرحلہ ہے جس کا اندازہ محرمانِ رموز غزل ہی کر سکتے ہیں۔

اعتبار ساجدؔ کی غزل پر ان کی روحانی شخصیت کی چھاپ نمایاں ہے اور ان کی یہی خوبی انہیں دنیائے غزل میں زندۂ جاوید بنا دے گی۔

رئیس امروہوی

اعتبار ساجدؔ صاحب کے دو اشعار نے میرے قلب و ذہن کو بے حد متاثر کیا اور انہی اشعار سے میں ان کی بے پایاں تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکتا ہوں:

میں انیسؔ ہوں نہ دبیر ہوں نئے موسموں کا سفیر ہوں
میں امین شہر ضمیر ہوں مرے پاس کچھ ہیں امانتیں
یہ امانتیں مرے خواب ہیں مرے حرف ہیں مرے نقش ہیں
یہی پھول میرا پیام ہیں یہی خواب میری سفارتیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اعتبار ساجدؔ ان معدودے چند شعراء میں سے ایک ہیں جن کا کلام کہیں نظر آ جائے تو میں اُسے پڑھے بغیر آگے نہیں بڑھتا یہ دلکشی اور دلربائی بہت کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے ''دستک بند کواڑوں پر'' اور ''آمد'' کے بعد اعتبار ساجدؔ کا تازہ مجموعہ کلام بھی یقیناً آج کے اچھے شعری ادب میں شامل ہوگا اور پڑھنے والوں کی اکثریت اس مجموعے میں اپنے لئے کشش کا سامان پائے گی۔

قتیل شفائی

مجھے اعتبارؔ کی غزل میں بڑے امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ اور مجھے توقع ہے کہ اگر اس کی مٹی اسی طرح چاک کی گردش میں رہی تو ایک دن وہ ایک ایسے ظرف میں ڈھل جائے گا جس سے دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جایا کریں گی۔

ڈاکٹر وزیر آغا

یادیں باقی رہ جاتی ہیں

انور سدید

(●)

اردو کے معروف شاعر، مزاح نگار، کالم نویس اور دانشور اعتبار ساجد کو میں نے اتنا دیکھا نہیں جتنا پڑھا ہے۔ ہفتہ وار ''ندائے ملت'' میں وہ میرے پڑوسی ہیں۔یعنی میرا کالم ''ادب در ادب'' ہمیشہ ان کے کالم ''ہم لوگ'' کے ساتھ چھپتا ہے اور یہ جڑواں تعلق کئی سالوں سے قائم ہے۔ میں ''ندائے ملت'' کے سیاسی تجزیے بڑے شوق سے پڑھتا ہوں کیونکہ ان سے ملک کا سیاسی درجہ حرارت معلوم ہوتا رہتا ہے لیکن آپ سے کیا پردہ میں ''ندائے ملت'' میں صفحہ 45 سب سے پہلے کھولتا ہوں۔ یہاں ہر ہفتے میری ملاقات اعتبار ساجد سے ہوتی ہے جس کے کالم کے ساتھ اس کی تصویر نہیں چھپتی لیکن اس کا سراپا اس کے کالم میں پورا موجود ہوتا ہے۔کبھی وہ ''روزن سطر'' سے جھانکتا ہے اور کبھی واحد متکلم کی صورت میں کسی دوست ادیب یا ادیبہ کی خاکہ نگاری کرتا ہے۔خواتین کی حسن نگاری میں اس کا قلم خوب چلتا ہے لیکن اس آئینے سے اپنی صورت کو بھی منعکس کرتا ہے۔گزشتہ چند ہفتوں کے دوران اس نے ''ہم لوگ'' کا بیانیہ کچھ اس طرح مرتب کیا کہ مجھے اس پر ''آپ بیتی'' کا گمان ہونے لگا۔ حالانکہ اس کا بنیادی قالب (فارمیٹ) ''جگ بیتی'' کا ہے اور یہ چند قسطیں اتنی دلچسپ تھیں کہ میں نے اس کالم کی تحسین کرنے کے لیے ساجد یزدانی صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ کر لیا اور اعتبار ساجد کا نام ہی لیا تھا کہ ساجد یزدانی بولے وہ تو میرے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ان سے براہ راست بات کیجیے'' اور اس براہِ راست گفتگو میں خوش آئند خبر یہ تھی کہ ان کی یادوں کا مرقع کتاب کی صورت میں چھپ رہا ہے۔'' اب یہ کتاب میرے سامنے ہے۔عنوان ہے ''یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔''

میرا خیال تھا کہ اس دور کے مقبول کالم نگاروں کی طرح اعتبار ساجد نے بھی اس کتاب میں اپنے مطبوعہ کالم پیش کئے ہوں گے لیکن کتاب دیکھی تو حیرت ہوئی کہ یہ باضابطہ طور پر ایک تالیف لطیف ہے جس میں اعتبار ساجد نے اپنے انوکھے دلفریب اور دل نشین اسلوب میں ''یاد نگاری'' کی صنف میں اپنا پرچم اس طرح بلند کیا کہ اب اس صنف میں وہ میر کارواں بھی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔خود نوشت سوانح عمری میں بالعموم زمانی اور مکانی ترتیب کو برقرار رکھا جا سکتا ہے اور مصنف ہمیں وہ سب کچھ بتانے کی کاوش کرتا ہے جو اس پر بیت چکی ہے اور اس کے تجربات کا حاصل ہے۔فرانس کا شہرہ آفاق فلسفی ژاں ژاک روسو نے اپنی ''آپ بیتی'' لکھی تو اس نے ''ابتدائیے'' میں کہا تھا:

''میں نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا اور اس کام کی تکمیل کے بعد اس کی تقلید کرنا ممکن نہ ہوگا۔ میں اس دنیائے فانی کے سامنے ایک ایسے انسان کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو فطرت خلقی کا مظہر ہو اور وہ انسان میں خود ہوں۔ میں نے ہر وہ بات جو کہ قابل تعریف یا قابل اعتراض تھی پوری آزادی اور سچائی سے بیان کی ہے۔ نہ میں نے کوئی جرم چھپایا ہے اور نہ ہی اپنے آپ میں کسی خوبی کا اضافہ کیا ہے۔ میں جیسا تھا خود کو دوسروں پر ویسا ہی ظاہر کیا ہے کبھی حقیر، ذلیل اور کبھی بہت نیک فیاض اور (دوسروں سے) برتر۔ اگر چہ لافانی طاقت میرے پوشیدہ رازوں سے واقف ہے۔''

''آپ بیتی نگاری'' پر روسو کی یہ تحریر ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تحریر اکیسویں صدی میں پہنچی تو ہمارے عہد کے دانش ور مشفق خواجہ نے فرمایا:

''آپ بیتی لکھنے والے اپنا ذکر ایسی عقیدت اور محبت سے کرتے ہیں جیسے وہ اپنے حالات نہیں لکھ رہے بلکہ کسی خوش اعمال اور محترم ہستی کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں۔اس مقصد کے لیے اپنے شجرۂ نسب میں تبدیلی سے لے کر ہر قسم کے واقعات میں رنگ آمیزی کو جائز سمجھا جاتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں سچائی کا دعویٰ خود سچائی کا نعم البدل بن جاتا ہے۔آپ بیتی لکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اس کے لیے کسی دستاویزی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی ذاتِ فیض رساں ہی تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے۔''

''آپ بیتی'' کے برعکس یاد نگاری میں موضوع معاشرہ بنتا ہے۔ شخصیات، واقعات، حالات اور حادثات کا ذکر بھی آتا ہے لیکن مصنف کا بنیادی مقصد اپنی ذات کے آئینے سے اپنے عصر اور معاصرین کو منعکس کرنا ہوتا ہے۔ اُردو میں اس صنف کو ہرچرن چاولہ نے اپنی کتاب ''البم'' میں اور غلام الثقلین نقوی نے رسالہ ''اوراق'' میں اپنے ''رابطے'' کے مصامین میں پروان چڑھایا۔ اب اعتبار ساجد کی کتاب آئی ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ حدیثِ دیگراں ایسی جمالیات کا نقش پیش کرتی ہے جسے صرف اعتبار ساجد کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے اور اس کا قلم ہی لکھ سکتا تھا۔ یہ کتاب زمانی اور مکانی لحاظ سے کسی ترتیب کی آئینہ دار نہیں، لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اعتبار ساجد نے ایک ''داستان نگار'' کا روپ دھارا ہے اور وہ ہمیں وقت کی داستان ہی سنا رہے ہیں جو غیر مربوط ہونے کے باوجود متنی تسلسل کے اعتبار سے مربوط ہے۔بس یوں سمجھئے کہ شعور کی چکی چل رہی ہے اور اس سے یادیں باریک آٹے کی طرح پس پس کر باہر آ رہی ہیں۔ جو موضوع سامنے آتا ہے اعتبار ساجد کا قلم اس پر چل پڑتا ہے۔ یادوں کا دبستان کھل جاتا ہے۔اعتبار ساجد ذکر ملتان کا کر رہے ہیں جو گرد، گرما اور گداو گورستان کے لیے مشہور ہے۔اعتبار ساجد کا ملتان دیکھئے کتنا مختلف ہے:

''اس زمانے کے ملتان میں عرس، میلے ٹھیلے، عنایت حسین مرحوم بھٹی کا تھیٹر، سرکس کے کمالات روزینا پوڈسٹا کی فلمیں اور صوفیہ لورین کی فلمیں،

میں نے اور اقبال ارشد نے خوب دیکھیں۔ روزینا پوڈسٹا سے اقبال اور صوفیہ لورین سے بندۂ ناچیز متاثر ہوا۔ ''ہنچ بیکڈ آف نوسٹرے ڈیم'' ہم نے کوئی سات بار دیکھی۔ ساتوں بار آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے سینما ہال سے نکلے۔ اس طرح پہلا عشق صوفیہ لورین سے ہوا مگر قباحت یہ تھی کہ وہ ہالی وڈ میں تھی میں ملتان میں، وہ اپنے وقت کی مہنگی ترین سپر سٹار تھی، میں سفید پوش عاشق، ناہنجار، بہت جی تلملایا، طبیعت کسمسائی۔ پھر کوچہ گردیوں کا ایک جواز یہ بھی بنا کہ

ڈھونڈتا رہتا ہوں ہر چہرے میں تیرے خدوخال
کیسے پاؤں؟ کیسے آ سکتا ہوں تیرے پاس میں''
(صفحہ ۳۲)

اب آپ اسے اعتبار ساجد کی قناعت پرستی شمار کیجیے کہ انہوں نے ایک صوفیہ لورین ملتان میں ہی ڈھونڈ لی جس نے انہیں عشق کے رموز ونکات سے آشنا کیا۔ اور شعر میں تپش اور حدت پیدا کی۔

اب یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اعتبار ساجد نے اپنے ''عشق'' کا تذکرہ کر کے اس کتاب کو ''یادوں کی بارات'' نہیں بنایا بلکہ بنیادی بات یہ طے کر دی ہے کہ ان کا عشق صرف ادب سے ہے اور ان کی زندگی میں ادب کے جتنے کردار شعبہ تانیث سے آئے انہوں نے سب کی تعظیم کی۔ آنکھیں بند کر کے کتاب کھولی تو سامنے ایک جلی عنوان ''حصار'' تھا اور اعتبار ساجد بتا رہے تھے:

''بیگم سرفراز اقبال کا ان دنوں طوطی بول رہا تھا، کیا فیض، کیا سبط حسن، کیا ابن انشاء، کیا احمد فراز، کیا صادقین، کیا مظہر الاسلام سب کی وہ میزبان تھیں، انتہائی مہربان اور مخلص خاتون۔ ان کی سربراہی میں ہم نے ایک ادبی ثقافتی تنظیم بنائی۔ ''حصار''۔ (ص ۶۷)

اور اب شاعرہ شبنم شکیل کا تعظیمی تذکرہ:

''باجی شبنم مجھے کوئٹہ میں تدریس کے زمانے سے جانتی تھیں، جب لاہور آئیں تب بھی میں ان سے ملتا رہا۔ جب اپنے شوہر شکیل صاحب کی پوسٹنگ پر اسلام آباد آئیں تب بھی ان کے خلوص، ان کی اپنائیت اور ان کی وضعداری میں فرق نہ آیا۔ عابد علی عابد جیسے نامور نقاد اور شاعر کی بیٹی نے بطور شاعرہ خود بھی اپنا تشخص پیدا کیا۔ متعدد ایوارڈ حاصل کئے، اپنی کتابوں سے شہرت پائی اور اپنے انکسار سے بیگانوں کو اپنا بنا لیا، آپا سے میں دو ایک بار ناراض بھی ہوا لیکن بڑے باپ کی بیٹی نے ہمیشہ اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا۔'' (صفحہ ۸۸)

شاہدہ لطیف، مسرت شاہین، سعدیہ سیٹھی، آمنہ بہار، گل زیب زیبا، پروین جاوید، کشور ناہید، سائرہ غلام نبی، آمنہ الصبور، نسرین جلیل، اسلام آباد کی رخشندہ، شبہ طراز، لیلیٰ خٹک اور بے شمار خواتین کے نام اس کتاب میں گنوائے گئے ہیں اور خوبی کی بات یہ ہے کہ سب نے اعتبار ساجد کے کردار کی استقامت کو سراہا اور اعتبار ساجد نے اس کتاب میں احسان شناسی کا ثبوت دیا اور سب کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ یادنگاری کی یہ کتاب جگ بیتی سناتے سناتے آپ بیتی کے مدار میں داخل ہو جاتی ہے۔ آدھی خوبیوں اور آدھی خامیوں کے گلاس میں اعتبار ساجد ہمیشہ محسن شناسی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور شخصیت کے مثبت زاویے کو اپنے ذاتی حوالے سے پیش کر دیتے ہیں۔ سید ضمیر جعفری کا یہ ارشاد مبنی برحقیقت ہے کہ ''اعتبار ساجد اگر امورِ خارجہ کی خدمت سے وابستہ ہوتا تو وہ اتنا اچھا سفارت کار رہتا کہ اگر وہ کسی سے کہتا کہ جہنم میں جاؤ تو وہ شخص بخوشی جہنم میں چلا جاتا۔'' اس کتاب میں اعتبار ساجد نے ادبی دنیا کے سب کرداروں کو جنت کی دیوار پر بیٹھ کر دیکھا ہے اور امجد رؤف کی رائے میں ''یہ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ کینڈل لائٹ میں ڈنر کرتے ہوئے ہلکی پھلکی موسیقی سن رہے ہوں۔'' تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈنر کرنے اور موسیقی سننے کے بعد بھی ''یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔''

اعتبار ساجد کو میں ملتان کے زمانے سے جانتا ہوں، ان دنوں وہ ایک کومل سا نوجوان تھا۔ لہٰذا اپنی عمر کی مناسبت سے بڑے جذباتی قسم کے افسانے لکھتا تھا پھر اس نے خاکہ نگاری کی اور جلدی ہی وہ ملتان کے اچھے قلمکاروں میں شمار ہونے لگا۔ اس کے بعد وہ کراچی اور پھر کوئٹہ چلا گیا۔ میں لاہور آ گیا اور بیچ میں وقت اور فاصلے کی دیوار اور پھر اچانک ایک دن ملا اب وہ پروفیسر اعتبار ساجد تھا لیکن یہ پروفیسری وجہ کمال نہیں کہ اعتبار ساجد شاعر بن چکا ہے۔ عنفوانِ شباب کے کومل احساسات نے شاعر کا روپ کیسے دھارا؟ اس نے تخلیق کے کون سے ہفت خواں طے کئے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قصۂ عشق بتاں میں تاریخی شعور اور عصری آگہی کی آمیزش کیسے کی؟ ان سب کی حکایت اس کے مجموعہ کلام میں ملے گی۔ اعتبار ساجد اپنے اشعار کے تیور سے ایک منجھا ہوا تخلیق کار معلوم ہوتا ہے۔ تھوڑی مدت میں اچھے شعر کہنا اور پھر اپنی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کرا لینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں کہ سخنور زیادہ ہیں اور سخن فہم کم۔ اعتبار ساجد نے ''آمد'' سے دنیائے سخن میں اپنی آمد کا اعلان کیا ہے اس مجموعے کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بندھتی ہے کہ مستقبل میں وہ ادب کو اس سے بھی بہتر اشعار دینے میں کامیاب رہے گا۔ یہ فنی ارتقاء ہی شاعر کے وجود کا اثبات کر کے اس کی بقاء کا جواز بنتا ہے۔ اعتبار ساجد نے خود بھی تو کہا ہے:

ہے چاک کی گردش میں ابھی تک مری مٹی
اب تک مری تکمیل کی ساعت نہیں آئی

ڈاکٹر سلیم اختر

''مرے موسموں کے والی''

پروفیسر نظیر صدیقی

(•)

اعتبار ساجد دورِ حاضر کے اہلِ قلم میں بہت معروف وممتاز ہوں یا نہ ہوں وہ گمناموں اور بے نشانوں میں سے ہرگز نہیں ہیں۔ وہ پاکستان کے ادبی افق پر کوئی بیس پچیس سال پہلے ایک شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے۔ اگرچہ اس دوران میں وہ صرف شاعر نہیں رہے، مضمون نگار، افسانہ نگار، کالم نگار اور سفرنامے کے مصنف کی حیثیت سے بھی سامنے آ چکے ہیں۔ ان تمام اصناف ادب میں ان کی تصانیف موجود ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی شناخت زیادہ تر شاعر ہی کی حیثیت سے ہے اور وہ بھی غزل کے شاعر کی حیثیت سے۔ گو، انہوں نے آزاد نظم کی صنف میں نظمیں خاصی تعداد میں لکھی ہیں۔

اس وقت تک اعتبار ساجد کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں ''وہی ایک زخم گلاب سا'' بھی شامل ہے۔

اچھی کتابیں وہ ہیں جو اہلِ نظر سے گزریں اور وہ پوری غیر جانب داری کے ساتھ ان کے بارے میں موافقانہ رائے قائم کر سکیں، یعنی بقول غالب، اچھی کتابیں وہ ہیں جن پر قلم اٹھانے والے مصنف کے طرف دار نہ ہوں بلکہ سخن شناس اور سخن فہم ہوں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کتابوں کے اچھے یا برے ہونے کے معاملے میں غالب کے اس معیار یا اس کسوٹی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا ہر ادیب اور شاعر باون گز کا نظر آتا ہے حالانکہ شعر وادب میں باون گز سے کم کا نظر آنا بھی کچھ کم فخر کی بات نہ تھی لیکن چونکہ یہ دور پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا ہے جس کے ذریعے معمولی سے معمولی لکھنے والے کو ایک عظیم ادیب یا شاعر بنا دیا جاتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی ادیب یا شاعر عظیم کہلانے سے کم پر راضی نظر نہیں آتا۔

یہ بات بہت کم لکھنے والوں کی سمجھ میں آتی ہے کہ شعر وادب میں صرف اچھے ہونے کے معیار تک پہنچنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ جبکہ کسی ادیب یا شاعر کا صرف اچھا ہونا کافی نہیں۔ اس کے لیے غیر معمولی اور غیر فانی ہونے کے معیار تک پہنچنا بھی ضروری ہے۔ یعنی اسے چاہیے کہ وہ غیر معمولی اور غیر فانی ہونے کی سطح کو بھی چھو سکے۔

اعتبار ساجد یقیناً ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اُبھرے۔ ان کے ایک ہونہار یعنی ایک Promising Poet ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک اچھے شاعر اور ایک غیر معمولی شاعر کے درمیان جو فاصلہ ہے۔ ممکن ہے ان کی شاعرانہ جدوجہد انہیں کسی وقت اس منزل تک پہنچا دے۔ اگر وہ زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے تو ممکن ہے دس پانچ شعر ایسے بھی کہہ جائیں یا دو چار نظمیں ایسی بھی لکھ جائیں جنہیں غیر فانی کہا جا سکے۔ ان باتوں کا تعلق ان کے مستقبل سے ہے اور مستقبل کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ادب یا شاعری صرف زور بازو کا کام نہیں اس امتیاز یا اعزاز کے حاصل کرنے میں تقدیر کو بھی دخل ہوتا ہے۔

سرِ دست ان کی شاعری کے معاملے میں صرف یہ دیکھنا کافی ہوگا کہ وہ کس قسم کی شاعری کر رہے ہیں۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کے مسائل کیا ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے کس علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس علاقے کی عکاسی اور ترجمانی میں وہ کہاں تک کامیاب ہیں۔ ان کی شاعرانہ حساسیت انہیں حیات وکائنات کے سمجھنے میں کہاں تک مدد دے رہی ہے۔ وہ صرف سامنے کی باتیں کہہ رہے ہیں، یا فکر ووجدان کی گہرائیوں سے بھی کچھ تعلق رکھتے ہیں؟

اعتبار ساجد نے اپنی کتاب میں ''تیرا میرا کیلا روتا ہے'' کے عنوان سے ایک خیال پیش کیا ہے۔ اس علاقے کی عکاسی اور ترجمانی میں وہ کہاں تک کامیاب ہیں، ان کی شاعرانہ حساسیت انہیں حیات وکائنات کے سمجھنے میں کہاں تک مدد دے رہی ہے۔ وہ صرف سامنے کی باتیں کہہ رہے ہیں۔ یا فکر ووجدان کی گہرائیوں سے بھی کچھ تعلق رکھتے ہیں؟

اعتبار ساجد نے اپنی کتاب میں ''تیرا میرا کیلا روتا ہے'' کے عنوان سے ایک خیال انگیز اور تفکر طلب ابتدائیہ لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت عام شاعروں سے زیادہ ہے۔ زندگی اور زمانے کے تغیرات پر ان کی نظر گہری ہے۔ وہ تغیرات کو صرف محسوس ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان تغیرات کے پیدا کردہ تلاطم سے دست وگریبان بھی ہیں۔ ان کا یہ ابتدائیہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس ابتدائیے کی روشنی میں ان کی مجموعی شاعری جو انہوں نے اب تک کی ہے نہ صرف اس شاعری کا جواز سمجھ میں آ سکے گا بلکہ اس کی معنویت پورے طور پر واضح ہو سکے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اعتبار ساجد کی شاعری ناسازگار حالات کی شاعری ہے۔ اس بات پر انہیں خود بھی حیرت ہے کہ:

میں کسے سنا رہا ہوں یہ غزل محبتوں کی
کہیں آگ سازشوں کی، کہیں آنچ نفرتوں کی

O

مرا کون سا ہے موسم، مرے موسموں کے والی!
یہ بہار بے دلی کی، یہ خزاں مروتوں کی

O

میں قدیم بام ودر میں انہیں جا کے ڈھونڈتا ہوں
وہ دیار نکہتوں کے، وہ فضائیں چاہتوں کی

شاعر کو نکہتوں کے دیار اور چاہتوں کی فضا ڈھونڈنے کے لیے قدیم بام و در یعنی ماضی کی طرف کیوں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس کا ایک اہم سبب اعتبار ساجد یہ بتاتے ہیں کہ:

کوئی پاس عزیز از جان کہاں
ہمسائے کا نام و نشاں کہاں
اب میر اکیلا روتا ہے!

اعتبار ساجد کی جنگ اپنی ذات سے نہیں اپنے زمانے سے ہے جو طرح طرح کی نفسانفسی کا شکار ہے۔ ممکن ہے ان کی شاعری کا یہ مجموعہ غزلوں اور نظموں کا نہیں نوحوں اور مرثیوں کا مجموعہ معلوم ہو اور یہ نوحے اور یہ مرثیے دونوں مل کر دورِ حاضر کی ایک ایسی تاریخ مرتب کر رہے ہیں جسے پڑھتے وقت آپ بھول جائیں کہ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے کون سے ادبی انعامات جاری کیے، وہ انعامات کس طرح کے شاعروں کو ملے، ان انعامات کے دینے والوں کے پاس شاعری کی سچی پہچان تھی بھی یا نہیں۔ اب یقیناً ہم ایک ایسے دور میں آ گئے ہیں جس میں شعر کہنے والے اور لوگ ہیں مشہور ہونے والے اور لوگ اور انعام پانے والے اور لوگ۔ یہ تینوں خوبیاں ایک شخص میں کہیں نظر نہیں آ تیں۔ اس المناک صورتِ حال پر تھوڑا سا رو لینا بھی بے جا نہ ہوگا!

اعتبار ساجد کا کلام نیا ہے نیا اس اعتبار سے کہ ان کا احساس اور لہجہ نیا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے سب باخبر ہیں لیکن اعتبار ساجد نے جس زاویے سے دیکھا اور سوچا ہے وہ مختلف ہے۔ تاریخ اپنے بلند دعوؤں کے ساتھ کہاں اور کیسے دھوکہ دیتی ہے اس سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔

اعتبار ساجد کی شاعری ہر قسم کے دھوکوں کے خلاف ہے اسی لیے وہ نڈر ہے، تلخ ہے، زخمی ہے مگر اپنی بات اپنی زبان میں کہنے پر مجبور ہے یہ اس جبر کی شاعری ہے جو نئے شعراء کو جبر کے اسباب کے اظہار پر اُکساتی ہے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین

شاعری وہ جس پر اعتبار آئے جیسے کہ اعتبار ساجد کی شاعری۔ مجھے اس میں سے خلوص کی خوشبو آئی۔ یہاں شعور بھی ہے اور وجدان بھی۔ جس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ آج کل عرض کلام کی کمی ہے نہ طول کلام کی مگر حسنِ کلام ارزاں نہیں۔ اعتبار کی شاعری نئی شاعری ہے مگر اس میں نرالے پن کا شوق نہیں جھلکتا۔ افکار میں آورد اور جدت میں شدت نہیں۔ غزل میں غزلیت رچی ہوئی ہے۔ شعر دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ تجربات میں انفرادیت کی چھاپ ہے۔ اور اسی لحاظ سے نظم کے موضوعات بھی ان کے اپنے اور خاصے اچھوتے ہیں کلام کی اخلاقی رُوح توانا اور صحت مند ہے یعنی اس کی تہہ میں انسانی درد مندی کا عنصر موجود ہے۔ ہم اس وقت ایک کرداری بحران سے گزر رہے ہیں۔ ساجد کے ہاں اس حقیقت کا کربناک احساس بھی ہے وہ اپنے آپ کو رہِ لفظ میں نووارد بتاتے ہیں۔ میرا کہنا ہے کہ کاش ان کے کلام کی یہ خوبی یہ تازگی ہمیشہ برقرار رہے۔

شان الحق حقی

اعتبار میاں سے میرا تعارف ریڈیو کے رسالے ''آہنگ'' کی ادارت کے دور سے لے کر مختلف مشاعروں کی خوبصورت اور طویل نشستوں تک محیط ہے یوں ان کے اشعار پڑھنے اور سننے کی مسرت اکثر مجھے حاصل ہوتی رہی ہے لیکن قلم قبیلہ کے ایک کل پاکستان مشاعرے میں انہوں نے جو غزل سنائی اس کا ایک شعر حافظے سے محو نہیں ہوتا:

تم اپنی ذات میں خود انجمن ہو تم کو کیا غم ہے
میں تنہا ہوں، یہ ذوقِ بزم آرائی مجھے دیدو

محشر بدایونی

اعتبار ساجد کا فن اور شخصیت دونوں ہی مجھے عزیز ہیں کہ اس جوان عمری میں سوچ کی یہ وسعت اور اظہار کی یہ شدت بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اعتبار کی غزل اُردو شاعری میں ایک دلگداز اور منفرد آواز کی حیثیت سے بہت اہم ہے۔

محسن احسان

بلوچستان کے جن شعراء سے میں ذاتی طور پر متعارف اور متاثر ہوا ہوں ان میں اعتبار ساجد سر فہرست ہیں اس کی شاعری نئے آفاق اور نئے امکانات کی شاعری ہے ایک خوبصورت شاعر کے لیے جو دلکش لہجہ سب سے زیادہ موزوں ہے وہی اعتبار ساجد کا لہجہ ہے۔

خاطر غزنوی

اعتبار ساجد ایک ذہین اور کھلی آنکھوں والا شاعر ہے وہ ماحول سے پوری طرح باخبر رہ کر اپنی آ گاہی سے شعر کے قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔

امجد اسلام امجد

اعتبار ساجد کا تعلق اردو کی تخلیقی، تادیبی اور تدریسی تینوں سطح سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اُن کا تعلق برصغیر پاک و ہند کی اُس تہذیبی زندگی سے ہے جس نے اردو کی کوکھ سے یا جس نے خود اپنی کوکھ سے اردو کو جنم دیا ہے۔ واقعاتی صورت کچھ بھی ہو، اتنی بات طے ہے کہ اعتبار ساجد کی شاعری محض لفظ و بیان یا عروضی دھاگوں سے بندھی ہوئی بے رس اور بے مقصد شاعری نہیں ہے بلکہ پچھلے پچیس تیس سال میں ہماری زندگی میں جو اتھل پتھل ہوئی ہے اور فکر و نظر کے جو کٹاؤ سامنے آئے ہیں وہ ان سب کی آئینہ دار ہے۔ یہ آئینہ داری ایسی منفرد و معتبر ہے کہ اعتبار ساجد کی شاعری بہت آسانی سے اپنے ہم عصر اور ہم قدم معاصر شعراء کے ہجوم میں پہچان لی جاتی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے حد درجہ لائق تحسین اور قابل رشک بات ہے۔

فرمان فتح پوری

’’دوسسکتی ہوئی نسلوں کے عزادار‘‘

ڈاکٹر خیال امروہوی

(●)

اکثر حضرات کی سائیکی بن گئی ہے کہ وہ اپنے مدّاحوں کے سوا کسی کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے۔ اگر آپ کسی بور ادیب وشاعر سے دریافت کریں کہ اعتبار ساجد یا خیال امروہوی کو جانتے ہو تو کہے گا ہاں نام تو سنا ہے، کون ہیں کہاں رہتے ہیں؟ بس یہی علامت ایک جھوٹے ادیب وشاعر کی ہے۔ لیکن ہم تو سب کو یاد رکھتے ہیں اور اُن کا ذکر کرنا عار تصور نہیں کرتے! ہمارے یہاں یوں تو کئی ساجد گزرے ہیں لیکن راقم صرف دو ساجدین کو جانتا ہے۔ ایک اقبال ساجد جو منع کرنے کے باوجود پیتے پیتے مر گیا۔ دوسرے اعتبار ساجد جنہیں پیتے پلاتے کبھی نہیں دیکھا۔ اقبال ساجد پھٹی شیروانی میلے پائجامہ میں پھرا کرتا تھا لیکن جھوٹ کو کبھی سچ نہیں کہا۔ ہم اور اعتبار ساجد کافی عرصہ لاہور میں ساتھ رہے۔ سچی شاعری کرتے تھے اور جھوٹے لوگوں سے بدکتے تھے۔ کافی ہاؤس۔ پاک ٹی ہاؤس میں سرکاری درباری اور دانشوروں کا ہجوم رہتا تھا جنہیں خفیہ ایجنسیوں سے ترقی پسند شاعروں اور لکھاریوں کی روزانہ رپورٹ فراہم کرنے کا الاؤنس ملتا تھا۔ یہ سب لوگ کافی خوشحال، چائے انڈیلتے اور سگریٹ کے دھوئیں اڑاتے پاکستان زندہ باد نئی روشنی مردہ باد کہنے میں مصروف دکھائی دیتے۔ اس کے بعد اعتبار ساجد پھر نظر نہ آیا۔ ایک بار غالباً ۱۹۹۲ء میں اچانک پاک ٹی ہاؤس میں ہی ملاقات ہوئی۔ مل کر بہت چہچا، تڑپا پرانی یادوں کے انبار لگ گئے۔ پھر ماہنامہ سپوتنک ۱۹۹۶ء میں اعتبار ساجد اپنے فن اور شخصیت کے ساتھ سامنے آیا۔ ماہنامہ سپوتنک کمال کا جریدہ ہے۔ صرف بیس روپے میں بڑی بڑی شخصیتوں کو ملا دیتا ہے۔ یہ کارنامہ آغا امیر حسین ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ سفید ہاتھی وہ کس طرح پالتے ہیں اس کا راز وہی جانتے ہیں۔ بہرحال سپوتنک فروری ۱۹۹۶ء میں اعتبار ساجد کا کلام گہری نظر سے پڑھنے کا موقع ملا۔ اُن کے کلام کی سچائی اتنی ہی واضح، شفاف اور بلوریں ہے جتنی پاکستان کی سرمایہ داری یا اس کے مقابل غربت اور ناداری۔

جب ہم ۱۹۴۷ء سے پہلے حیدر آباد دکن میں تھے تو ہمیں علم ہی نہ تھا کہ اس ریاست کے علاوہ زمین پر ایسے خطے بھی ہیں جہاں ظالم اور مظلوم کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ غربت وافلاس کے جو مناظر ۱۹۴۷ء کے بعد نظر آئے، وہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ یوں تو جب سے دنیا اسرا بدی ہابیل قابیل ایک دوسرے کو مارتے رہے، انسانی تمدن میں غار والی زندگی سے لے کر میزائل اور خلائی پروازوں تک انسانی تہذیب کبھی یکساں نہیں رہی۔ ہزاروں نظریے پیدا ہوئے لاکھوں مصلحتیں، دانشور، شعراء غرضیکہ سبھی مکاتب فکر نے جنم لیا لیکن انسانی جبلتیں نہ بدل سکیں۔ اعتبار ساجد نے ان سب موضوعات کو ایسی فنکاری سے بیان کیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

دنیا میں انسانی سوچ کے دو تین موضوعات ہی ایسے ہیں جن پر انسان نے ہمیشہ دھیان دیا۔ (۱) خدا (۲) کائنات (۳) اور انسان۔ انسان سب سے بڑا موضوع ہے۔ انسان نے خدا تراش لیا لیکن انسان تا حال نہ خود بن سکا نہ دوسرے کو بنا سکا۔ انہیں موضوعات پر علم وفلسفہ اور ادبیات عالم گھومتی رہی ہیں۔ اور جب تک کرۂ ارض پر انسانی تمدن موجود ہے انسان کے لیے خود انسان سب سے اہم اور ناقابل گرفت موضوع بنا رہے گا۔

اعتبار ساجد کی شاعری کو کرسٹل پوئٹری ’’شفاف شاعری‘‘ کہنے سے مراد یہ ہے کہ ساجد کے فکری آئینے میں انسانی تمدن اور اس کی بوقلمونیوں، نیرنگیوں کا جو عکس پڑتا ہے اس میں کسی مقام پر دھندلاہٹ نظر نہیں آتی۔ راقم نے بھی آٹھ دس ہزار شعر کہے ہیں لیکن فارسی تراکیب سے نجات نہ مل سکی جبکہ اعتبار ساجد کے یہاں تمدنی مشاہدہ، تراکیب واصطلاحات کا مرہون نہیں ہے بلکہ واضح ہے۔ اعتبار ساجد کے مزاج میں دو مختلف عوامل کارفرما ہیں جہاں وہ نثر میں فکاہیت کے حوالے سے قاری کو موضوع کی سنجیدگی، فکر وجستجو کی طرف مائل کرنے کا فن جانتے ہیں، شاعری میں ان کی ’’فکری انانیت‘‘ ’’موجودہ نظام کا ’’پوسٹ مارٹم‘‘ کرنے میں اہم کردار سر انجام دیتی ہے۔ فنون لطیفہ میں حقیقت اور سچائی ناگزیر ہیں۔ شاعری ان فنون میں اس لیے فوقیت رکھتی ہے کہ اس میں تمام فنون شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بالغ نظر شاعر اپنی غزل یا نظم میں بیک وقت موسیقیت، پیکر تراشی، منظر نگاری چند لفظوں میں سمو کر رکھ دیتا ہے۔ جبکہ مصوری اور مجسمہ طرازی میں یہ بات نہیں ہے۔ اعتبار ساجد کی شاعری میں ہمیں جو نیا پن محسوس ہوتا ہے وہ محض اُن کے علم یا شاعرانہ وجدان کا ہی نتیجہ نہیں بلکہ مشاہدات سے بھی ہے۔ یوں تو ہر ’’انسان‘‘ مشاہدہ کرتا ہے منطقی نتائج بھی برآمد کر لیتا ہے لیکن شاعر مشاہدات کو لفظوں کی وساطت سے ’’بڑے کینوس‘‘ پر دکھا دیتا ہے۔ اعتبار ساجد کے یہاں موجودہ صدی کے دو حصوں کا احساس ہوتا ہے۔ ایک حصہ وہ جو ہمارے اسلاف کی زندگی سے متعلق تھا، دوسرا حصہ وہ جسے ’’عصر ناخلف‘‘ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ساجد نے ۴۷ء کے بعد کی تمام تر تمدنی بدمعاشیوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ بلکہ ہم میں سے اکثر اسی دور کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتیں مختلف مبہم اور موہوم لفظی لیباٹریوں میں ضائع نہیں کیں بلکہ معاشرتی مشاہدات سے براہ راست تعلق قائم رکھا۔ نہ خود غلط سوچا نہ دوسرے کو غلط سوچ کی اجازت دی۔ سچی سوچ وہی ہے جس میں مصلحت کی کھوٹ نہ ہو نہ فکر میں، نہ کردار میں۔ لفظوں کو بے معنی فکر وتفہیم کے لیے استعمال کرتے رہنا بددیانتی کے مترادف ہے۔ ساجد کے کلام میں ایسی قباحتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ ان کے یہاں جن موضوعات کی فراوانی ہے وہ ترقی پسند فکر کی ترجمان ہے۔ کیونکہ ’’مارکسی تنقید‘‘ کی بنیاد میں یہ ہے کہ سماجی تضادات کا جدلی تجزیہ کیا جائے! ہمارے یہاں ویسے بھی اس کثرت سے ناہمواریاں موجود ہیں جن پر اظہار خیال یا تنقید ’’مارکسی تنقید‘‘ ہی کا ایک جزوی حصہ بن جاتی ہے تو ہمیں حیرت یہ ہے کہ پاکستان جیسا تضادات سے بھرپور

ملک بھی اب تک ''سوشلزم'' کو قریب نہ لا سکا؟ جبکہ عالمی سیاست میں پاکستان جیسے حالات بھی پیدا ہوئے اور ریڈیکل انقلاب کے ذریعے متوازن بھی بنا لیے گئے، انقلاب روس سے لے کر چین، لیبیا، ایران اور دیگر ممالک اس کی واضح مثال ہیں۔ ادبی مزاحمتی محاذ پر جب ایران کی پروین اعتصامی، ابوالقاسم لاہوتی، عشقی یا ایرج مرزا پر نظر پڑتی ہے اور ان کی انقلابیت کے لیے ''عوامی پذیرائی'' اور حکومت کی گرفت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو زندہ اور مردہ قوموں کا فرق نظر آتا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں تنقیدی اور تجزیاتی شاعری کا کوئی انقلابی اثر نظر نہیں آتا۔ گویا ہم سب اس قدر مردہ ہو چکے ہیں کہ کسی بھی بات پر نہ حکومت چونکتی ہے نہ عوام پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے داخلیت پسند ادیب اور شاعروں کا مزاحمتی ادب کے بارے میں یہ خیال قابل غور ہے (بقول ان کے) کہ شاعری سے سماجی انقلاب نہیں آیا کرتا بلکہ شاعری داخلی مسئلہ ہے۔ انقلاب سنگینوں کے ذریعے لایا جاتا ہے۔ لیکن عالمی ادبی تناظر میں جب ہم ان تمام ریڈیکل شعراء، ادیبوں اور صحافیوں کو دیکھتے ہیں جنکی تحریروں سے انقلاب رونما ہوا تو مثالیت پسندوں کی رائے غلط معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح فیضؔ، ندیمؔ او رجالبؔ سے نوجوان نسل نے فکری حرارت حاصل کی، اسی طرح اقبال ساجدؔ ہو یا اعتبار ساجدؔ یہ بھی اسی کارواں کا اہم حصہ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے عہد، اسالیب زبان و بیان، اظہاریت اور ابلاغ کی وساطت سے روشن خیالی، حقیقت پسندی کی راہ ہموار کی اور بنیاد پرستی کی مخالفت میں نہ صرف مستقل اور مستحکم محاذ قائم کیے بلکہ اپنی زندگی کی تمام تر رعنائیاں انسانی ارتقا کے لیے وقف کر دیں!

اعتبار ساجد کے مجموعہ کلام پذیرائی کو پڑھ کر جہاں اس ''عہد ناپذیرائی'' کی تمام تر وجوہ سامنے آ جاتی ہیں اسی طرح انکی نثر نگاری بھی کئی رنگوں سے مزین قوس قزح کی طرح پھیلاؤ رکھتی ہے۔ نثر کی جدید اصناف جن میں ظرافت طنز، فکاہیت وغیرہ شامل ہیں ان تمام خصوصیات کا کسی ایک فرد سے مطالبہ زیادہ درست بات بھی نہیں، نثر نگاری میں لکھاری کے اپنے مخصوص مزاج کا دخل ہوتا ہے۔ ظرافت یا سنجیدگی مزاج کی داخلی کیفیات سے عبارت ہیں۔ طنز یا مزاح اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب لکھنے والا دانش کی جان لیوا راہگذر، کیفیات سے مرحلہ وار گزرتا رہتا ہے۔ مجازیت حقیقت کا روپ دہار لیتی ہے۔ متواتر انسانی حماقتیں دانائی سے متعارف کراتی ہیں۔ وسعتیں مختصر اور طوالت موخر بن جاتی ہیں۔ جملے لفظوں میں اور لفظ حروف اور حروف نقاط میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ فکاہیت میں بھی پھکڑ پن نہیں ہوتا بلکہ فکاہیت قاری کو موضوع کی اہمیت سمجھنے اور اُسے قابل عمل بنانے کی طرف راغب کرتی ہے یا پھر فکاہیت ہر اُس عیب یا برائی کا سدّ باب چاہتی ہے جسے سماج اچھائی سمجھنے لگتا ہے۔

اعتبار ساجد کی نثر پڑھ کر طویل جملوں کا احساس تو ہوتا ہے لیکن اختتامی جملہ پر نتیجہ خیزی خاصی غمگین، عبرت انگیز یا پھر انبساط آفریں ہو جاتی ہے۔ ان کے ''خطوط'' جو انشائیے کی حیثیت سے بھی دیکھے جا سکتے ہیں انہیں پڑھ کر آدمی خاصی دیر زعفران زار یا پھر دیوار قہقہہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ یہی ان کی شخصیت، تشخص اور نثر پر ادیبانہ گرفت کی علامت ہے۔ یوں تو ہر بوڑھے میں ایک کھلنڈرا بچہ چھپا ہوتا ہے لیکن اعتبار ساجد کا یہ بچہ پاگل کھلنڈرا نہیں بلکہ نہایت مشاّق، شاطر بچہ ہے جو بوڑھے زمانے اور عجوزہ بڑھیا کے کان کتر لیتا ہے۔ گویا موجودہ کھڑپینچ، لفنگی دنیا کے لیے اعتبار ساجد جیسا شریف نبض شناس اور استاد ''گوش ہال'' ہی لازم ہے جو وقتاً فوقتاً لنڈورے عوامی نمائندوں، جیب کترے تاجروں مجہول متشاعروں، بلیک میلر طرز زرد صحافیوں اور جھوٹے ادبی اداروں کے لحیم و شحیم گاؤزباں قلمکاروں کی کھال کھینچ سکے کیونکہ اعتبار ساجد ان ہی جیسے افراد کے معاشرے میں تو رہتا ہے۔ لیکن اعتبار ساجد میں بجز اس کی ذات کوئی اور نہیں رہتا۔ اسی (Self) کی عینک سے وہ دیکھتا ہے اور اسی کی وساطت سے سوچتا ہے اور اپنی سچی، کھری بے غرض سوچ کی مدد سے لکھتا بھی ہے!

اعتبار ساجد کی شاعری بالخصوص غزل میں ان کا انسانی نقطۂ نظر واضح بلکہ غیر طبقاتی ہے۔ طبقاتی تضادات اور منافرتوں کے خارزار میں اعتبار ساجد نے ایک ایسے چمن زار کی بشارتیں دی ہیں جو فی الحال خواب و خیال سہی لیکن خواب کی تعبیر نہایت درخشندہ اور اُمید افزا ہے۔ بقول ساجد:

گلشن عصر میں ہم خاک بسر اہل جُنوں
سوچ کا پھُول بنے، حرف کی مہکار ہوئے
ہم نے لفظوں کے سلگتے ہوئے صحرا چھانے
سایہ زر میں وہ راحت کے طلبگار ہوئے
تم نے ہنستے ہوئے قریوں میں گزارے دن رات
ہم سسکتی ہوئی نسلوں کے عزادار ہوئے

اعتبار ساجد کی غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ''کلاسیک زدہ'' رطب و یابس اور مسلم الفاظ و تراکیب کو ترک کرتے ہوئے نہایت والہانہ انداز میں اظہاریت اور ابلاغ کو فروغ دیا ہے۔ ان کے یہاں عجز بیان، تعقید، غرابت، قوافی سے کھینچ تان کی کوئی مثال نہیں ملتی ہر چندان کے شعر کی زبان روایتی ہے اور ہونی بھی چاہیے لیکن موضوعات معروضی اور انقلابی ہیں۔ اردو کی روایتی روش کے ناقدین شاید انکار نہ کرسکیں کہ عہد حاضر کی ''غیر روایتی'' مبہم تُگ بندی نے اردو کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچایا۔ اگر شاعری محض شاعر تک ہی محدود ہونے کا نام ہے تو اُسے دوسروں تک پہنچانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ قاری یا سامع علامتی زبان سے کہیں زیادہ صاف ستھری، شگفتہ سمجھ میں آنے والی زبان کا خواہش مند رہتا ہے۔ ہم جنہیں اعلیٰ ادبی جرائد کہتے ہیں ان کی نسبت ڈائجسٹوں کی مانگ لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا کہ تعلیم اور ادبی تفہیم کی کمی ہے یہ بات بہت حد تک معقول سہی لیکن اردو کو عربی بنا دینا یا شاعری کو چلیستاں بنانے کا بھی تو کوئی جواز ہونا چاہیے؟ جوشؔ کے مرثیے کتنے ہی بلند پایہ اور انقلابی سہی لیکن ان کے کسی بند سے میر انیسؔ جیسا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح انیسؔ کے مقابل جب دبیرؔ کی بلاغت کا تقابل کیا جائے تو جو فصاحت اور دردمندی انیسؔ کی آسان اور سریع

تفہیم زبان سے مترشح ہے اس کا پاسنگ بھی دبیر کے یہاں نہیں ہے۔

اعتبار ساجد نے شستہ و رفتہ بلکہ شگفتہ انداز میں معروضی تقاضوں کا جس طرح احاطہ کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے:

پہلے غم فرقت کے یہ تیور تو نہیں تھے
رگ رگ میں اُترتی ہوئی تنہائی تو اب ہے
کیا جانے مہکتی ہوئی صبحوں میں کوئی دل
شاموں میں کسی درد کی رعنائی تو اب ہے
صف بستہ ہیں ہر موڑ پہ کچھ سنگ بکف لوگ
اے زخم ہنر، لطفِ پذیرائی تو اب ہے

عصر حاضر کی شکایت کسے نہیں، لیکن اس شکوہ وشکایت کے ازالے کے لیے بطور مجموعی کوئی کام کرنے کو تیار نہیں حتی کہ اپنی ذات اپنے محلے اور شہر میں بھی تبدیلی کے لیے نہ حکومتوں نے کچھ کام کیا نہ عوام نے کیا۔ جدید ادب میں بھی اقدار کی موت، عدم مساوات کا شکوہ کہیں کہیں ''ناسٹلجیا'' کی حد تک اپنے حال و مستقبل سے دوری اور ماضی پہ رشک باری نظر آتی ہے لیکن سماجی انقلاب کے لیے بجز چند شعراء اور ادبا انقلاب کی صدا بلند نہیں کی گئی۔ فیض، جالب اور ظہیر کاشمیری نے تو کچھ کام بھی کیا کچھ ادیبوں اور صحافیوں نے صور انقلاب پھونکنے کی کوشش کی لیکن سبھی عہد حاضر کے کمرشل ازم کے سیلاب میں بہہ گئے۔ اعتبار ساجد نے بھی ایک بڑی کُل (Total) کا جز ہونے کے ناطے انہیں باتوں کو بڑی شدت سے محسوس کیا جو موجودہ ادبی موضوعات کا حصہ بن گئی ہیں لیکن انہوں نے انتہائی دلگداز اور توجہ طلب موضوعات کو سبھی بھاری فلسفیانہ تفہیمات و ترغیبات کی صورت میں نہیں لیا بلکہ متغزلانہ اور شگفتہ انداز میں اپنا لہرا اونچا کرنے کی کوشش کی:

جو ہوتے خادمِ خسرو تو کتنے کام کے ہوتے
ہمیں تو انتخاب پیشۂ فرہاد لے بیٹھا
یہ بونے کب کسی قامت کا حق تسلیم کرتے ہیں
میں کن لوگوں میں یہ رنجِ قدِ شمشاد لے بیٹھا

گویا اعتبار ساجد کو بھی موجودہ سماجی تضادات کا پورا اندازہ ہے لیکن وہ نہایت سلیقے اور طنز آمیز انداز میں اپنے قاری اور سامع کو انحطاط پذیر اقدار کی طرف متوجہ کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اور یہی کسی بھی ہوشمند، بالغ نظر اور انقلاب پسند فنکار کی خصوصیت بھی ہے۔

یوں تو حقیقت کی تلاش اور سچی قدروں کی جستجو سقراط سے ذوالفقار علی بھٹو شہید تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن حقیقت **Reality** اور سچائی کا حصول سبھی کے لیے مسئلہ بنا رہا ہے یہاں تک کہ کاسہ زہر لب اور دار و صلیب تک بھی لوگ پہنچ گئے لیکن سچائی حاصل نہ ہوسکی۔ اگر کبھی کبھار اس کی کوئی کرن نظر بھی آئی تو کذب وبطل کے ابر نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا۔ مصلحتوں کی ہواؤں نے تباہ و برباد کردیا۔ یہ عمل ازل سے جاری ہے اور رہے گا۔ ساتھ ہی حق پسندی میں بھی کبھی کمی نہیں آئی، قافلے رواں دواں رہے۔ اُمیدوں کے چراغ جلتے بجھتے رہے، آج بھی یہی عمل جاری ہے۔

بہرحال اعتبار ساجد کا دم غنیمت ہے کہ وہ ہجوم ناکساں اور عہد ناپرفساں میں نہایت ثابت قدمی کے ساتھ نظم ونثر میں اپنے منفرد انداز بیان کے ساتھ طبقاتی جنگ کرنے میں مصروف ہیں۔ اور ان کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ معاشرتی حقائق کو خود بھی سمجھیں، پڑھیں اور نہایت واضح، شفاف، شگفتہ اور ڈھلی ہوئی زبان میں انہیں قاری تک پہنچا دیں۔ اس طرح وہ بیک وقت انسانی تمدن کے قدیم و جدید موضوعات سے اپنی آ گاہی کا ثبوت بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ فلسفہ عمرانیات انسانی نفسیات، طبقاتی تضادات سے پیدا ہونے والے نتائج، سیاسی نیرنگیوں، بوقلمونیوں اور جہل آمیز علمی حماقتوں سے واقفیت کا عملی مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اعتبار ساجد نے بہت کم وقت میں ادبی اصناف میں اپنی قادرالکلامی اور پختہ روی کا ثبوت دیا ہے بقول ساجد صاحب:

ہم نے بھی سر کیا ہے سکوتِ شبِ اجل
اس معرکے میں ایک علمدار ہم بھی تھے
بالشتیوں سے خوف نہ کھانے کے جُرم میں
اُوجِ صلیب و دار کے حقدار ہم بھی تھے

اعتبار ساجد کے فن کو میں نے شعر اور نثر دونوں میں بڑا معتبر پایا ہے۔ شعر میں اعتبار ساجد کو کلام پر قدرت ہے وہ بے نام اور موہوم جذبوں کو بھی الفاظ کی خلعت پہنا کر ڈی ڈیلوپ کر کے ہمارے سامنے ان کی تصویریں ان کے حقیقی رنگوں میں پیش کرتا ہے اس کے کلام میں اس کے فن کی مشّاقی نمایاں ہے۔

اعتبار ساجد میں ایک اور بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی ہے کہ وہ جس طرح سوچتا ہے اسی طرح بات کرتا ہے، اسی طرح لکھ لیتا ہے یہ بڑا مشکل کام ہے۔ بعض لوگ جس طرح بات کرتے ہیں اس طرح لکھ نہیں سکتے۔ اور بعض جس طرح سوچتے ہیں بعینہٖ اس کا اظہار نہیں کرسکتے۔ لیکن اعتبار ساجد کی باتیں جس طرح مخلصانہ ہیں اسی طرح اس کا فن بھی خالص اثر انگیز اور شگفتہ ہے۔ میں جب بھی اس کی کوئی تخلیق پڑھتا ہوں تو اس کا چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کی کینٹین ہے سبزے پر دھوپ کا روشن فرش بچھا ہے۔ پیالیوں میں سے چائے کی خوشبو اڑ رہی ہے اور اعتبار ساجد خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ دل میں اتر جانے والی شگفتہ باتیں کر رہا ہے میری دعا ہے کہ اعتبار ساجد کی یہ دل میں اتر جانیوالی باتیں ہمیشہ شگفتہ و پُر بہار رہیں اور ہمیں اس کی تخلیقات پڑھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا رہے۔ آمین

اے حمید

''قرض خواہانِ وفا''

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

ناقدین غزل کے اندیشے اور واہمے سراسر غلط ثابت ہوئے کہ غزل کا مستقبل تاریک ہے۔اسے وحشی صنف سخن کہا گیا،صرف اظہار محبت کا وسیلہ قرار دیا گیا،بعض نے قافیہ پیمائی یا خیال آرائی تصور کیا،کلیم الدین احمد ہوں یا حضرت جوش ملیح آبادی ہوں، بات اتنی سی ہے کہ غزل ایک ایسی کشت سرسبز شاداب یا ایسی بہار بے خزاں ہے جسے اندیشۂ زوال نہیں، وقت گزرنے پر اس کی شادابی اور دلربائی و زیبائی میں برابر اضافہ دیکھنے میں آیا۔غزل کا ماضی تابناک، حال اور مستقبل درخشاں و تابناک ہے۔غزل اپنے ارتقائی سفر میں بے سروسامان نہیں۔غزل گو کی مثال ایک ایسے راہ رو کی سی ہے جو ابتدا میں صرف ظاہر کی آنکھ سے دیکھتا رہا۔اسے جلوہ ہائے صدرنگ میں ایک ہی نظارہ حیرانی میں مبتلا کرتا ہے، اسے جو چیز اچھی لگتی ہے اس کا ظاہری حسن تھا،ابھی غزل اتنی ثروت مند نہیں تھی کہ یہ دور تمام ہوا۔اسی زمانے میں فکر پیما قوتِ ادارک نے نیا منظر نامہ پیش کیا۔نئے امکان اور نئے آفاق سامنے آئے،غزل کا دامن نئے خیالات اور نئے مضامین سے بھرا پُرا دکھائی دیا مگر یہ سفر عہدِ غلامی کے سائے میں اپنی منزل گم گشتہ کی تلاش میں جاری تھا۔غزل میں دردمندی اور نئی سوچ کا صبح آزادی کی جانب اشارہ تھا۔ فکر غالب سے فکر اقبال تک غزل کا لب ولہجہ رجائی ہونا بھی ایک معجزہ تھا۔خواب ناک ماحول کا طلسم ٹوٹا اور غزل میں اظہار کا قرینہ وہ نہ رہا جو پہلے تھا۔آزادی کے حصول کا مرحلہ غزل کی نئی آزمائش تھی لیکن یہی آزمائش غزل کے تابناک مستقبل کا نشان امتیاز بن گئی، انسان کی انسان کے خلاف وحشت اور بربریت نے شب گزیدہ سحر جیسے مضمون سے ہمیں متعارف کیا اور شاخوں پر جلے ہوئے بسیرے فصل گُل کا سراغ دینے لگے۔غزل ایک بار پھر نئے سفر پر نکلی،روایتی مضامین کی تہمت سے چھٹکارا نصیب ہوا اور اب وہ اپنے درخشاں مستقبل کا مژدہ جاں فزا سنا کر غزل مخالف عناصر کی بیخ کنی کا اعلان کر رہی ہے۔

اس تمہید کا مقصود یہی ہے کہ عہد موجود میں ہم کاروان غزل میں شامل شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کو ایک طرف کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کریں کہ اعتبار ساجد جیسا کہنہ مشق منفرد اور نئے لہجے کے حسین امتزاج کا نمائندہ غزل گو شاعر جب یہ کہتا سنائی دے ''مجھے کوئی شام ادھار دو'' تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ابتدا سے اب تک اس کا تخلیقی ہنر کس نہج پر قائم ہے دراصل اعتبار ساجد کی ژرف بین اور چشم دل کشا نظران زمینی حقائق پر جا پڑی ہے جو ہمارے معاشرے میں عدل وانصاف کی میزان کو زیر وزبر کرنے کا سبب بنے ہیں۔وہ اس مقام پر استادہ دور افق کی طرف دیکھتا ہے جہاں ماضی میں اس کے اسلاف کا طرز حیات کتاب حکمت کی مثال تھا اور دوسری طرف غلامانہ ذہنیت کا علمی مظاہرہ کرنے والے تھے جو سات سمندر پار سے آئے ہوئے سفید فام نام نہاد آقاؤں کے سامنے دست بستہ کھڑے دیکھے گئے۔آج صورت احوال مختلف ہے کہ وہی مسندِ اقتدار پر براجمان ہیں اور دوسری طرف عہد رفتہ ڈھونڈنے والے ویرانی میں رہتے ہیں جنہیں عزتِ نفس عزیز ہے۔غزل میں یہ فکری اندازِ نظر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب استحصال پسند طبقہ غالب آجاتا ہے۔اعتبار ساجد کا یہ کہنا بجا ہے:

ترے اجداد جب گوروں کی بگھی کھینچتے تھے
مرے گوشہ نشیں اسلاف تسبیح پھیرتے تھے

ہمارے جیسے ہی کچھ سوختہ دل، جاں تپیدہ
کھنڈر میں جا کے اپنا عہد رفتہ ڈھونڈتے تھے

آدمی کسی بھی شعبے کو اختیار کرے دل میں یہی ملال رہتا ہے کہ اس کام کے بجائے کچھ اور کیا ہوتا، زندگی مختصر ہے اور گزرتی جارہی ہے۔غزل میں عشق پیشہ لوگ در آئے تو وہی رام کہانی چھیڑی،لب ورخسار اور محبوب کا سراپا لیکن اعتبار ساجد نے زندگی جس ڈھب سے گزاری اور جو تلخ وشیریں تجربے اور مشاہدے پیش نظر رہے انہیں پیرایۂ اظہار اور غزل کی زبان دے کر امر کر دیا۔غزل میں یہ تجربے سمونا اور غزل کی نزاکت کا لحاظ رکھنا آسان نہیں لیکن اعتبار ساجد بخیر وخوبی یہ مراحل طے کرتا گیا چنانچہ امتزاج جیسے شعری مجموعے میں دوسرے مجموعوں کی نسبت یہ کار ہنر آزمانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔مجموعی طور پر وہ تغزل یا رسیلے پن سے بے نیاز رہ کر بھی قاری کو چونکانے اور ہمنوا بنانے میں اپنے فن سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں، اسے اپنا زاویہ نظر اور اپنی فکر باثمر عزیز ہے،اسے شاعری میں کوہ بے ستون پر تیشۂ کرب سے کام لینا آتا ہے:

پرانا صوفہ ہوں گویا اٹھا کے لے جاؤ
سوائے میرے مرے گھر میں فالتو کیا ہے

ہمارے جیسا عجب کون شخص ہے ساجدؔ
جو گھر میں رہ کے بھی موجود اپنے گھر میں نہ ہو

قصیدہ گو، نہ مصاحب، نہ چوب دار تھے ہم
ہر عہد جبر میں اک مرثیہ نگار تھے ہم

جو ہوتے تاجر و زرگر تو کتنے کام کے ہوتے
ہمیں تو انتخاب پیشہ فرہاد لے بیٹھا

اعتبار ساجد اول و آخر غزل کا آدمی ہے۔اسے غزل میں اپنی

انفرادیت بحال رکھنے کا جنون ہے۔تمام شعری مجموعوں میں یہ التزام رکھا ہے کہ نام عام نہ ہو، وہ دوحرفی ہو یا چہار حرفی ایک مصرعے کا ٹکڑا ہو یا صرف یک حرفی مگر قاری کی آنکھ میں کھُب جائے اور دل میں ترازو ہو جائے مثلاً دستک بند کواڑوں پر، پورے چاند کی رات، مجھے کوئی شام ادھار دو، محبت ہو تو ایسی ہو، ایک عشق ضروری ہے، مجھے اس قدر نہ چاہو، یہ تنہائی مجھے دے دو، بات مگر اظہار کی ہے اور پیش نظر شعری مجموعہ امتزاج ہے جو قلات پبلشرز کوئٹہ نے شائع کیا۔اعتبار ساجد نے اس خطۂ زمین کی خاک چھانی، شعبہ تعلیم اختیار کیا بہت سے مقامی لوگوں سے راہ ورسم پیدا کی، ''دستک بند کواڑوں پر'' اسی ادارے سے شائع کی۔اعتبار ساجد کی پی آر شپ کے سبھی احباب معترف ہیں۔امتزاج میں غزل کا معیار ہمعصر شعراء کے معیار سے کسی صورت کم نہیں البتہ ان غزلوں میں عمومی رویے سے اجتناب برتا گیا۔وہ عصر حاضر کی غزل میں اپنی شناخت الگ دیکھنا پسند کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے لہجے میں کرب آگہی کو نمایاں کرنا ضروری سمجھتا ہے، وہ معاشرے کے منفی رجحان کی تکذیب کرتے ہوئے اپنے کردار کے خدوخال سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔وہ اپنا انداز عمل اور زندگی کرنے کا طریق جداگانہ دیکھنا چاہتا ہے اور یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ نام نہاد شیخ حرم سے کسی رعایت کا طلبگار نہیں، ظاہر ہے کہ ایسا رویہ اختیار کرتے ہوئے عذاب جاں کئی بھی سہنا پڑتا ہے۔غزل میں نفس مضمون اور انداز اظہار میں ندرت فکر کا امتزاج قاری کو نئی سوچ مرحمت کرتا ہے:

دریدہ پیرہنی میں ترے فقیروں نے
سلامتی نہیں مانگی کبھی قباؤں سے

بھگت رہا ہوں میں ساؔجد یہ کس کئے کی سزا
یہ قید جسم ہے پاداش کن خطاؤں کی

بٹھائے تخت پہ یا خاروخس میں گم کردے
خدا کے بعد یہ خلق خدا کی مرضی ہے

نہ تاجِ سر ہے نہ زر ہے نیازمندوں کا
عجیب رخت سفر ہے نیاز مندوں کا

اعتبار ساجد غزل کہتے ہوئے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات، حادثات اور معاملات کا اپنے انداز میں اور اپنے زاویہ نظر سے مشاہدہ کر کے کچھ نتائج ترتیب دیتا ہے جو درست بھی نکلے اور غزل میں امکانات کی فراوانی اور نت نئے مضامین کی ارزانی نے کشت غزل کو سرسبز وشاداب بنادیا ہے، غزل میں ایمائیت اور نت نئے استعارے اور علامات کی بدولت لفظ کی قدروقیمت کا ادراک حاصل ہوتا ہے وہ کسی لفظ کو برتنے سے پہلے ایک جوہری کی طرح آنکنا اور جانچنا جانتا ہے، وہ کچھ کہنے سے پہلے غزل کے مجموعی تاثر اور موڈ کی ہم آہنگی سے آگہی حاصل کرتا ہے۔وہ جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے نفس مضمون کا ابلاغ چاہتا ہے خواہ وہ استعارہ قاری کو مطمئن کرے یا وہ اختلاف نظر رکھتے ہوئے گزر جائے مثلاً:

پرنداب کے نہ چہکے، رہے شجر چپ چاپ
بہار آ کے چلی بھی گئی مگر چپ چاپ

اجاڑ کنج خزاں میں بہار کا شاعر
تلاش کرتا رہا تتلیوں کے پر چپ چاپ

کسی دل پہ زخم ہیں سینکڑوں کس دل میں رنج ہزار ہیں
یہاں اپنے اپنے ہیں مقبرے یہاں اپنے اپنے مزار ہیں

میں چراغ بیچ کے کیا کروں انہیں کون لینے کو آئے گا
ابھی آندھیاں ہیں عروج پر ابھی شہر زیرِ غبار ہیں

ابتداء سے شعروادب کے دلدادہ اپنی بنیادی ضرورتوں اور سہولتوں سے محروم رہ جانے کا شکوہ کرتے چلے آئے ہیں لیکن یہی محرومی غزل میں دردمندی اور حرماں نصیبی کے نتیجے میں پُرتاثیر حرفِ سخن بُنا کرتی ہے جیسے میر تقی میؔر کے ہاں اور ہمارے عہد میں ناصر کاظمی اور اقبال ساجد کی غزل میں یہ احساس محرومی اپنے اپنے انداز میں کم وبیش ظاہر ہو کر رہا۔اعتبار ساجد کے وسائل مناسب رہے لیکن ضروریات زندگی بڑھتی رہیں۔وہ اپنے سر پر اپنی چھت سے محروم ہے دوسری طرف یہ شکایت ہے کہ زمانہ قدرناشناس ہے وہ ظروف ساز یا مغنّی ہو، ادیب یا سنگ تراش ہو کوئی ان قیمتی موتیوں جیسے فنکاروں سے سروکار نہیں رکھتا۔شاعر کی قدر ومنزلت تہذیبی رویوں کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔یہاں سطحی انداز نظر عام ہے جس کے باعث شعرخوانی کو تفریح تصور کیا جاتا ہے:

متاع علم وفن کی اتنی ارزانی نہیں رکھتے
سو ہر محفل میں ہم شوق غزل خوانی نہیں رکھتے

چُنتے جاتے ہیں ہم اوروں کی خاطر راہ کے کانٹے
مگر اپنے لیے رستوں میں آسانی نہیں رکھتے

جو زرومال کے تاجر ہیں انہیں کیا معلوم
آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک گہر سب کچھ ہے

اب کھلا اور ہی معیار کے پیمانے ہیں!
ہم سمجھ بیٹھے تھے دنیا میں ہنر سب کچھ ہے

اعتبار ساجد کی بلند نظری اپنی جگہ لیکن وہ جس معاشرے کا فرد ہے وہاں

غم روزگار سے جان نہیں چھوٹتی۔شاعر تخلیقی طور پر کتنا ہی ثروت مند ہوا سے نان و نمک کی فکر لاحق رہتی ہے۔عشق و سرمستی یا کسی کی زلف طرحدار کا اسیر ہونے سے پیٹ نہیں بھرتا۔شیخ سعدی نے بھی اعتراف کیا تھا کہ شہر دمشق میں ایک برس ایسا قحط پڑا کہ یار لوگوں نے عشق کرنا بھلا دیا۔گویا ارض عشق میں ارادہ شامل ہے۔خوش حالی اور فارغ البالی میں جہاں اور مشاغل اختیار کیے جاتے ہیں وہاں عشق اختیار کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح شاعری یا ادب پروری کوئی منافع بخش کاروبار نہیں البتہ یہ تخلیقی عمل ایک ایسا روگ ہے جو آخری سانس تک برقرار رہتا ہے۔اعتبار ساجد نے کمال ہنرمندی سے اپنی سخنوری اور عزت نفس کے امتزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے جو بات کہی اسے وہ اپنے لہجے سے اور بھی موثر بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے۔

اسی پہ نان ونمک کا مدار تھوڑی ہے
یہ شاعری ہے کوئی کاروبار تھوڑی ہے

بس اک جنوں ہے سمو دیں لہو کو لفظوں میں
یہ خون ریزی کوئی بیوپار تھوڑی ہے

خریدتے ہیں محبت سے جو کتاب مری
تو ان میں کوئی مرا رشتے دار تھوڑی ہے

نمود و نام کی خواہش کو اپنی جیب میں رکھ
غزل غزل ہے کوئی اشتہار تھوڑی ہے

اعتبار ساجد کی بیشتر غزلیں نظم کا رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔اشعار میں معنوی تسلسل پوری غزل کی فضا کا احاطہ کئے نظر آتا ہے۔یہ انداز اظہار اور منفرد اسلوب غزل کے چند شعراء کا اختصاص ہے کہ پہلے اور آخری شعر میں ان کے ہاں ربط باہمی کی بو باس پائی جاتی ہے اور اعتبار ساجد کے ہر شعر میں کسی نفس مضمون کے مختلف اجزاء اور ریزہ خیالی کے نمونے تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی سلک میں پرو کر قاری سے اپنے رواں دواں لہجے اور جذبوں کی سخاوت کا مظاہرہ کر کے داد کا طلب گار ہونا چاہتا ہے۔یہ اس کا وہ حق ہے جسے وصول کرنا اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ:

ہوا میں اڑ رہے ہیں سب ورق کتابِ عمر کے
میں کیا کروں سمیٹنے کا وقت بھی نہیں رہا

کچھ قرینے بھی تو ہوتے ہیں حصولِ داد کے
فکر میں گہرائی لفظوں میں روانی چاہیے
قرض خواہانِ وفا، آخری آنسو چن لیں
یعنی بچھڑے تو پلٹنے کے نہیں ہم اب کے

غزل میں اعتبار ساجد عہد موجود کی زبان برتنے کا فن جانتا ہے۔اس کی غزل میں وہ الفاظ بھی جگہ پاتے ہیں جو کم بہت کم غزل گو شعرا نے برتے مثلاً البم، کیلنڈر، ضمیمہ، نالونال، افسر اعلیٰ، ممٹی، گلوب، دالان، یہ ایسے الفاظ ہیں جو غزل کے کارگہ شیشہ گری میں اجنبی، غربت آشنا اور نامانوس ہونے کے باوصف جزو مزاجِ غزل بنا دیے گئے۔یہ سحر آفرینی اعتبار ساجد کی پہچان ضرور ہے لیکن غزل میں رسیلا پن ضرور متاثر ہوتا ہے مثلاً:

وہ بدل لیتا ہے ہر سال نیا کوئی رفیق
پچھلا کوئی بھی کیلنڈر نہیں رہنے دیتا

خیال و فکرِ غمِ کائنات کرتے ہوئے
گلوب سامنے رکھئے گا بات کرتے ہوئے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں گھر میں ہر جگہ ملتی نہیں
رفتگاں کی مجھ کو اک البم پرانی چاہیے

آج بھی اس ممٹی پہ ساجدؔ
کوئی کبوتر بیٹھا تھا

جناب اعتبار ساجد کا مجموعہ کلام ''ہم بھی کسی کا خواب تھے'' جدید حسیت کا آئینہ دار ہے۔انہوں نے ذاتی دکھوں کو روزمرہ کے تمام حالات سے جوڑ کر اس طرح پیش کیا ہے کہ زندگی کی کلیت دلنشین انداز سے ابھر کر سامنے آئی ہے۔ان کی جدیدیت معاشرہ سے کٹی ہوئی لایعنیت سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی۔وہ فردیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کی جگہ انفرادیت کے خدوخال نمایاں کرنے میں مصروف ہیں اور اردو کی شعری روایت کے صحت مند اجزا کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں جدید حسیت کو شامل کر کے روایت کو وسعت دینے کے قائل ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تصور روایت حرکی ہے جو زندگی میں تبدیلیوں کے ساتھ روایت میں بھی تبدیلیوں اور اس کے آگے بڑھنے پر زور دیتا ہے۔موضوعات سے قطع نظر ان کا اسلوب بھی روزمرہ کی عام بول چال کے بہت قریب ہے۔وہ نامانوس تراکیب اور غریب الفاظ کے استعمال سے ممکنہ حد تک بچنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری ایسی نیچرل شاعری کے قریب نظر آتی ہے جس کی تلقین مولانا حالی نے کی تھی۔مجھے یقین ہے کہ اپنی نمایاں خصوصیات کی وجہ سے اعتبار ساجد کی شاعری ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

حکیم محمد سعید

''نئے آفاق کی تلاش''

عذرا اصغر
(کراچی)

اعتبار ساجد کا نام ادب میں اسی طرح معتبر ہے جس طرح ان کے نام کے لغوی معنی۔ محض یہ کہنا کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں، زیادہ درست بات نہ ہوگی کیونکہ ان کے اندر۔۔۔''انسانی بنیادوں'' میں افسانے کا خمیر بھی اسی طرح گھلا ملا نظر آتا ہے جس طرح پروفیسری، شائستگی اور ذہانت۔

یوں پروفیسری کے ساتھ ذہانت اور شائستگی کا ہونا کچھ ضروری اور لازمی نہیں لیکن اعتبار ساجد نے ان تینوں کو اپنے لیے لازم وملزوم قرار دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دیکھ کر اپنے بچپنے کے نستعلیق قسم کے اساتذہ یاد آجاتے ہیں اور بے اختیار ان کا یعنی اعتبار ساجد کا احترام کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

تعلیم وتدریس اگرچہ ان کا پیشہ ہے مگر تدریس کے شعبے نے جہاں ان کی شخصیت میں نکھار اور قرینہ پیدا کیا ہے وہیں ان کی ادبی بنیادوں کو بھی مستحکم کرتے ہوئے تجربات ومشاہدات کو وسعت بھی بخشی ہے۔

میں اعتبار ساجد کو بطور شاعر تو عرصہ سے جانتی تھی۔ کوئٹہ ٹیلی ویژن سے ان کے کچھ ڈرامے بھی نظر سے گزرے تھے لیکن افسانہ نگار اعتبار ساجد سے میری ملاقات ابھی ابھی ہوئی ہے جب انہوں نے اپنے افسانے پڑھنے اور پھر ان پر ''رائے زنی'' کرنے کی فرمائش مجھ سے کی۔ اعتبار کے افسانے پڑھ کر پہلے تو میں ایک خوشگوار اچنبھے سے گزری پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ اتنا اچھا لکھنے والا افسانہ نگار اب تک میری اور بہت سے دوسرے قارئین کی نظروں سے کیوں اور کیسے اوجھل رہا۔

فنکار پر ہم کسی ایک فنِ اسلوب یا صفِ ادب کا ٹھپّہ ہرگز نہیں لگا سکتے کیونکہ فنکار کے اندر کی بے چینی اسے کسی ایک چیز پر قناعت کرکے بیٹھ رہنے یا کسی ایک مقام پر قیام کرنے سے روکتی ہے۔ فنکار تو وہ کولمبس ہے جو ادب کے صحرا میں نئی نئی دنیاؤں کا متلاشی، بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ تجسس وتحیر اس کی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ اس کا تھک کر ایک مقام پر بیٹھ جانا فن کی ہی موت نہیں، خود فنکار کے بھی اختتام کا اعلان ہے۔ آگے بڑھتے جانا اور نئے آفاق کی تلاش کرتے رہنا فن کو معنویت سے ہمکنار کراتے ہوئے دونوں کو ابدیت بخشتا ہے۔ فن کو بھی اور اس کے خالق کو بھی امر کردیتا ہے۔

زیر نظر کتاب اعتبار ساجد کے کل سات افسانے شامل ہیں۔ ''بھائی صاحب''۔۔۔''پیمانہ''۔۔۔''وقت، شہر اور آدمی''۔۔۔''طلب''۔۔۔''اسپیڈ بریکر''۔۔۔''اندر کی عورت''۔۔۔اور ''جگہ نہیں ملتی''۔۔۔اعتبار ساجد کے ان ساتوں افسانوں کے موضوعات اگرچہ مختلف ہیں مگر محور ایک ہی ہے۔ سیکس۔۔۔ جداگانہ اسلوبِ نگارش کے باوجود انہوں نے ہر افسانہ کا تاروپود جنس سے ہی بنا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس وضعدار، حساس اور وسیع مشاہدہ رکھنے والے کہانی کار نے اپنی کہانیوں کے لیے جنس کے میدان کا انتخاب کیوں کیا۔ آیا یہ محض اتفاق ہے یا لاشعور میں چھپے کسی مبہم جذبے کا اظہار۔۔۔

مجھے تسلیم ہے کہ سیکس ایک ضرورت ہے، حقیقت ہے اور فطرت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ملک اور معاشرے میں وہ ابھی ''مسئلہ'' قطعی نہیں بنی۔ البتہ یورپ کے پیروکار اور تقلید پسندوں کے ایک گروہ کا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ ''پاکستانی افسانہ نگار سیکس کے موضوع کو شجر ممنوعہ تصور کرتے ہیں اور اس تذکرے سے گھبراتے ہیں۔'' حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے جہاں اس مسئلے کا اٹھایا جانا یا بیان کرنا ناگزیر ہوتا ہے وہاں ضرور کیا جاتا ہے مگر بطورِ خاص اسی موضوع کو ہرا پھرا کر استعمال کرنا اور سامنے لانا دو باتیں ظاہر کرتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ افسانہ نگار اپنے پڑھنے والوں کو چونکا کر جلد سے جلد مقبولیت کی سند حاصل کرکے شہرت کی سیڑھیاں چڑھ جانا چاہتا ہے۔ دوسری یہ بات کہ وہ خود کو ''لبرل'' آزاد خیال اور مغرب کی (بزعمِ خود) ترقی یافتہ اقوام میں شامل کر رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ عمل لاشعور سے زیادہ شعوری سمجھا جانا چاہیے۔

ہمارے معاشرے میں ابھی زندگی کے بے شمار گھمبیر قسم کے مسائل موجود ہیں جن پر لکھا جانا سیکس کے موضوع سے کہیں زیادہ ضروری ہے اور اہم ہے گویا:

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

ان دیگر موضوعات کا تذکرہ کرتے ہوئے سیکس کا مسئلہ درپیش آجانا یا اس کی نشاندہی کرنا البتہ ناگزیر ہوسکتا ہے اور نا قابلِ گرفت بھی۔۔۔

ہمارے ادب میں اس موضوع کی بطورِ خاص ابتداء اور تشہیر شاید منٹو سے ہوئی اور اب تک بالالتزام ڈاکٹر سلیم اختر تک پہنچی ہے۔ درمیان میں کئی لکھنے والوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی اور اسے اپنی تحریروں کا محور بنایا اور جیسے نام کمایا اسی طرح گنوایا بھی۔ لیکن جس طرح یہ موضوع منٹو سے وابستہ رہا اسی قدر نا سہی کچھ کچھ بلکہ بہت کچھ اب ڈاکٹر سلیم اختر سے منسلک ہے۔

بیشک! اعتبار ساجد نے اس ''خوشۂ گندم'' کو شائستہ پیرایۂ اظہار دیا ہے اور اس موضوع کو خوبصورتی، قرینے اور رکھ رکھاؤ کے جامے سے باہر نکلنے نہیں دیا۔ تیسرا انہوں نے کسی جگہ بھی اپنے پڑھنے والوں کو سستے تلذذ کا شکار نہیں ہونے دیا ہے۔ اس کے برعکس قارئین کو سوچنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا تانا بانا زندگی کے مختلف اور متنوع واقعات اور پیش آمدہ حادثات سے بُنا گیا ہے جن کو زندگی سے بھرپور ناتہ رکھنے والے بالغ نظر، جاندار کرداروں نے آگے بڑھایا ہے۔ تاہم ہر کہانی میں کسی نہ کسی طور ابلیس کے بھائی بندوں کا ''خوشۂ گندم'' چکھ لینے پر پیہم اصرار اور بلند انسانی قدروں کو متزلزل کرتا محسوس ہوتا ہے۔

عورت اور مرد۔۔۔ابتدائے آفرینش سے زندگی کے دو اہم کردار ہیں جن سے دنیا کی رنگینی، گہما گہمی اور حسن قائم ہے۔یہی دو کردار دنیا کی بقاء کے ضامن ہیں اور یہی دو کردار اعتبار ساجد کی کہانیوں میں اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ جلوہ فرما ہیں۔ان کی کہانیوں کا اختتام حزن سے ہوتا ہے۔

وہ طربیہ ابتداء سے آہستہ خرامی کے ساتھ حزنیہ کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور پھر قاری کو محض ملول اور دلگرفتہ ہی نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اس کے ذہن میں غور و فکر کی ایک شمع روشن کر دیتے ہیں۔دیکھئے ان کے افسانے ''بھائی صاحب'' میں چھوٹے کے جذبات۔

''میرا دل کٹ کے رہ گیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے سوچا بعض مقامات پر آدمی کتنا بے بس ہوتا ہے، اتنا بے بس کہ اپنی بھائی کی مدد بھی نہیں کر سکتا۔''

اسی طرح ملاحظہ کیجیے ''پیمانہ'' کا یہ مکالمہ

''پھر۔۔۔؟ میں نے بجھی بجھی سوالیہ نظروں سے راحت کی طرف دیکھا، وہ سگریٹ سلگا کر ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔

''پھر کیا استاد جی۔کوئی کنجری ہوتی تو بات بھی تھی، شریف زادی کا میں نے کیا کرنا تھا۔''

''وقت، شہر اور آدمی'' سے اقتباس سنیے!

''ارے؟'' زیبن حیرت سے چیخی۔''لے بھئی امتل، ادھر آ، تیرے ماموں نے شادی ہی نہیں کی اب تک۔''

''ماموں؟'' اس کے کانوں میں جیسے ٹین کوٹے جانے لگے۔

''ماموں'' اس نے زیرلب دھرا کر زیبن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔زیبن نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا پر آنکھیں جھکا لیں، چادر کے کونے کو انگلیوں سے مسلنے لگی۔بولی:

''اور کیا۔۔۔آپ ماموں ہی تو ہوئے میرے بچوں کے'' یہ کہہ کر وہ اٹھی دروازے تک گئی۔بڑی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ایک دھمو کا اس کی پیٹھ میں جڑ دیا۔بولی:

''چل اندر بیٹھ، ماموں کے پاس، میں باورچی خانے میں جاتی ہوں، تیرہ برس بعد آیا ہے میرا بھائی۔''

اعتبار ساجد کی کہانیاں مرد اور عورت کے ناآسودہ جذبوں اور شکستہ آرزوؤں کی کہانیاں ہیں۔راکھ تلے دبی ہوئی ان چنگاریوں کی کہانیاں ہیں جو بھڑک اٹھیں تو شعلہ بن کر ساری دنیا، سارے معاشرے کو بھسم کر ڈالیں، مگر اعتبار ساجد اس کمالِ فن کے ساتھ راکھ کریدتا ہے کہ چنگا ذرا چمکتا ہے، بس اتنا کہ اس کی تپش محسوس کر لی جائے اور پھر راکھ کے ڈھیر میں چھپ جاتا ہے۔ان کے افسانوی کرداروں میں محبت کی، چاہت اور وارفتگی کی بنیاد جو رشتہ یا تعلق بنتا ہے وہ سیکس ہی بہر طور قرار پاتا ہے۔محبت کی پوترتا کے بارے میں جو قصّے کہانیاں آج تک ہم سنتے اور پڑھتے آئے ہیں وہ محض ''اخلاق سدھار'' قصّے ہی لکھنے لگتے ہیں۔محبت ایک ایسا عالمگیر مبنی بر صداقت جذبہ ہے جو عمر، صنف، وقت اور زمانہ کی چیز کی نہ پرواہ کرتا ہے اور نہ خاطر میں لاتا ہے۔یہی جذبہ انسان کو انسان سے قریب تر کرنے کا محرک بنتا ہے اور یہی جذبہ اعلیٰ قدروں کو جنم دیتا ہے۔پھر جانے کیوں ہمارے اس ذہین فنکار نے اس سچائی سے انحراف کرنے کی کوشش کی ہے اور دانستہ تلخابۂ زمانہ کے دُکھوں کا مداوا کرنے سے گریز پا ہو کر وقتی و لمحاتی نشاط کو ترجیح دی ہے۔

یوں اعتبار ساجد نے پوری پختگی کے ساتھ قلم پکڑا ہے اور انسان کی فطری خواہشات، رجحانات اور اس سے پیدا شدہ میلانات کا احاطہ کیا ہے تاہم انہوں نے کہیں بھی قلم کو بھٹکنے نہیں دیا اور کہانی کو معیارِ فن سے گرنے نہیں دیا۔مثلاً ''طلب'' ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں بہک کر قلم کی ذرا سی جنبش نہ یہ کہ کہانی کے معیار کو پست کر دیتی بلکہ تلذذ آمیز ناپختہ ذہن کی کارفرمائی بنا دیتی۔اعتبار نے اس میں بہت بچ کر اور سنبھل کر اسے ایک مکمل معاشرتی کہانی بنایا ہے جو بے شمار المیوں، دکھوں اور نارسائیوں سے گزر کر اس خطرناک فطری طلب پر آ کر ختم ہو جاتی ہے اور یوں معاشرے کی ناہمواری زیادہ ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔''طلب'' سے یہ ایک اقتباس دیکھئے:

''کوچوان نے گھوڑی کو پچکارا، اسے ایک تھاپڑا دیا'' کہنے لگا۔

''ہوش نال، میری رانئے، ہوش نال'' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میں اسے چھانٹا نہیں مارتا باؤ جی، بلکہ ایمان کی پوچھو تو چھانٹا میں نے ایک ہی بار مارا تھا اسے۔پھر توڑ کر پھینک دیا، عورت اور گھوڑی کے لیے چھانٹے بیکار ہوتے ہیں۔''

اعتبار نے اپنے گہرے مشاہدہ کی بنا پر جو فلسفیانہ بات ایک ان پڑھ، اجڈ کوچوان کے منہ سے کہلوائی ہے وہ کسی سطحیت کی حامل نہیں۔یہ ایک ایسی سوچ ہے جو تھوڑا سا بھی احساس رکھنے والا انسان محسوس کر سکتا ہے۔ہمارے دیہات میں بسنے والا غیر تعلیم یافتہ، غیر مہذب معاشرہ کہ جس میں عورت آج بھی اسی طرح بے زبان، بے حس، خدمت گزار اور مرد کی ملکیت سمجھی جاتی ہے جیسے ایک گھوڑی یا کوئی بھی مویشی۔۔۔آگے چل کر جو اہم مقام اس افسانہ میں آتا ہے اس نے سیدھی سادی کہانی کو انسانی فطرت کی ضرورت کو مجبوری اور اخلاق کے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں جسم کی فطری مانگ معاشی و معاشرتی لاچاری بن جاتی ہے وہ محض ہوس یا دل لگی نہیں رہتی۔خالصتاً ضرورت نظر آنے لگتی ہے۔

اپنے مزاج کی مانند اعتبار ساجد کی کہانیوں میں ٹھہراؤ کا عنصر غالب ہے وہ آہستہ آہستہ کرداروں کے ذریعے کہانی کے واقعاتی پس منظر کو پھیلاتے ہیں اور قاری بے حد غیر محسوس طریقے سے اس کے پھیلاؤ میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔

نقادوں کا کہنا ہے کہ اچھا کہانی کار وہ ہے جو کہانی میں خود بھی موجود ہو۔ اعتبار کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں خود ہی موجود نہیں ہوتا بلکہ اپنے قارئین کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس طرح شروع سے آخر تک افسانہ نگار اور قاری کی **Involement** کہانی میں برقرار رہتی ہے۔

افسانے پر کہانی کار کی مضبوط گرفت اس کی پختگی فن کا بین ثبوت ہے اور یہ ثبوت اعتبار ساجد کے ان ساتوں افسانوں میں ہمیں ملتا ہے۔ ان کی زبان شستہ ہونے کے ساتھ اپنے علاقائی ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ گفتگو کے انداز، لفظوں کی کاٹ اور جملہ سازی برمحل اور برجستہ ہے اور میرے خیال میں یہی وہ تکنیک ہے جو کسی کہانی کو جاندار بنانے میں ممد ومعاون ہو سکتی ہے اور پڑھنے والے کو ابتداء سے ہی اپنی جانب متوجہ رکھتی ہے۔ لیکن اگر وہ کسی وقت اپنا افسانوی رجحان بدلنے کی کوشش کریں اور اپنے موضوعات کے رخ کو موڑنے میں کامیاب ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ تخلیقی دنیا میں ادب کے حوالے سے ایک اہم ترین شخصیت ہونگے۔ یہ بات میں نے محض افسانے کے حوالے سے کہی ہے ورنہ مجھے اعتراف ہے کہ شاعری میں ان کا مقام بلند اور جداگانہ انداز مسلّم ہے۔ چنانچہ افسانے میں بھی انہیں کسی تقلید کے بغیر اپنا مقام متعین کرنا ضروری ہے جو کسی لذت آمیز چاشنی سے مبّرا ہونا چاہیے۔ تاہم ان کے فن کی جملہ خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یقینی طور پر میں کہوں گی کہ اعتبار ساجد ایک پختہ کار، بالغ نظر اور وسیع تر مشاہدہ رکھنے والے ادیب ہیں۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ اعتبار ساجد نے افسانے میں قلم فرسائی کر کے محوِ حیرت تو کیا ہی ہے یہ یقین بھی دلا دیا ہے کہ اچھا شاعر، اچھا افسانہ نگار بھی ہو سکتا ہے، ورنہ جو زمانہ مابعد کا ایک معقولا ہے ''بڑا شاعر مرثیہ گو'' یہاں قطعی غلط ثابت ہوتا ہے آج کے دور کا شاعر، شاعری ہی نہیں کرتا وہ ادب کے ہر گوشے کو متعارف کراتا اور ہر صنفِ ادب میں قدم رنجہ فرماتا ہے کیونکہ آج کا تخلیق کار متلاشی ذہن کا مالک ہے اور ستاروں سے آگے، اگلے جہانوں کی کھوج میں ہمہ وقت مصروف ہے۔

اعتبار ساجد بھی ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں جنکی تلاش ابھی جاری ہے اور صنفِ ادب کا میدان وسیع ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ادب کا مستقبل ایک بڑے کہانی کار کے سواگت کے لیے کشادہ بانہوں کے ساتھ کھڑا ہے۔

میں اعتبار ساجد سے جب بھی ملا۔ ایک ایسی مسرت سے ہمکنار رہا۔ جو بہت اچھے لوگوں سے مل کر حاصل ہوتی ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ ایک اچھا انسان ہی نہیں بلکہ ایک عمدہ شاعر بھی ہے مجھے اس کی شاعری میں اپنے وہ دکھ نظر آتے ہیں جن کے بیان میں لفظ میری رفاقت نہیں کرتے۔ جب کہ اعتبار ساجد یہ سب کچھ بڑی سہولت سے بیان کرتا چلا جاتا ہے اور پھر ان لمحوں میں میرے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے کہ اے خدا! اس شخص کو سلامت رکھ جو میری زبان ہے!

عطاء الحق قاسمی

''امتزاج'' **Dilution** آمیزش، ''ہم آہنگی''

یہ ہمارے دوست اعتبار ساجد کا ۲۲واں شعری مجموعہ ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاعر کو بائیس بائیس مجموعے کیوں لکھنا پڑتے ہیں، شعر ہو تو ایک بھی بہت ہے، شعر تو ایک ہی کافی ہے۔

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ایک شعر یا چند اشعار کی تخلیق کے لیے ہزار ہا اشعار کی مشقت سے گزرنا پڑتا ہے اور اُس لمحے کے انتظار میں شاعر ساری زندگی وقف کر دیتا ہے، جس میں ہستی اُس کے اندر آ کر ہمکلام ہو اور شاعری بر آمد ہو جو اُمر ہو جائے اور شاعر کو بھی امر کر دے۔

امتزاج میں اعتبار ساجد مجھے طائف کا وہ موچی نظر آیا کہ جو کہہ رہا ہے کہ:

تب یہ میں نے ہوا سے کہا:
جا کے کہہ دے کہ اب اے ہبَل دیوتا!
غیر ممکن رہے گا کوئی رابطہ
اک پجاری تجھے اب نہیں مانتا
تیرا وہ راستہ، میرا یہ راستہ!
پھر میں مکہ کی جانب روانہ ہوا
میرے اندر کوئی نعت خواں جاگ اٹھا
میرے باہر کا موچی وہیں رہ گیا۔

ڈاکٹر افتخار حسین بخاری

مرا اجنبی مرا آشنا

پروفیسر سلیمان باسط
(ملتان)

اعتبار ساجد جب پہلی دفعہ مجھے ملا تو میں نے اس کے بارے میں ایک ملا جلا سا تاثر قبول کیا۔ منحنی سا بدن، سنورے سنورے بال، سوٹ میں ملبوس، چہرے پر سیاستدان نما شاعر کی جھلک اور ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ۔ پھر ''نام'' اعتبار ساجد۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ پہلی ملاقات میں مَیں اس سے متاثر ہوا بلکہ سچ پوچھیں تو کچھ دب سا گیا۔ پھر جیسے جیسے تار کھلتے گئے حجاب کے پردے الٹتے گئے اور ہم اپنی اپنی ذات کے حصار سے باہر آ گئے۔ چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے لگے اور ادب میں گروہ بندیوں سے لے کر ملکی سیاست تک پر تبصرے کرنے لگے۔ اتفاق بھی ہوا اور اختلاف کی نوبت بھی آئی۔ شدید اختلاف بھی ہوا مگر اس کی ''Offencive Peace'' مسکراہٹ نے کبھی لڑنے نہ دیا۔ یہ پسپائی مجھے اس کے قریب تر لے گئی۔ پھر میں نے اختلاف کی دوسری صورتیں نکالیں۔ اس کے نام پر اعتراض کیا کہ ایسا شخص ساجد تو کبھی بھی نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی تو اس کے سجدوں کا اعتبار نہیں۔ اس نے یہاں بھی مجھ سے اتفاق کر کے میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

روز روز کی پسپائی سے تنگ آ کر میں نے اس شخص سے دوستی کر لی اور اس دوستی کا نتیجہ اس وقت بھگت رہا ہوں۔ اس کے شعر سننے سے پہلے میں سوچتا تھا کہ یہ شخص یقیناً شعر لکھواتا ہے۔ لیکن پہلی غزل سننے کے بعد ہی یہ رائے بھی بدلنا پڑی۔

آنکھوں سے عیاں زخم کی گہرائی تو اب ہے
اب آ بھی چکو وقت مسیحائی تو اب ہے!
پہلے غم فرقت کے یہ تیور تو نہیں تھے
رگ رگ میں اترتی ہوئی تنہائی تو اب ہے

اعتبار ساجد کے یہ اشعار میری روح میں اتر گئے اور اس میں اس کی شاعری کی تمازت سے پگھلنے لگا۔ پھر پتہ چلا کہ اعتبار ساجد مزاح نگار بھی ہے اس نئی جہت کا مجھے ہرگز علم نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ شخص اپنے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ لیکن اس کی ہمہ جہت شخصیت کے پرت آہستہ آہستہ کھلے۔ میٹھی میٹھی چٹکیاں بھرے یہ کھیل اس نے خوب کھیلا ہے۔ وہ خود پانچواں درویش بن بیٹھا ہے مگر بن باس لینے کی بجائے لوگوں کو بیلوں کے سینگوں پر اچھالنے کے شغل کی طرف مائل ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو علم ہے یہ بیل جسے وہ دوسروں کو مارنے کی ترغیب دیتا ہے دراصل اس کے اندر کا درد ہے۔ یہ درد جب بھی اس پر یورش کرتا ہے وہ اس کا رخ کسی اور کی طرف موڑ کر کربناک اذیتوں سے فرار حاصل کرنے کی ایک معصوم سی کوشش کرتا ہے۔ اس کا قاری ہونٹوں کے کناروں پر ایک مسلسل خم کے ساتھ اسے پڑھتا جاتا ہے اور شفاف پانیوں کی تہہ میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اس درجے کا مزاح کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ اعتبار ساجد اور کچھ ہو نہ ہو پر پروفیسر ضرور ہے۔ اس کے اندر ایسا استاد موجود ہے جو طالب علم کی سطح پر اتر کر اس کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ طلبہ کبھی کبھی اس کی سطح تک آ جاتے ہیں۔ اسے یہ بھی علم ہے کہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر طوطے کے ذریعے قسمت کا حال بتانے والے پروفیسر کے مالی حالات کالج میں پڑھانے والے پروفیسر سے کہیں بہتر ہیں۔ مگر کڑھنا اس کی فطرت نہیں۔ وہ تو حقیقتوں کا شناسا ہے کڑوی کسیلی حقیقتوں کو گلے لگاتا ہے ان سے احوال کہہ لیتا ہے سن لیتا ہے اور پھر اپنے قاری کو لطیف پیرائے میں سنا لیتا ہے۔ اسی لیے فکر معاش کے باوجود اسے کسب معاش کا ڈھنگ نہیں آیا۔

اعتبار ساجد دوستی میں بڑا ظالم ہے۔ دوستوں سے رائے طلب نہیں کرتا انہیں حکم سناتا ہے لیکن دوست بھی کچھ ایسی مٹی سے بنے ہیں کہ اس کے حکم کی سرتابی کی مجال نہیں رکھتے۔ آپ یقین کریں مجھے اس کی خامی نما خوبی پر حسد نما رشک آتا ہے۔ دوستوں سے اچھی سی چائے پینا اُس کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ آتے ہی کہے گا ''باسط صاحب! بس اچھی سی چائے پلوایئے'' اور اس طریقے سے تکلف کی ساری دیواریں ڈھا دیتا ہے۔ اور دھیرے سے دل میں در آتا ہے۔ اس کے ساتھ اجنبیت تکلف اور لحاظ برتا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ خلوص بھری مسکراہٹ کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور چاروں جانب روشنی سی بکھیر دیتا ہے۔ سچ پوچھیئے تو ایسے دوست ہی غنیمت ہیں ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں دوستی اور خلوص بھی نیلام گھر کی زینت بن چکے ہیں۔

اعتبار ساجد کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میں نے اکثر سوچا ہے کہ یہ شخص زندگی سے بھرپور باتیں کیسے کر لیتا ہے۔ کیسے وہ لفظ تراشتا ہے جنہیں عام آدمی کی سوچوں کی ٹہنیوں پر پھوٹنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ کیسے وہ کہہ لیتا ہے جسے کہتے ہوئے دوسروں کا سینہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ درد سہنے کے باوجود کیسے وہ ہنسی ہنس لیتا ہے جسے ہنستے ہوئے ہمارے دور کے انسان کی روح میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ فن اس نے کہاں سے سیکھا ہے مجھے اس نے آج تک نہیں بتایا۔ میں نے اسے ہمیشہ بلا کا مطمئن دیکھا ہے۔ اس کی زندگی میں کبھی ''Emergency'' ڈیکلیئر نہیں ہوئی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے اس کی روح۔۔۔ اندر بانسری کی سریلی تان بج رہی ہے اور آنکھوں سے سرور کی پھواریں اُمڈ رہی ہیں۔ اس کی نغمگی شخصیت ہی کا کمال ہے کہ وہ شعر کو نہایت خوبصورت ترنم سے بھی آراستہ کر لیتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے آواز کے اتار چڑھاؤ کو الفاظ کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ ایسے میں کچھ یوں لگتا ہے کہ ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں سکون خود بخود روح میں گھلتا جا رہا ہے یا دل کے آنگن میں چاندنی کی پھواریں اُمڈ رہی ہیں۔

اس کی شخصیت کے متعلق یہ میرے دل کی گواہی ہے آپ اس سے مل لیجیے۔ اس سے باتیں کر کے دیکھئے آپ خود سوچیں گے کہ اتنے اچھے اتنے پیارے شخص کو اس ستم شعار زمانے نے زندہ کیسے چھوڑا ہے۔

''ہوا کا عطر زا جھونکا''

اقبال ارشد

(ملتان)

اعتبار ساجد ہمارے عہد کے ان اہلِ نظر میں بہت نمایاں ہے جو حیات و کائنات کو روزنِ دیوار کی بجائے روزنِ خیال سے دیکھتے ہیں۔ان کے سامنے معاشرہ اور زندگی کے شب و روز زیادہ واضح اور روشن ہوتے ہیں۔وہ چادر اور چار دیواری کا واقعتاً احترام کرتے ہیں۔محض دعویٰ نہیں روزنِ خیال سے اپنی ذات کا ادراک ہوتا ہے اور بندہ اپنے نفس کے عرفان کے بعد اپنے رب کی پہچان کر لیتا ہے۔

اس کے برعکس روزنِ دیوار سے جھانکنے والا ایک عام سا تماشائی ہوتا ہے اس کے اندر کی ہوس اسے دیوار کی دوسری جانب دیکھنے پر اکساتی ہے۔ یہ سطحی سے لوگ ہوتے ہیں اور اپنے جیسے دوسروں کے ساتھ مل کر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کی سطح پر آ جائیں۔ان کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔انہیں دور سے دیکھ لیا جاتا ہے یہ ادیب و شاعر و صحافی نہیں ہوتے بلکہ کہلاتے ہیں۔یہ دانشور و رو نابغہ نہیں ہوتے بنا دیے جاتے ہیں۔اور یہ عام معیار کے لوگ بھی نہیں ہوتے لیکن بیساکھیاں لگا کر ان کا قد اونچا کر دیا جاتا ہے۔

اعتبار ساجد نے اپنے لئے کوئی خاص راہ اختیار نہیں کی وہ تو پہلے سے اپنے بزرگوں کی راہ پر تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ سچائی بہر حال فتح پاتی ہے۔وہ ان تمام جادوگروں اور جنّوں سے لڑتا رہا ہے جنہوں نے شہزادوں کو طلسم و سحر کے ذریعے قید کر رکھا ہوتا ہے اور ان کی منزلوں کو پتھر بنا دیا ہوتا ہے تا کہ وہ رہائی پانے کے باوجود بھی ان سے سر ٹکرا کر زخم زخم ہو جائیں۔

اعتبار ساجد کو میں کبھی یاد نہیں کرتا۔یاد تو وہ آتے ہیں جنہیں ہم بھول سکتے ہوں۔یہ تو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ایک ایسے عزیز بھائی کی صورت میں جو سائبان بھی ہو اور ہوا کا عطر زا جھونکا بھی۔جانے کتنے برس بیت گئے ہیں اب تو دنوں اور مہینوں کا شمار بھی نہیں ہوتا۔ہم کیا کیا گُل کھلاتے پھرتے تھے۔کیسے کیسے محشر اٹھا رکھے تھے ہم نے۔۔۔ہمارے ساتھ ساتھ حسین سحر اور محسن نقوی ہوتے۔ہم عامل و معمول بن کر پورا ملتان گھوم لیتے۔شعری نشستوں میں پہنچتے تو سارے کا سارا انتظام و انصرام اپنے ہاتھوں میں لے لیتے۔جب پڑھتے تو پورا پنڈال داد و تحسین کے پھول برسانے لگتا۔اللہ تعالیٰ نے اہل دل کو بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے۔جن میں سے معصومیت بھولپن اور سادگی ہمیں بھی عزیز ہیں۔ہم نے یہ پینتیس چالیس برس لوگوں میں خلوص و محبت کی دولت بانٹتے ہوئے گزار دیے۔محسن نقوی اچانک جدا ہو گیا۔حسین سحر دیارِ غیر میں جا بسا میں شہر کے ایک معمولی سے علاقے میں قریباً قریباً گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

اعتبار ساجد بلاشبہ ایک کامیاب نثّار اور باکمال شاعر ہے یہ اردو ادب کے ان خوش نصیب مصنفین میں شامل ہے جو چودہ پندرہ سال کی عمر میں صاحبِ کتاب ہو گئے۔اس کے جملے اور مصرعے کلاسیک کا درجہ رکھتے ہیں۔یہ افسانہ لکھ رہا ہو تو اس کا سب سے اہم کردار بن جاتا ہے اور پھر پوری کہانی کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق چلاتا ہے۔یہ جب شعر کہہ رہا ہو تو جانو موسیقی کا سُر بن جاتا ہے جو فضاؤں میں بہر طور زندہ رہتا ہے۔یہ ایک اوریجنل فنکار ہے۔اس کا ہر فقرہ یا تو ناول ہوتا ہے یا غزل۔یہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو اس کی اپنی نہ ہو۔اس کا بڑا پن صاف نظر آتا ہے کہ اس نے آج تک کسی کا سہارا نہیں لیا۔اسے ضرورت بھی نہیں۔جو خود سچ ہو اسے تشہیر کی حاجت نہیں رہتی۔سورج نے آج تک کسی اخبار میں اپنے طلوع و غروب کا نظام الاوقات پیش نہیں کیا۔پھول نے اپنی خوشبو کی اشاعت کے لیے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی خدمات حاصل نہیں کی۔رنگ و آواز کو یہ ضرورت ہی نہیں پڑی کہ شہر کا منّادان کی آمد کی اطلاع دیتا پھرے۔اس نے کبھی کسی صاحب اقتدار جاہل سے اپنے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی میں صدارتی تقریر نہیں کروائی۔اس نے کبھی کسی سیاستدان یا بیوروکریٹ سے یہ نہیں کہا کہ اسے ریاستی اعزازات سے نوازنے کے لیے سرکاری ٹیلی فون کھڑکائے۔وہ ایسے کام کر بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ کسی ایسی عورت اور ایسے افسر کے مجموعہ کلام کو دیوانِ غالب کا جدید ایڈیشن نہیں کہہ سکتا جو غریب شاعروں سے ان کے اشعار خریدتے ہوں یا احمقانہ سطور کو الٹرا ماڈرن پوئٹری کا نام دیتے ہوں۔یہی وجہ ہے کہ یہ ان مشاعروں میں نظر نہیں آتے جن کے سپانسر راتوں رات معروف ہونے کا جنون رکھتے ہوں۔

اعتبار ساجد ملتان کی فضاؤں میں پلا بڑھا ہے۔ملتان اس کی شناخت و تعارف کا بہت بڑا حوالہ ہے یہ بغیر مشقت کے نامی نہیں ہوا اسے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔اسے نگیں بننے کے لیے کئی بار سان سے معرکہ آرائی کرنا پڑی ملتان سے کراچی، کراچی سے کوئٹہ، کوئٹہ سے گجرات، لاہور اور اسلام آباد۔۔۔تیس برسوں میں جا کر یہ مختلف دائرے مکمل ہوتے ہیں۔یہ دنیا کا واحد افسانہ نگار ہے جسے تخلیقِ فن پر قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور یہ پہلا محبت کرنے والا ہے جو کوچۂ ملامت سے گزرتے ہوئے سینہ تان لیتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر اعتبار ساجد میری محبتوں کا چشم دید گواہ نہ ہوتا تو مجھے معصوم، بھولا اور سادہ شخص سمجھ کر سیاستدان بنا دیا جاتا۔اعتبار ساجد زندہ رہو اور اپنی محبت کے پھول یونہی برساتے رہو۔آخر آخر کائناتِ حسن تمہاری ہو گی۔

☆

''تاریخ کے مطالعے کا منفرد طریقہ''

ظہیر احمد سلہری

(ملتان)

ناول لکھنا جتنا مشکل ہے اس سے کہیں کٹھن اس پر تبصرہ کرنا ہے اور وہ بھی اس وقت جب آپ لکھنے والے کی شخصیت سے بھی آشنا ہوں۔ اعتبار ساجد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ''دلاری'' ان کی تازہ ترین شائع ہونے والی تخلیق ہے اعتبار اچھے شاعر، ادیب اور صحافی تو ہیں ہی ''دلاری'' میں ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو کھل کر سامنے آیا ہے اور وہ ہے ایک سچے، کھرے اور محبّ وطن پاکستانی کا۔

پاکستان کے تعلیمی نظام میں تاریخ جس انداز سے پڑھائی جا رہی ہے اس سے طلبہ کی دلچسپی بڑھنے کی بجائے کم ہو رہی ہے۔ ''دلاری'' تاریخ کے مطالعے کے لیے ایک منفرد طریقہ ہے۔ پہلے صفحہ سے آخر تک کہیں بھی بوریت نہیں ہوتی اور تاریخی واقعات و حالات کو ایک کہانی کی شکل میں ایک قرینے اور سلیقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ قاری سسپنس پیدا ہونے سے ختم ہونے کے درمیان ہی سب کچھ جان لیتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کون تھا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا کردار اور پنڈت جواہر لال نہرو سے اس کے تعلقات کیسے تھے اور یہ تعلق کس طرح بھارت اور پاکستان کی تقسیم پر اثر انداز ہوئے ہونگے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔ قائداعظم کی شخصیت کی عکاسی بھی خوب کی ہے ان کا رعب، دبدبہ، برصغیر میں ان کا مقام، وقت کی پابندی اور قانون کی پاسداری لفظوں سے عیاں ہوتی ہے قائداعظم سے کس طرح ماؤنٹ بیٹن چڑ تا تھا اور ان سے ملاقات کے بعد تذبذب کا شکار رہتا۔ خوب منظر کشی کی گئی ہے۔ اس ناول میں دو قومی نظریے کی صرف تعریف (Defination) نہیں ہے بلکہ اس کی عملی تصویر بنادی گئی ہے۔ ہندو کس قدر انتہا پسند اور متعصب تھے مسلمانوں کو ملیچھ سمجھتے تھے۔ معاشرتی زندگی میں ہونے والے کسی عام سے واقعے کو بھی بڑھا چڑھا کر ہندو مسلم کی بحث تک لے جاتے تھے۔

دلاری جو کہ ایک ہندو لڑکی ہے اس کے ایاز کے ساتھ جانے پر سب کو اعتراض ہوا صرف اس لیے کہ وہ ایک ہندو لڑکی تھی اور ایاز مسلمان۔ لیکن وہ لڑکی کس حال میں ودھوا بن کر اپنی زندگی بسر کر رہی تھی اس پر کسی نے نہ سوچا۔ ہندو معاشرے کا کھوکھلا پن اور خاص طور پر ہندو دھرم میں خواتین کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں اسلام کس طرح خواتین کے حقوق کا ضامن ہے اور عورت کو جینے کا حق دیتا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دلاری اور رجنی کے درمیان ہونے والا ایک مکالمہ ملاحظہ کیجیے۔

''دیکھ دلاری'' رجنی نے تکیے سے سر اٹھا کر کہا ''ہمارے لیکھ سے کوئی برائی ہے تو کوئی نہ کوئی اچھائی بھی ہوگی، دیکھ نا ہم ودھوا ہو جائیں تو ویاہ نہیں کر سکتے، مگر مسلمان عورت خاوند کے فوت ہونے کے بعد شادی کر سکتی ہے۔ چاہے تو اپنے من پسند آدمی سے کر لے۔ ورنہ برادری اس کے لیے بر ڈھونڈ لیتی ہے۔ اس کا گھر بس جاتا ہے۔''

ہندوؤں اور مسلمانوں کی کش مکش کے علاوہ انگریز دورِ حکومت کی فرعونیت کا نقشہ بھی بڑی خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے۔ قاری تصور کی آنکھ سے اس دور کو دیکھ سکتا ہے۔ مکالموں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ بالکل اور یجنل ہے ہندی کا بھرپور استعمال ہے اور گورے سپاہی جیسے اردو بولتے تھے ان کا لہجہ بھی ہو بہو نقل کیا گیا ہے۔ جو قاری کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلا دیتا ہے۔ منظر کشی لاجواب ہے۔

دلاری پر ایک گورے سپاہی کے قتل کا الزام لگتا ہے۔ اس کے بعد اس دور کے قوانین کو بیان کرتے ہوئے جس انداز سے صورت حال واضح کی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے کس قدر مغز ماری اور مطالعہ کے بعد اس کو تحریر کیا ہے۔

''پہلے میڈیکولیگل رپورٹ کی تیاری پھر سیتا پور کی چھاؤنی کے کمانڈنگ آفیسر کے علم میں سارا معاملہ لانا اور ایف آئی آر درج کرانے کا حکم نامہ حاصل کرنا۔ براہ راست کوئی تھانہ ایف آئی آر درج کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ معاملہ گورے کا تھا۔ گورے کا نہ ہوتا تو برٹش انڈین آرمی کے کسی افسر یا جوان کی سول تھانے میں رپورٹ درج نہیں ہوسکتی تھی۔ ہو بھی جاتی تو کاغذ کے ایک ناکارہ پرزے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی۔ کمانڈنگ آفیسر ہی مجاز اتھارٹی تھا۔''

ناول میں راجندر چوپڑا کا کردار صحافی کی پیشہ وارانہ و ذاتی زندگی کا عکاس ہے کہ کس طرح ایک فرض شناس صحافی اپنی ذات کو بھلا کر کام کرتا ہے اور اس کے دن رات میں فرق نہیں رہتا۔ راجندر چوپڑہ اور اس کی بیوی کانتا کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ ملاحظہ فرمائیں۔

''آپ کس چکر میں پڑ گئے'' کانتا اس کے کاندھے پر سر رکھ کر بولی۔ ''چھوڑیں تارا سنگھ کے انٹرویو کو۔ ابھی تھکے ہارے سیتا پور سے اتنے دن بعد آئے ہیں۔ اب امرتسر کا تنا لمبا سفر کرنے چلے ہیں عقل بھی ہوتی ہے کوئی چیز''

اس نے پیار سے کانتا کا بازو تھپتھپایا۔ ''مائی ڈیئر کانتا تم ایک جرنلسٹ کی بیوی ہو، اس کا اندازہ تمہیں اب تک ہو جانا چاہیے تھا۔''

راجندر چوپڑہ کی تحقیقاتی رپورٹنگ نے بے گناہ دلاری کو کیس سے بری کروا دیا۔ صحافت کا کردار ہر دور میں اہم رہا ہے۔

باقی صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ کیجیے

''ٹھٹھرتی رات کا مہتاب''

(جناب اعتبار ساجد کے نظمیہ کلام کی شبیہ)

پروفیسر محمد رفیق خان (لاہور)

بے خال وخد

تُو جو دنیا میں آیا نہیں
طفلِ بے نقش و نام ونشاں!
تو ابھی ایک دھندلے تخیل کی کچی سی
تختی پہ لکھے ہوئے
حرفِ بے مدّعا کی طرح
اک ادھورے خدوخال کا خواب ہے
قطرۂ آب ہے
رحمِ مادر میں ابھری نہیں
کوئی کونپل تری ذات کی
طفلِ بے نقش و نام ونشاں!
رحمِ مادر سے آغوشِ مادر میں
آ کر جو دیکھے گا تُو
ریپ ہوتی ہوئی بے کس وخطا بیٹیاں
جرم جن کا یہ تھا
اپنے آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکیں
ایسے آقا جوان کے مجازی خدا بھی نہ تھے
منطقوں، منصبوں اور زمینوں کے مختار تھے
چوبداران وابستگانِ در و بام دربار تھے
افسرانِ عوام اور غلامانِ سرکار تھے
پھر بھی مختار تھے
طفلِ بے نقش و نام ونشاں!
ایسی دنیا میں آ کر یہ دیکھے گا تُو
ضبطِ تولید کے اشتہاروں سے پُر
شہر کی کہنہ گلیوں کے دیوار و در
کوڑا چنتے ہوئے، خستہ تن نوحہ گر
ماؤں کے لعل، باپوں کے نورِ نظر
مفلسی، بھوک، دہشت ہر اک موڑ پر
آنگنوں میں بکھرتے ہوئے برگ و بر
ڈگریوں کی طرح جلتے موروں کے پر
طفلِ بے نقش و نام ونشاں!
تُو کہ دنیا کی جنگوں سے واقف نہیں
تو نہیں جانتا بوئے بارُود کو
تو نہیں جانتا نامِ نمرود کو
تو نے تتلی نہ پھولوں کو دیکھا کبھی
تجھ کو ایٹم بموں کی نہیں آگہی
تیری خوش بختی ہے
تو نے دیکھا نہیں، تو نے جانا نہیں
(لائقِ دید بھی یہ زمانہ نہیں)
سوچتا ہوں کہ تم نے جنم کا یہ دکھ
خود پہ بھگتا نہیں
ناممکن رہا تیرا نام ونشاں
اک طرح سے یہ اچھا ہوا
تو نہ آیا یہاں
یہ جہنم ہی کو عنایت ہوا
ہم، جنہیں جلتے رہنے کی عادت پڑی
ہم، جنہیں موم بتی کے سانچوں میں
ڈھلنے کی عادت پڑی
ہم، جنہیں اپنی روحوں کو جسموں میں
رکھنے کی ناحق ضرورت پڑی
طفلِ بے نام و نقش ونشاں!
تُو جو دنیا میں آیا نہیں
کتنا خوش بخت ہے
ہم سا کوئی بھی صدمہ اٹھایا نہیں!
تُو جنم کے جہنم میں آیا نہیں!!

گلوب پر اجنبی

کبھی کبھی یہ سوچ کر اُداس ہو گیا ہوں میں
کہ جانے کتنے شہر ہیں جن میں جا سکا نہیں
نجانے کتنے لوگ ہیں جنہیں کبھی ملا نہیں
نجانے کتنے خوش نوا پرند ہیں
کہ جن سے آج تک مرا مکالمہ ہوا نہیں
کروڑوں، اربوں لوگ ہیں جو میری ہست و بود سے
سدا رہے ہیں بے خبر
سدا رہیں گے بے خبر
پھر ایک دن وہ آئے گا
فرشتۂ اجل کو اپنی روح سونپتے ہوئے
زمین اوڑھ لوں گا میں
یہاں نہیں رہوں گا میں
تو گویا کائنات کی حقیقتوں سے بے خبر
میں اک گدائے بے بصر
نہ دیکھ پاؤں کا انہیں
جو شہر اس گلوب پر ہیں جلوہ گر
وہ شہر جن کے نام بھی سُنے نہیں
وہ لوگ جو کبھی مجھے ملے نہیں
تو کیا گلوب پر بنی ہوئی یہ ساری جدولیں
گھماؤ دار پیچ میں
ابھرتی، ڈوبتی ہوئی
یونہی رہیں گی رقص میں
یونہی رہیں گی بستیاں، بھری ہوئی صداؤں سے
خزاں میں ٹوٹتی رہیں گی پتیاں ہواؤں سے
تو کیا رہیں گے لوگ اجنبی مری نواؤں سے
زمین اوڑھنے کے بعد
اس تماشہ گاہِ ارضِ خاک پر
بس ایک کتبہ نام کا
کسی لحد کی گرد میں اٹا ہوا
کسی اجاڑ کنج میں چھپا ہوا
رہے گا میرے نام سے سجا ہوا
وہ نام، جس کو جانتا نہیں جہاں
گلوب پر بنی ہوئی کہکشاں
یہ کائناتِ بیکراں
اور ایک میں
کہ ہست و بود بے نشاں
کبھی کبھی یہ سوچ کر اداس ہو گیا ہوں میں

○

To An American Cameraman

تمہارے کیمرے کے لینز اعلیٰ ہیں
تمہاری تکنیک اس سے بھی عمدہ ہے
مہارت ہو تو ایسی ہو
کہ بگلے ہنس راج اور سب پرندے
جہاں کے رحم کے حق دار ٹھہریں
مگر اس کیمرے کی آنکھ سے تم
وہ منظر کیوں نہیں سب کو دکھاتے
جہاں اولادِ آدم کٹ رہی ہے
جہاں بارود کے کڑوے دھوئیں سے
گلابوں کی ہر اک چادر
غبارِ درد و غم میں اَٹ رہی ہے
جہاں خیرات بھی
میزائلوں سے بٹ رہی ہے!

○

اکلاپا

وہ بوڑھا ایک دن بازار میں مجھ کو ملا
کہنے لگا: ''بیٹے!
تمہارے پاس تھوڑا وقت ہے؟
میں نے کہا ''فرمایئے، کیا چاہیے؟''
کہنے لگا: ''بس چند لمحے گفتگو کے واسطے''
ہم پاس کے ہوٹل میں جا بیٹھے،
ہمارے درمیاں کچھ دیر تک طاری رہی بے چین خاموشی
پھر اس نے اپنی عینک، اپنے آنسو پونچھ کر

یوں لب کشائی کی:
ہمارے تین بیٹے ہیں جو امریکہ میں رہتے ہیں
یہاں، اس ملک کے اس شہر میں
چھوٹا سا، خستہ حال سا اک گھر ہے
جس کی ٹوٹی پھوٹی بالکونی میں
سر شام خزاں
ہم دونوں، بیوی اور میں، خاموش
پیڑوں کی گھنی شاخوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کو تکتے ہیں
کبھی بچوں کے پچھلے خط سے بہلاتے ہیں اپنا دل
کبھی ہم ان کی تصویروں کو سینے سے لگاتے ہیں
مسلسل، کان ٹیلی فون کی گھنٹی پر رکھتے ہیں
نجانے کب کسی بیٹے کا ٹیلی فون آ جائے
گزر جاتے ہیں دن، بیٹوں کو فرصت ہی نہیں ملتی
کہ ہم کو صرف اتنی اطلاع دے دیں:
''یہاں سب خیریت ہے۔ آپ کے احوال کیسے ہیں؟''
کئی دن بیت جاتے ہیں
نہ کوئی خط نہ ٹیلی فون
سناٹا سا رہتا ہے
یہ سناٹا ہمارے خوں، ہماری ہڈیوں میں جذب ہو کر
آنسوؤں میں پھوٹ بہتا ہے

ہم ان کو فون کرتے ہیں
ادھر سے کوئی بیٹا نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں
جھنجھلا کر کہتا ہے:
''ابھی تک ہار کے سوئے تھے اپنے جاب سے آ کر
ہماری نیند کیوں ڈسٹرب کر دی آپ نے پاپا؟''

○

تیرے لئے

دل ہتھیلی پر لئے سب نے قطاریں باندھ لیں
سب نے آنکھوں کی سجائی کہکشاں تیرے لئے
اپنی امیدوں کے تارے تیرے آگے رکھ دیئے
کر دیا سب نے زمیں کو آسماں تیرے لیے

میرے لیے

کیکٹس جیسے ہیں یہ میرے در و دیوار بھی
میرا کمرہ بھی ہے دشت بے اماں میرے لیے
میں تو سرما کی ٹھٹھرتی رات کا مہتاب ہوں
کون وا کرتا ہے گھر کی کھڑکیاں میرے لئے

○

کل اور آج

میں جب چھوٹا سا اک بچہ تھا
میری زندگی کے دو مراکز تھے
مرا گھر اور مرا بستہ
مرے گھر میں مرے ماں باپ کی شفقت کے
اجلے پھول کھلتے تھے
کبھی میں دیر سے آتا تو میری منتظر ملتی تھی میری ماں
سرِ دہلیز، دروازے پہ پھیلائے ہوئے بانہیں
کڑکتی سردیوں میں وہ سدا گیلی جگہ سوتی
مجھے سوکھا ہوا، آرام دہ بستر عطا کرتی
مرے ابا مجھے ہر عید پر اچھے سے اچھا بوٹ پہناتے
اور ان کے پاؤں کے بوسیدہ جوتے مسکرا دیتے،
وہ عیدیں جا چکیں، وہ دن مرے ماضی کا حصہ ہیں
میں اب خود باپ ہوں
اور عید سے دو چار دن پہلے
خریداری کی خاطر گھر سے جب باہر نکلتا ہوں
تو نظریں سب سے پہلے ڈھونڈتی ہیں وہ دوکانیں
جن میں اچھے بوٹ ملتے ہیں
تصور میں مرے ابا کا چہرہ مسکراتا ہے!

○

ملک الموت سے درخواست

اے اَجَل! بَس تُجھ سے مُجھ کو اتنی مہلت چاہیے

جاتے جاتے کچھ ادھورے کام نمٹاتا چلوں
قرض ہیں جن جن کے آنسو، ان کو لوٹاتا چلوں
دوستوں اور دشمنوں کے ہاتھ ملواتا چلوں
اَب مجھے آواز مت دینا، یہ سمجھاتا چلوں
آخری لمحات میں اعلانِ رُخصت چاہیے
اے اَجَل! بَس تُجھ سے مُجھ کو اتنی مہلت چاہیے

جاتے جاتے چُوم لُوں ماں باپ کی لوحِ مزار
خشک پتے ان کی قبروں سے ہٹا کر، ایک بار
ان کے قدموں میں مجھے ہونا ہے آخر خاکسار
اس سے پہلے ہی چُکانے دے مجھے ان کے اُدھار
آخری تعظیم کی مُجھ کو سعادت چاہیے
اے اَجَل! بَس تُجھ سے مُجھ کو اتنی مہلت چاہیے

نیند ایسی چاہیے، مَیں جس میں سَچ مُچ سو سکوں
ایسی خلوت چاہیے میں جس میں کُھل کے رو سکوں
داغ جتنے دل پہ ہیں، میں آنسوؤں سے دھو سکوں
ایسا لمحہ چاہیے میں جس میں اپنا ہو سکوں
آخری گھڑیوں میں اپنی ہی رفاقت چاہیے
اے اَجَل! بَس تُجھ سے مُجھ کو اتنی مہلت چاہیے

فاتحہ پڑھنے کوئی آجائے جس کو دیکھ کر
جس کو حاصل ہوں دُعا گو ہاتھ، سوزِ نوحہ گر
جس پہ ہو سایہ فگن برگد کا اِک ایسا شجر
ہر پرندہ جس کو سمجھے اپنا واحد مستقر
شہر سے میں کہہ سکوں اِک ایسی تُربت چاہیے
اے اَجَل! بَس تُجھ سے مُجھ کو اتنی مہلت چاہیے

نیاز مند کے خطوط

اعتبار ساجد

بعض اتفاقات بھی کیسے دلچسپ ہوتے ہیں ہم ایک مخطوطے کی تلاش میں تھے کہ اچانک بن مانگی دولت ہاتھ آ گئی یعنی نیاز مند کے خطوط مل گئے۔ بظاہر تو یہ ایک نیاز مند کے خطوط ہیں لیکن یہ ایک عمومی رویے کے بڑے دلچسپ مظاہر ہیں۔ جہاں ایک طرف یہ مردعوام کی نفسیات پر منہ بولتا تبصرہ ہیں وہیں ان خطوط کے ذریعے بے شمار قارئین کی ذہنی غلط فہمیاں بھی رفع ہو جائیں گی۔ اس طرح یہ خطوط ہنسی مذاق میں بڑی افادیت اور اہمیت کے حامل ہو گئے ہیں۔ ان خطوط پر ہمارا تبصرہ محفوظ ہے البتہ ایک وضاحت ضروری ہے کہ ان کی اشاعت سے کسی ادیب یا شاعر کی تضحیک منظور نہیں محض ایک عمومی خیال اور عوامی سوچ کا اندازا جاگر کرنا مقصود ہے۔ تو لیجئے پیش خدمت ہیں نیاز مند کے خطوط۔

☆

محترمہ روحی کنجاہی صاحبہ!

جُگ جُگ جئیں اور آب حیات پئیں۔ سلام شوق کے بعد گزارش ہے کہ میں آپ کا ایک دیرینہ پرستار اور نیاز مند مداح ہوں۔ ایک طویل مدت سے آپ کا کلام مختلف رسائل و جرائد میں پڑھ رہا ہوں۔ سبحان اللہ۔ کیا غضب کا کلام ہے۔ موتیوں جیسے الفاظ اور ہیرے جیسے اشعار۔ سچ پوچھیں تو جب بھی رات کی تنہائی میں آپ کا کلام پڑھتا ہوں ایک دم دل میں شگوفے کھل اُٹھتے ہیں اور کلیاں مہکنے لگتی ہیں۔ سانسوں کا زیر و بم تیز ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ تصور ہی تصور میں آپ کی بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے۔ کاش ایسے لمحوں میں آپ میرے قریب ہوں۔ آپ کو سانسوں میں سمولوں اور دل میں اُتار لوں۔ آپ کی ریشمی زلفوں کے سائے میں ساری زندگی گزار دوں۔ روحی جی! آپ میرا آئیڈیل ہیں۔ میں نے آپ کو اب تک نہیں دیکھا ہے۔ صرف کلام پڑھ کر نادیدہ پرستار بن گیا ہوں۔ مگر اب کچھ عرصے سے دل میں شوق ملاقات چٹکیاں بھرنے لگا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے روحی جی، روحی جی کرتا رہتا ہوں۔ روحی روحی کر دی میں آپے روحی ہوئی۔ اب نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام ہے۔ ہر وقت آپ کا خیال ستاتا رہتا ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ کئی حکیموں اور ڈاکٹروں کو دکھا چکا ہوں۔ ہومیوپیتھی طریقہ علاج بھی آزما چکا ہوں۔ کسی طرح افاقہ نہیں ہوتا۔ چین نہیں آتا۔ براہ کرم اپنے بیمار غم پر فوری توجہ فرمائیں صرف ایک جھلک دکھا دیں۔ صرف ایک بار سامنے آجائیں۔ سانسوں میں سما جائیں اس دل میں اتر جائیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا۔

یہ خط اس رسالے کی معرفت روانہ کر رہا ہوں۔ جس میں آپ کا تازہ کلام شائع ہوا ہے۔ بے چین اور بے قرار دل کو قرار دیں۔ چند الفاظ کاغذ پر اتار دیں۔ ورنہ بروز محشر اللہ کے دربار میں فریادی بن کر آپ کے خلاف کھڑا ہو جاؤں گا۔

آپ کا نیاز مند

روحی جی!

سلامت باشد تا قیامت باشد۔ آہ یہ دن کتنا مبارک ثابت ہوا کہ صبح ہی صبح ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد آپ کا نامہ محبت موصول ہوا۔ مگر یہ کیا؟ لفافے میں سے یہ کس بابے کی فوٹو نکل آئی ہے؟ اور یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ آپ خاتون نہیں مرد شاعر ہیں اور ثبوت کے طور پر اپنی تصویر بھیج رہے ہیں۔ نہیں نہیں روحی جی یہ ظلم ہے، ناانصافی ہے۔ بہت بڑا مذاق ہے جو آپ نے مجھ بے بس اور لاچار نیاز مند مداح کے ساتھ کیا ہے۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ آپ مرد ہیں۔ مرد اتنا عمدہ نرم و نازک کلام نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ علامہ صاحب فرما گئے ہیں۔ مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر۔ میں نے اپنے من مندر میں جس روحی کی پرستش کی ہے وہ مرد نہیں ہو سکتی۔ اگر خدانخواستہ (جھوٹے کا منہ کالا) وہ مرد بھی ہو تو ایسا مرد نہیں ہو سکتی جیسا آپ نے فوٹو بھیجا ہے۔ البتہ ایک شبہ دل میں سر اٹھا رہا ہے کہ اگر یہ آپ کی فوٹو نہیں تو پھر آپ کے شوہر کی فوٹو ہے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ یہ آپ کے شوہر نامدار کی شبیہ مبارک ہے جن کے کانوں میں آلہ مکبر الصوت لگا ہوا ہے، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک شریف ہے اور چہرے پر بزرگی چھاجوں برس رہی ہے۔ افسوس، شادی بھی کی تو کس سے کی۔ ظالم! بہر حال۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ان صاحب سے طلاق کا چکر چلائیں۔ میں حاضر ہوں۔ تمام خط و کتابت صیغہ راز میں رہے گی۔

آپ کا نیاز مند

محترم بھائی جان روحی کنجاہی صاحب۔

آداب و تسلیمات۔ کل ہی ایک سرکاری رسالے میں معتبر ادیبوں اور شاعروں کے ہمراہ آپ کی دو عدد تصویریں دیکھیں۔ بے حد شرمندگی ہوئی کہ میں ماضی قریب میں آپ کو خاتون سمجھتا رہا۔ جبکہ آپ ماشاء اللہ وجیہہ و شکیل، صحت مند و توانا مرد شاعر ہیں۔ آپ کے کلام میں مردانہ وجاہت اور خاندانی شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے میں بہت معافی چاہتا ہوں کہ محض غلط فہمی کی بنیاد پر آپ کو خاتون سمجھ کر بے قابو ہو گیا۔ اور اوٹ پٹانگ قسم کے خط لکھ دیئے۔ امید ہے ایک ناسمجھ مداح کی بیوقوفی سمجھ کر آپ معاف فرمائیں گے۔ اور میرے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہیں کریں گے۔ والسلام

بدستور آپ کا پرستار

نیاز مند

محترمہ شبنم رومانی صاحبہ!

سلام شوق بے پایاں و جذبہ قدم بوسی۔ آپ کا کلام بلاغت نظام مختلف رسائل و جرائد میں نظر سے گزرتا رہا ہے۔ جس سے میں نہ صرف بے حد متاثر ہوا بلکہ من ہی من میں آپ کی پوجا کرنے لگا۔ جیسا نرم ملائم، خوبصورت آپ کا نام ہے ویسی ہی نسائیت کی پوترتا اور کوملتا سے بھرپور آپ کی شاعری ہے۔ ایک ایک لفظ ہیرے کی کنی کی طرح جگمگاتا ہے اور ہر شعر کے اندر ایسی ملائم اور شیریں لپک ہوتی ہے کہ عاشق کے خرمن دل کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ مگر فوراً ہی اپنے نام کی تاثیر یعنی شبنم کی ٹھنڈک سے فرحت و تازگی کا احساس عطا کرتا ہے۔ یہ خوبی بہت کم شاعرات کے کلام میں نظر آتی ہے بلکہ سچ پوچھیں تو جتنا کیف و سرور آپ کے اشعار سے میرے دل و دماغ کو حاصل ہوتا ہے اتنا کسی شاعرہ کے کلام سے اب تک حاصل نہیں ہوا۔ کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں جب ساری دنیا نیند کی وادیوں میں گم ہوتی ہے میں آپ کے کلام پر مشتمل رسائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا ہوں اور کمرے میں گھوم گھوم کر آپ کا کلام با آواز بلند پڑھتا ہوں۔ اکثر پڑوسی جاگ اٹھتے ہیں اور میری کھڑکی کے پاس آ کر انتہائی ناشائستہ الفاظ میں مجھے مخاطب کر کے کہتے ہیں ''ابے تجھے کیا تکلیف ہے۔ کیوں ہماری نیندیں خراب کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ کوئی دماغی فتور ہے تو ڈاکٹر سے رجوع کر۔ ہمیں کیوں پریشان کرتا ہے۔'' اب میں انہیں کیا بتاؤں کہ یہ دماغی فتور نہیں، قلبی عارضہ ہے۔ دل کی بیماری ہے جو دل ہی کے ساتھ جائے گی۔ تیری محفل سے یہ دیوانہ چلا جائے گا۔ شبنم جی۔ شمع رہ جائے گی پروانہ چلا جائے گا۔

براہِ کرم مجھ دیوانے پر رحم کھا کر بواپسی ڈاک مطلع کریں کہ آپ کہاں رہتی ہیں اور آپ سے ملاقات کی کیا صورت ہے۔ یہ خط میں اس رسالے کی معرفت آپ کو روانہ کر رہا ہوں جس میں آپ کی دو پیاری پیاری، رومان کی چاشنی اور نسائیت کے حسن سے آراستہ نرم و نازک، کومل اور خوبصورت غزلیں شائع ہوئی ہیں۔

آپ کا دیوانہ

نیازمند

شبنم رومانی صاحبہ۔

سلام شوق بے پناہ۔ کافی عرصہ قبل ایک رسالے کی معرفت آپ کی بارگاہ حسن میں ایک عریضہ محبت ارسال کیا تھا مگر اب تک اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ مجھے شبہ ہے کہ ایڈیٹر نے آپ کے نام بھیجا جانے والا محبت نامہ خود کھول کر پڑھ لیا ہوگا اور آتش رقابت میں جل کر خاک ہو گیا ہوگا۔ اسی لیے اس نے میرا نامہ محبت آپ تک پہنچنے نہیں دیا۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ آپ کو وہ نامہ شوق ملتا اور آپ جیسی حسین و جمیل نسائیت کی تمام لافانی خصوصیات سے سرفراز شاعرہ مجھے میرے خط کا جواب نہ دیتی۔ کیونکہ آپ کے کلام میں اتنی ہمدردی، اتنی غمگساری اور اتنی محبت کے چشمے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں کہ آپ جیسی خاتون سے کسی کٹھور دلی کی توقع نہیں ہو سکتی۔ یہ خط میں دوسرے رسالے کی معرفت آپ کے چرنوں میں بھیج رہا ہوں مجھے امید ہے کہ اس رسالے کے شریف اور باریش ایڈیٹر صاحب قبلہ و کعبہ ضرور میرا ناچیز مکتوب آپ تک پہنچا دیں گے۔ کیونکہ میں نے ایک دفعہ ایک تصویر میں دیکھا تھا کہ ان محترم ایڈیٹر صاحب کے چہرے پر نورانی داڑھی ہے اور آنکھوں میں شفقت اور ماتا مچلتی نظر آ رہی ہے۔ براہ کرم بواپسی ڈاک مطلع کریں کہ آپ کہاں رہتی ہیں اور آپ سے ملاقات کی کیا صورت ہے؟ دل تڑپ رہا ہے اور شوق ملاقات بے قرار کر رہا ہے۔ اس خط کو خط نہ سمجھیں تار سمجھیں۔ اور مجھے تندرست نہ سمجھیں بیمار سمجھیں۔

آپ کا بیمار محبت

نیازمند

محترم چچا جان شبنم رومانی صاحب!

تسلیمات۔ آج صبح اچانک آپ کا پارسل موصول ہوا۔ جس میں ''اقدار'' کا تازہ شمارہ اور آپ کا ایک مختصر سا رقعہ ہے۔ ایک طویل عرصے کے صبر آزما انتظار کے بعد آپ کا نام دیکھ کر اور اپنے نام آنے والی واحد ڈاک دیکھ کر دل دھڑک اٹھا۔ لرزتے ہاتھوں سے پارسل کھولا۔ ایک عدد خوبصورت دیدہ زیب اور جامہ زیب رسالہ نکلا۔ اور ایک مختصر سا رقعہ جس میں آپ نے انتہائی خشک لہجے میں تحریر فرمایا ہے۔ عزیزم آپ میرے تخلص سے دھوکہ کھا گئے ہیں۔ میں عورت نہیں مرد ہوں۔ تصدیق کے لیے اپنا رسالہ ''اقدار'' روانہ کر رہا ہوں۔ فی الحال تو یہ موقر جریدہ بذریعہ رجسٹرڈ پارسل بھیجا جا رہا ہے آئندہ بذریعہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔ میرے مجموعہ کلام ''جزیرہ'' کا کوئی نسخہ میرے پاس موجود نہیں ورنہ وہ بھی بذریعہ وی پی روانہ کر دیتا۔

محترم چچا جان شبنم رومانی صاحب۔ میں آپ سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ کو شاعرہ سمجھ کر میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ عاشقانہ جذبات روانہ کر دیئے تھے۔ لیکن آپ کا رسالہ دیکھ کر اور اس میں آپ کے سفرنامہ امریکہ میں آپ کی مردانہ وجاہت سے بھرپور تصاویر دیکھ کر سخت نادم ہوا اور عش عش کر اُٹھا۔ حقیقتاً عرض کرتا ہوں کہ آپ کے کلام میں مردانگی، جرات، بے خوفی، دلیری، شجاعت، سطوت اور بھرپور طاقت موجود ہے۔ لیکن آپ کی تصویریں دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا ہوں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ سوٹ پہننے کے باوجود اتنے دبلے پتلے نظر آتے ہیں۔ براہ کرم آئندہ جب بھی امریکہ جائیں اور سفرنامہ لکھنے کے لیے تصویر کھنچوائیں تو سوٹ کے اوپر بھاری اوور کوٹ ضرور پہن لیا کریں۔ تاکہ سردی سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی تصویروں میں نظر بھی آئیں۔ آج سے مجھے اپنا بھتیجا سمجھیں اور مزید ڈائٹنگ سے پرہیز کریں۔

آپ کا سعادت مند

نیازمند

محترمہ ڈاکٹر ایم ایس ناز صاحبہ!

نیاز مند کی نیاز مندیاں قبول فرمائیں۔ عرصہ دس گیارہ سال سے مختلف رسائل وجرائد میں آپ کا نام اور مختلف مضامین وغیرہ دیکھ رہا ہوں۔ پڑھنے کا تو کوئی خاص اتفاق نہیں ہوا البتہ نام آپ کا بے حد پُرکشش محسوس ہوا۔ دن میں خواہ مخواہ بلا کسی وجہ جواز کے تین چار مرتبہ یہ نام میری زبان پر مچل اُٹھتا ہے۔ تصور ہی تصور میں آپ کو اپنا آئیڈیل بنالیا ہے اور من مندر کی سیڑھیوں پر بٹھا کر آپ کو پوجنا شروع کر دیا ہے جب رات ہوتی ہے تو کمرے کی تنہائی میں دھیرے دھیرے آواز دینے لگتا ہوں۔ ناز جی۔۔۔ او ناز آفریں۔۔۔ ناز پرور۔۔۔ نازک ادا۔۔۔ شیشہ بدن۔۔۔ آہو چشم۔۔۔ ناز۔۔۔ کہاں ہو ناز۔۔۔ ناز تم کہاں ہو۔۔۔ کس کلینک میں ہو؟ کس ہاسپٹل میں ڈاکٹر ہو؟۔۔۔ مریض تو یہاں پڑا ہے۔۔۔ تم کہاں ہو؟۔۔۔ ناز۔۔۔ ناز۔۔۔ نازو۔۔۔ میرے بے قرار ہیں بازو۔۔۔ دل میں تیر نظر کردو ترازو۔

یہ خط ایک ڈائجسٹ کی معرفت روانہ کر رہا ہوں جس میں گاہے بگاہے آپ کے مضامین چھپتے رہے ہیں۔ براہ کرم اپنی پرائیویٹ کلینک کا ایڈریس اور فون نمبر بواپسی ڈاک تحریر کریں۔ تاکہ وقت ملاقات طے کرکے اپنے تشنہ روح اور دل مضطر کو سکون دے سکوں۔

نوٹ: مجھے غلط نہ سمجھیں۔ ناز جی۔ میں سچے دل سے آپ سے محبت کرتا ہوں اور دل کی دولت آپ کے قدموں میں نچھاور کرنے کے لیے اذن باریابی کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

آپ کا مریض

نیاز مند

ناز جی!

سلام محبت۔ ڈیڑھ مہینہ بیت گیا ہے اب تک آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوگئیں نازاں؟ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے، عجیب عجیب سی بدگمانیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کبھی آپ کی پیاری اور من موہنی صورت دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے آپ کوئی عمر رسیدہ لیڈی ڈاکٹر ہوں اور میرے جتنے آپ کے کئی بیٹے ہوں۔ اسی لیے آپ نے مجھے خط کا جواب نہیں دیا۔ اگر ایسی بات ہے تو میں آپ سے پیشگی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے معاف کردیں اور میرے خط کو بھول جائیں۔ میں بھی صبر کا گھونٹ پی کر چپ ہو جاؤں گا کہ میں نے کبھی کسی ناز نامی حسینہ سے دل لگایا تھا اور جواب تک نہیں پایا تھا۔

آپ کا دل برداشتہ

نیاز مند

محترم پھوپھا جان،
ڈاکٹر ایم ایس ناز صاحب!

آداب وتسلیمات۔ آج اچانک آپ کا عتاب نامہ نازل ہوا۔ جس کے ساتھ آپ نے اپنی تصویر اور وزیٹنگ کارڈ بھی منسلک کیا ہے۔ تصویر میں ایک جواں عمر بزرگ شخصیت آنکھوں پر عینک چڑھائے بیٹھی ہے اور پورے چہرے پر بڑی روشن پیشانی چمک رہی ہے جو گدی کے پیچھے تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ خط میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ او بدبخت آدمی! میں عورت نہیں مرد ہوں اور داؤں کا ڈاکٹر نہیں عربی کا ڈاکٹر ہوں۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ کیونکہ میں نے بے خیالی میں آپ کو خط لکھ دیا تھا۔ نیت بری نہیں تھی۔ آج سے آپ میرے پھوپھا جان ہیں۔

آپ کا گنہگار

نیاز مند

- بقیہ -

''تاریخ کے مطالعے کا منفرد طریقہ''

دلاری کا ایاز کے ساتھ دہلی آنا اور اس کے گھر میں رہنا گھر والوں کو اسے ہندو نہیں بطور مسلمان ڈیل کرنا، فکر آمیز ہے۔ دلاری ایاز کے گھر والوں کے اخلاق اور حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسروں کو تبلیغ کرنے سے کہیں اثر انگیزی حسن کردار اور عمل میں ہے۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد یہ شدت سے محسوس ہوتا ہے برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست بنانے کا مطالبہ بالکل جائز اور منطقی تھا۔ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں تھیں اور ہیں اور دونوں کا اکٹھے مل کر چلنا ناممکن نظر آ رہا تھا چاہے پاکستان بنتا یا نہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ہندو، مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ جن کا رہن سہن، رسوم ورواج سب الگ ہیں۔ ایک کے ہیرو دوسرے کے دشمن ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ انگریز کی رخصتی کے بعد ہندوؤں کی اکثریت میں مسلمان ضم ہو جاتے؟ جن کے اجداد نے اس خطے پر ہزار سال سے زائد حکومت کی۔ اعتبار ساجد کو مبارک ہو۔ ان کا پیغام قارئین تک پہنچ گیا ہے۔ اور پاکستان کے موجودہ حالات سے بیزار اور حکمرانوں کی کرپشن سے اکتائے ہوئے لوگ جواب غصے میں پاکستان کی تخلیق کو ہی غلط قرار دینے لگتے ہیں وہ اس ناول کا مطالعہ ضرور کریں۔ ان کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

☆

اندر کی عورت

اعتبار ساجد

بات آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

ایک تو شکیلہ آپا مصیبت خانہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ جب دیکھو چوزے کی طرح اسے اپنی تحویل میں لے رکھا ہے، ہر تقریب اور ہر محفل میں دونوں بہنیں اکٹھی نظر آتیں۔ کسی کے گھر آنا جانا ہو، شاپنگ کا معاملہ ہو یا پکنک کا چکر ہو ہر جگہ شکیلہ آپا اس کے سر پر موجود۔ بھئی، کوئی تمہاری اٹھارہ برس کی من موہنی بہن کو کھا تو نہیں جائے گا۔ چھوڑ ابھی کر و کبھی کبھی غریب کا پیچھا۔ ماشاءاللہ بی اے کی طالبہ تھی۔ ایسی معصوم بھی نہیں تھی کہ کوئی بھگا لے جائے گا یا زبردستی چت کر دے گا۔ شکیلہ آپا کا جتنا قد کاٹھ تھا باتیں بھی انہیں کی طرح بڑے سیریس وے میں کرتی تھی۔ انہیں کی طرح زمین پر پاؤں جما کر چلتی تھی۔ انہیں کی طرح اٹھتی بیٹھتی تھی۔ میں تو ڈرتا تھا کہ بچاری پر شکیلہ آپا کا زیادہ پر چھاواں پڑ گیا تو ہاتھ سے جائے گی۔ مجھے سکون دل کی خاطر اور محنت سے رٹے ہوئے ڈائیلاگ بولنے کے لیے دوسری نبیلہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ چہرے تو اس شہر میں بہت پڑے تھے۔ ایک سے ایک مارولس، حصول کے لیے بڑا وقت درکار ہوتا ہے۔ جو خواری اور بوریت ہوتی ہے وہ الگ! ان دنوں مجھے رومانی ناولوں کا بخار چڑھا تھا۔ وحید غریب (مرحوم) کی فلمیں دیکھ دیکھ کر ماتھے پر بالوں کی ایک ترچھی پٹی بھی جما رکھی تھی جی چاہتا تھا نبیلہ تنہا مل جائے۔ بالکل وحید مراد والا ٹریٹ منٹ دوں۔ چھاتی سے لگا لوں، کھا جاؤں۔ سنسر کی دست برد سے بچ نکلنے والی امپورٹڈ فلموں کے کلائمکس سین دہراؤں۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کتنے جوشیلے محبوب سے پالا پڑا ہے۔ مگر جب تک شکیلہ آپا زندہ تھیں یہ سارے تصورات حقیقت کے قالب میں نہیں ڈھل سکتے تھے۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا کہ انہیں دھکا دے دوں۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ کر الگ ہو جائیں۔ سیدھی ہسپتال پہنچیں جتنے دن ہسپتال میں رہیں مزے آ جائیں۔ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کی راہ میں کوئی دیوار حائل نہ رہے۔ خوب ملاقاتیں رہیں اور پھر وہی امپورٹڈ فلموں والے سین۔

مگر جانے کیوں میں شکیلہ آپا کے سامنے جاتے ہی نکو بن جاتا۔ ایک تو ہمارے ہاں ''آپا'' ہی بجائے خود تسبیح پھیرنے اور رکوع و سجود کرنے والا نام ہے اس پر اگر آپا کی پرسنالٹی بھی گرینڈ ہو، وہ کسی مڈل سکول کی ہیڈ مسٹریس بھی ہو، تین چار سال سے بیوہ بھی ہوا اور زیادہ تر مکہ و مدینہ کی باتیں کرتی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے خوف نہ کھایا جائے۔ شکیلہ آپا ساڑھے چار سو بچوں پر کنٹرولنگ اتھارٹی تھیں۔ لوگ ان کی سادگی، شرافت، بیوگی اور کم گوئی کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ انہوں نے عین جوانی میں بیوہ ہونے کے باوجود دوسری شادی نہیں کی تھی کہتی تھیں اب دل ٹوٹ گیا ہے۔ جانے والا اپنے ساتھ ساری خواہشات اور جذبات لے گیا ہے۔

نبیلہ اچھی بھلی ماں باپ کے پاس رہ رہی تھی۔ بیوگی کے بعد انہوں نے اسے مستقلاً اپنے پاس بلا لیا تھا۔ شاید اس طرح وہ اپنی تنہائیوں کی تلخی کو کم کرنا چاہتی تھیں جو سکول کے ساڑھے چار سو بچوں کی کھپ شپ میں تو دل کی تہوں میں ڈوب جاتی مگر گھر آتے ہی پھر نمودار ہو جاتی۔ آکٹوپس کی طرح تنہائی کے پنجے چاروں اور سے دھاوا بول دیتے۔ لیکن نبیلہ کے آتے ہی وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگیں اور نبیلہ اپنے کالج کے لیے تانگے میں سوار ہوتیں تو میں جھٹ سے سلام داغ دیتا۔ شکیلہ آپا بڑی ہنس مکھ اور بااخلاق تھیں۔ سلاموں کے جواب بڑے مشفقانہ انداز میں دیتیں موقعہ پا کر میں ایک آدھ ہوائی بوسہ نبیلہ کی طرف بھی اچھال دیتا۔

شکیلہ آپا ہمارے کنبے کے بچوں کی استانی بھی تھیں اس لیے دونوں گھرانوں میں خاصا آنا جانا تھا یہ آزادانہ آون جاون بھی ہوائی بوسوں سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

ایک روز موقعہ پا کر میں نے کہا ''جی چاہتا ہے شکیلہ آپا کو کہیں دھکیل آؤں چپکے سے۔'' وہ لرز کر بولی ''ہائے نہیں۔ اللہ توبہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپی تو اتنی اچھی ہیں۔''

میں نے کہا ''ان کی اچھائی۔ کمبخت ہمارے ملاپ میں رکاوٹ بن رہی ہے وہ ایسا گھور گھور کے دیکھتی ہیں مجھے، جیسے کھا جائیں گی۔ شاید انہیں شک وک پڑ گیا ہے۔''

بولی ''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ منہ سے تو وہ کچھ نہیں کہتیں البتہ میری نوٹ بکیں الٹتی پلٹتی رہتی ہیں۔ آئندہ مجھے کوئی لو لیٹر نہ لکھنا پلیز۔ بس زبانی زبانی ٹھیک ہے۔''

میں نے بھی سوچا ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ محبت زبانی زبانی ٹھیک رہتی ہے جہاں تحریری ہوئی، مصیبت بنی۔ میں نے فل اسکیپ کاغذوں پر جو عشقیہ موتی بکھیر رکھے تھے وہ اگر شکیلہ آپا کی نظروں تلے آ گئے تو وہ نبیلہ کو ماں باپ کے پاس چلتا کر دیں گی۔ منٹوں سکنڈوں میں میرا اتنی چاہتوں سے بنایا ہوا تاج محل دھڑام سے نیچے آ پڑے گا۔ چنانچہ مجھے کسی متوقع عبرت ناک انجام نے محتاط کر دیا۔

مگر خدا کو میری یہ احتیاط شاید زیادہ پسند نہیں آئی۔ انہی دنوں میرے بڑے بھائی کی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ کنواری کنیاؤں اور بوڑھی خرانٹوں نے ڈھولکیں کھڑکانی شروع کیں۔ شام کو دونوں بہنیں اسی طوفان بدتمیزی میں حصہ لینے آ دھمکتیں۔ میں بہانے بہانے اندر جا کر نبیلہ کو گاتے یا ڈھولک بجاتے دیکھتا۔ اتنی پیاری لگتی کہ جی چاہتا اسے جھپا مار کر اڑا لے جاؤں۔ دور اس کمرے میں جو میرا ہے اور تنہا ہے مگر وہ بجز بٹو شکیلہ آپا بڑی الرٹ شخصیت تھی۔ ایڈی کا نگ ٹائپ مشکل تھا کہ ان دنوں ہم آنکھوں آنکھوں میں بھی کوئی بات کر سکتے۔ سماج کے پہرے بڑے سخت تھے۔ سماج جو بیوہ ہونے کے باوجود

ڈھولک ایسی شاندار بجاتا تھا کہ کیا کنواری بالیاں بجائیں گی۔ ڈھولک کی ہر تھاپ جیسے کہتی ہوئی سنائی دیتی:

میرے بھی کچھ ارمان تھے

میرے بھی کچھ ارمان تھے

بھائی صاحب کا سہرہ بندھنے کے دن جوں جوں نزدیک آ رہے تھے مہمانوں اور ہنگاموں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رشتہ داریاں ہماری بہت وسیع تھیں۔ دور دور سے بھانت بھانت کے ریوڑ اپنے لیلوں اور چوزوں کے ساتھ اس تقریب سعید میں شمولیت کے لیے آ رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی چاؤں چاؤں نے راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ کئی روز سے نبیلہ سے بھی ملاقات کا موقعہ ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ چنانچہ میرا فیڈ اپ ہونا فطری بات تھی۔ میں اس ہنگامہ ہاؤ ہو میں دعائیں مانگتا رہتا کہ "یا میرے سوہنے رب، اب ڈھولک کھڑ کانے والیوں کو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے یکسر بینائی سے محروم کر اور میری جولیٹ کو میرے کمرے میں پہنچانے کا بندوبست فرما۔ تیری عین نوازش ہوگی اور بندہ تاحیات تیرا شکر گزار رہے گا۔"

مگر ان دنوں تقدیر شاید عاشقوں کی درخواستیں اور اپیلیں پینڈنگ میں ڈال رہی تھی اس لئے کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

بارات کی روانگی سے ایک روز پہلے وہ ہنگامہ مچا کہ خدا کی پناہ۔ بارہ بجے رات تک تو میں بیاہ شادیوں کے فوک سانگ بنانے والوں کو کوستا رہا پھر خدا جانے کب نیند آ گئی۔

ساتھ کے پلنگ پر بڑے بھائی سوتے تھے۔ آج کی رات انہوں نے بیٹھک میں یاران طریقت کے ساتھ چوکڑی جمار کھی تھی چنانچہ پلنگ خالی پڑا تھا اور یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی نیند کا ماتا اس پر دھاوا بول دے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔

رات کے جانے کس پہر میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں کھڑ پڑ ہو رہی تھی کنکھیوں سے کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں بہنیں پلنگ پر سونے کا ارادہ کر رہی ہیں مگر غالباً میری موجودگی چبھ رہی ہے۔ میں آنکھ موند کے دم سادھے اپنی چارپائی پر پڑا رہا۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ پلنگ کا جو حصہ میری طرف ہے ادھر شکیلہ آپا سونے کی تیاری کر رہی ہیں اور وہ کنارہ جو مجھ سے دور ہے اُدھر نبیلہ کو سلایا جا رہا ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کاش آج کلوروفام ہوتا۔

کچھ دیر تک وہ دونوں باتیں کرتی اور کروٹیں بدلتی رہیں پھر شکیلہ آپا نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "بنو! یہ بتی بجھا دے۔ آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔"

پلنگ کا دوسرا حصہ چرچرایا۔ میری جولیٹ بتی بجھانے اٹھی تھی۔ کھٹ سے آواز آئی۔ قدموں کی چاپ میرے قریب سے گزری۔ پلنگ چرچرایا اور خاموشی۔

میں نے آنکھیں آہستہ سے کھولیں۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ کر گزرنے پر اکسانے والا اندھیرا۔ مگر نہیں، اے دل بیتاب ٹھہر! ذرا اور گہری نیند میں ڈوبنے دے سماج کو۔ پھر اپنی چارپائی سے اٹھنا، پھر نبیلہ کو جی بھر کے پیار کرنا۔ مگر ہولے ہولے بڑی آہستگی، بڑی دھیرج سے۔ ایسا نہ ہو کہ تیری بیتابیاں رنگ لائیں اور سماج جاگ پڑے۔ بارات کا ہنگامہ رسوائی کے فتنے میں تبدیل ہو جائے۔ میں ریڈیم ڈائل گھڑی میں سکینڈ کی سوئی کو چلتا ہوا دیکھتا رہا جب منٹ کی سوئی بھی ڈائل کا پورا چکر لگا کر دوبارہ نصف کے قریب پہنچی تو مجھ میں تاب ضبط نہ رہی۔ جو ہو سو ہو۔ میں آہستہ سے اٹھا پنجوں کے بل چلتا ہوا دونوں بہنوں کے پلنگ کا راؤنڈ لے کر نبیلہ کی طرف پہنچا اور دم سادھ کر کھڑا ہو گیا۔

اف اس لمحے کی بیتابی۔ دریا میرے قدموں میں رواں تھا اور میں تشنہ لب کھڑا کشمکش میں بتلا تھا۔

لرزتے ہاتھوں سے میں نے نبیلہ کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ "اوں" کہہ کر اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔ یہ خواب آلود "اوں" ضبط کے سارے بندھن توڑ گئی۔ میں نے بے ساختہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ وہ نیند میں کسمسائی مگر جب میرے ہونٹوں کی حدت اور سانسوں کی گرمی نے اسے میرے وجود کا احساس دلایا تو وہ دم سادھ کر لیٹ گئی۔

میری لرزتی ہوئی انگلیوں نے اس کا جسم ٹٹولا۔ میرا انصف بدن اس کے جسم پر جھک گیا۔ میرے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں سے "شش" کی آواز بھی نہیں نکلنے دی۔

پھر میرا جسم لرزنے لگا۔ کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ انگلیاں اس کے جسم میں پیوست ہونے لگیں۔ مگر جلد ہی میری بے تابیوں کو اندیشہ ہائے دور دراز نے آ لیا کہ ساتھ ہی شکیلہ آپا سو رہی ہیں۔

اگر وہ جاگ پڑی تو۔۔۔؟

اور اس "تو" نے مجھے گھبرا کر اٹھ کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔

میں لرزتے قدموں سے اٹھنے لگا مگر اس کے گداز بازو میری گردن کے گرد لپٹ گئے۔ اس نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیاں بڑی محبت آمیز سرگوشی میں کہا۔

"بس؟" میرے جسم میں جیسے کوئی غبارہ سا پھٹ گیا۔

یہ صاف شکیلہ آپا کی آواز تھی!

"بھٹکا ہوا راہی"

دُکھی ہوں میں بہت آقا بقولِ شاعرِ مشرق

تُو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر

گمان و وہم کی وادی میں اک بھٹکا ہوا راہی

میں ہندی تھا، ہوں پاکستانی اب مجھ کو حجازی کر

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

یہ گھر میں نے بنایا ہے

بشریٰ رحمٰن

(لاہور)

سورج ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے میں یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ یہ میرے گھر کا چھوٹا سا لان ہے۔ یہاں بیٹھ کر میں اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے درختوں کو دیکھتی ہوں۔ ان سے باتیں کرتی ہوں، ان کی باتیں سنتی ہوں۔

یہ جو سامنے کھجور کا لمبا سا درخت ہے یہ میں نے بڑے شوق سے لگایا تھا۔ ان دنوں میں اپنے دونوں بچوں کو جہانگیر کے مقبرے پر لے گئی تھی۔ مقبرے کے باہر درختوں کے جھنڈ لگے تھے۔ میں نے مالی کو بلا کر پوچھا، میں ایسے کھجور کے درخت اپنے گھر میں لگانا چاہتی ہوں۔ مجھے کچھ پودے مل جائیں گے۔ وہ بولا بی بی کھجوروں کے پودے نہیں ہوتے۔ کھجوروں کے بچے ہوتے ہیں۔

اچھا تم مجھے کھجور کا ایک بچہ دے دو۔

بی بی جی ایک بچے سے پودے نہیں اُگتے۔

تو کس طرح اُگتے ہیں۔

کھجوروں میں ایک نر ہوتا ہے اور ایک مادہ ہوتی ہے۔ آپ خواہ دس بچے لے جائیں۔ اگر ان کے اندر ایک نر بوٹا نہیں لگائیں گے تو وہ نہ زمین پکڑے گا نہ پھل دے گا۔

یہ سن کر اندر ہی اندر تو میں جل ہی گئی۔ درختوں میں بھی نر کو برتری حاصل۔۔۔اف توبہ!

تاہم میں نے فرمائش کر کے اس سے دو مادہ بچے اور ایک نر خرید لیا۔

گھر آ کر اپنے صحن کے ایک کونے میں لگا دیا۔۔۔

ان دنوں اپنے گھر کو بنانے اور سجانے کا مجھے جنون تھا۔ ایسا گھر جیسا کسی کا نہ ہو۔۔۔گھر زیرِ تعمیر تھا اور میں نے درخت اور پودے لگانے شروع کر دیئے تھے۔ ایک کنال کے گھر میں آخر کتنے درخت لگائے جا سکتے تھے۔ ایک دن میں نے جامن کی دو گٹھلیاں ذرا فاصلے پر لگا دیں۔ جب وہ پھوٹیں تو میری تمناؤں نے جشن منایا۔ آم، امردو، جامن، شہتوت اور دیسی انار کے پودے لگائے، سب درخت بن گئے۔۔۔مگر کھجور کے درخت نے مجھے مایوس کیا۔ ایک تو اتنی دیر لگائی پھر ان تین پودوں میں سے صرف ایک کی جڑ نے زمین کو قبول کیا۔ رفتہ رفتہ وہ بلند ہوتا گیا مگر اس پر خوشے کبھی نہیں لگے۔ معلوم نہیں جو بار آور ہوا، نر تھا یا مادہ تھی۔ مجھے اس سے کیا سروکار، میرے گھر میں کھجور کا ایک طویل درخت میری پہچان بنا کھڑا ہے۔۔۔

پھر زندگی کی دوڑ میں اس طرح مَیں محو ہوئی کہ ان درختوں کا نظارہ ہی نہ کر سکی۔ آج کل یہ درخت ہی میرے ہمدم و ہمراز ہیں۔ روز ڈوبتی شام مَیں انہیں دیکھا کرتی ہوں۔ جامن کی گٹھلیاں میں نے دُور دُور لگائی تھیں۔ مگر حیرت ہے جب یہ تناور درخت بنے تو ایک دوسرے میں سما گئے۔ نیچے سے یہ دو درخت ہیں لیکن اُوپر تک دیکھیں تو ایک گھنا درخت نظر آتا ہے۔ اور پھل کے موسم میں جھولیاں بھر بھر پھل دیتا ہے۔ شاید اسی کو رفاقت کہتے ہیں۔ یہ درخت انسانوں سے خوش قسمت ہیں۔ انہیں ان کی زندگی تک ایک دوسرے کی رفاقت اور سنگت نصیب ہوتی ہے۔۔۔

مگر ایک ساتھ زندگی کی ابتداء کرنے والے شوہر بیوی اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں۔۔۔

ان دونوں میں سے ایک کو ہاتھ چھڑا کر پہلے جانا پڑتا ہے۔۔۔

اور جو پیچھے رہ جاتا ہے۔۔۔وہ تنہائی کی چادر اوڑھ کے کرب کے جزیرے میں اُتر جاتا ہے۔

میں بھی کیسی دیوانی تھی۔۔۔

سہاگ رات ہی میں نے اپنے شوہر سے کہہ دیا کہ مجھے اپنا گھر چاہیے۔۔۔جس گھر میں مَیں دلہن بن کر آئی وہ کرایے کا چھوٹا سا گھر تھا۔۔۔ میری ماں کی زندگی بھی کرائے کے گھر میں گزر گئی تھی۔ ابو جی کی وفات کے بعد وہ بہوؤں کی ٹھوکریں کھاتی رہیں۔ یہی کہتی رہتی تھیں کہ اگر تمہارے ابو نے مجھے گھر بنا کر دیا ہوتا تو میری آخری عمر اذیت میں نہ گزرتی۔ اس لیے بیٹی تم شادی کے بعد اپنا گھر ضرور بنا لینا۔

میرے شوہر عدیل احمد گھر بنانے کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے ابھی ابھی پلاسٹک کے برتنوں کا ایک کارخانہ لگایا تھا۔ اس کا سارا کام خود سنبھالتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے، اپنا گھر بنانے کے بعد تکلیفیں ختم نہیں ہو جائیں گی۔ اس کے اندر بھی مسئلے سر اُٹھاتے رہیں گے۔ آرام سے کرایے کے گھر میں رہو۔ کیونکہ یہاں صرف کرایہ ادا کرنے کا مسئلہ ہوگا۔

مگر میں مانتی ہی نہیں تھی۔ مجھے بس ایک ہی دھن تھی کہ میرا اپنا گھر ہو۔ جسے مَیں میرا گھر کہہ سکوں جہاں سے مجھے کوئی بیدخل نہ کر سکے۔ عورت کو مرد کی محبت کا یقین نہیں ہوتا۔ مگر اپنے ذاتی گھر کا بڑا آسرا ہوتا ہے۔ اور اسی آسرے کے سہارے وہ اپنا بڑھاپا گزار لیتی ہے۔ اور گھر کو اپنی بہت بڑی سیکورٹی سمجھتی ہے۔

جب میرا بیٹا کفیل احمد پیدا ہوا تو میں نے اپنا تقاضا شدید کر دیا۔ تو کہتے اب تمہیں کیا فکر ہے۔ بڑھاپے میں بیٹے کے گھر میں رہ لینا۔ بیٹے سے بڑھ کر کون سہارا ہوتا ہے۔

اور میں چڑ جاتی۔ میں انہیں ہمیشہ اپنی امی کی مثال پیش کرتی۔ جن کے تین بیٹے تھے۔ مگر کوئی بہو انہیں اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں ہوتی تھی۔

کبھی کبھی وہ بھی جز بز ہو جاتے اور کہتے تھے۔ تمہارا خیال ہے تم بھی اپنی امی کی طرح جوانی میں بیوہ ہو جاؤ گی۔۔۔

کیا بیوگی کا شوق تم جہیز میں لائی ہو۔

جب انہوں نے اس قسم کے طعنے دینے شروع کیے تو میں سنّاٹے میں آ گئی۔ چھپ چھپ کر کئی دن تک روتی رہی کہ یہ شوہر کس طرح عورت کی ایک معصوم خواہش کو تھپڑ بنا کر اس کے منہ پر مار دیتے ہیں۔ دو سال بعد میری بیٹی کا ملہ پیدا ہوگئی۔ میں بچوں میں مگن ہوگئی۔ اپنی اس دیرینہ خواہش کو میں نے دانت کے درد کی طرح صبر کی روئی تلے دبا دیا تھا۔ لوگوں کے گھر تعمیر ہوتے ہوئے دیکھتی۔ تو بس آہ بھر کر رہ جاتی۔۔۔

عدیل نے مجھے تقاضا کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

میرا بیٹا دس سال کا ہو گیا۔ اور بیٹی چھ سال کی تھی۔ دونوں سکول جانے لگے تھے۔ میں باقاعدہ انہیں سکول چھوڑنے جاتی۔ سکول سے لینے جاتی۔ مگر مجھے چپ لگ گئی تھی۔

ایک دن میں بچوں کو سکول چھوڑ کر آئی تو میرے شوہر گھر ہی بیٹھے تھے۔

میں نے پوچھا۔۔۔ آپ ابھی تک دفتر نہیں گئے۔۔۔

وہ بولے کچھ کاغذات دیکھنا تھے۔ اسی لیے دیر ہوگئی۔

پھر مجھے روک کر بولے۔ تم نے اپنا پرانا مطالبہ دوہرانا ہی بند کر دیا ہے۔ اتنے سالوں سے خاموش ہو۔ میں بھول گئی ہوں میری کوئی خواہش تھی۔۔۔ میں بولی۔

اچھا۔۔۔ وہ مصنوعی حیرت سے بولے۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ۔۔۔

کوئی بات نہیں۔۔۔ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ بہت سے لوگ گھر بنائے بغیر بھی مر جاتے ہیں۔ میرا وقت بھی گزر جائے گا۔۔۔ میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ اور جانے لگی۔ انہوں نے مجھے بازو سے کھینچ کے پاس بٹھا لیا اور ایک بڑا سا کاغذ میرے آگے کر کے بولے۔۔۔

یہ دیکھو۔۔۔ یہ تمہارے گھر کے کاغذات ہیں۔ میں نے تمہارے نام پر ایک ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک کنال کا پلاٹ خرید لیا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو اپنی جگہ ٹھٹھک گئے۔۔۔ میں آنکھیں صاف کر کے رجسٹری کے اس کاغذ کو دیکھنے لگی۔۔۔

پھر انہوں نے ایک دوسرا سفید کاغذ نکالا۔ بولے یہ دیکھو تمہارے گھر کا نقشہ میں نے پاس کروالیا ہے۔

نقشہ بھی پاس کروالیا اور مجھے بتایا تک نہیں؟

ہاں۔۔۔ وہ محبت سے بولے۔۔۔ نوری! ایک دن میں نے تمہیں بہت غلط بات کہہ دی تھی۔ اس کے بعد تم چپ ہوگئیں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ تمہارے صبر نے مجھے بہت بیکل رکھا۔ میں بہت بے چین رہا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ بہت محنت کروں گا۔ جب تک تمہارے لیے پلاٹ خرید نہیں لوں گا۔ تمہیں بتاؤں گا نہیں۔۔۔

تمہارا صبر بہت زور آور نکلا۔۔۔

اب میں خوشی کے مارے رو رہی تھی۔۔۔ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

یہ نقشہ ہے۔ کل میں ٹھیکیدار کو بلواؤں گا۔ اس میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں کروالینا۔

اور اپنا گھر بنوانا شروع کر دو۔ یہ کام میرا نہیں ہے نہ مجھے فرصت ہے۔

اس رات مجھے نیند ہی نہیں آئی۔۔۔ ساری رات میں اپنے نئے گھر کے خواب دیکھتی رہی۔

صبح اٹھ کر میں نے عدیل سے پوچھا۔

آپ نے یہ زمین میرے نام پہ کیوں خریدی۔ آپ کو اپنے نام سے خریدنی چاہیے تھی۔

وہ بولے۔۔۔

نہیں۔۔۔ یہ تمہاری تمنا ہے۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ میں تمہارے لیے بنوا رہا ہوں۔ یہ تمہارے نام ہی ہونا چاہیے۔ میں نے کہا مجھے تو بس ایک گھر چاہیے تھا بھلے ہی وہ آپ کے نام ہو۔۔۔ تب بھی میرا ہی ہوگا نا؟

وہ بولے۔۔۔ میرا خیال ہے گھر عورت کے نام پر ہی بنانا چاہیے۔ ہم مرد ایک وفا شعار عورت کو گھر کے علاوہ دے ہی کیا سکتے ہیں۔ اور پھر وہ شرارت سے بولے۔۔۔ اگر کبھی مرد کی نیت بدل جائے تو کم از کم وہ گھر تو عورت کے پاس رہ جائے گا۔۔۔

آپ نے ٹھیک کہا ہے مرد کی نیت بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ مگر بڑی بدنصیب ہوتی ہے جو ایک گھر کے بدلے شوہر سے دستبردار ہو جاتی ہے۔

مگر جب شوہر کو رب بلا لے تب تو دستبردار۔۔۔

نہیں عدیل! میں نے اللہ سے کہہ رکھا ہے میں سہاگن مرنا چاہتی ہوں۔

پتہ نہیں تم عورتوں کو محاورے گھڑنے کا چسکا کیوں ہوتا ہے؟

وہ دفتر چلے گئے۔ اور میری زندگی ایک مشن میں مصروف ہوگئی۔

سیمنٹ، سریا، ماربل، بجری اور بازاروں کے چکر۔۔۔ ٹھیکیدار سے سر کھپائی۔۔۔

صبح بچوں کو سکول چھوڑ کر سائٹ پر چلی جاتی۔ اس ایک سال میں مجھے اندازہ ہوا کہ گھر تعمیر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ اسی لیے تو شوہر حضرات یہ کام بیویوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کشٹ میں ایک روحانی خوشی بھی شامل ہوتی ہے۔۔۔ اپنا گھر۔۔۔

ہر عورت کو ایک گھر درکار ہوتا ہے۔ جسے وہ اپنا کہہ سکے۔

گھر کی تعمیر کے ساتھ ہی میں نے لان میں پھلوں کے درخت لگانے شروع کر دیئے۔ مجھے شوق تھا کہ اس چھوٹے سے گھر میں موسم کے ہر پھل

کا ایک درخت لگایا جائے۔۔۔آم، امرود، انار، شہتوت، مالٹا، سنگترہ۔۔۔تب نرسریوں کے چکر لگاتے ہوئے میرے علم میں اضافہ ہوا۔۔۔دیکھتے دیکھتے یہ پودے درخت بن گئے۔اوران پر پھل آنے لگے۔۔۔

وقت گزرنے کا پتہ ہی کب چلتا ہے۔ بچے جوان ہوتے ہیں تو احساس ہوتا ہے۔عدیل نے دن رات کی محنت سے اپنی فیکٹری بڑی کر لی تھی۔ اب وہ کفیل کو مزید تعلیم کے لیے جاپان بھیجنا چاہتے تھے تا کہ وہ واپس آ کر اسے جدید خطوط پر استوار کر سکے۔

میں ہر ماں کی طرح اسے بیرون ملک بھیجنے کی مخالف تھی۔ چاہتی تھی اس کی شادی کر کے اسے اپنے پاس ہی رکھوں۔مگر عدیل کا خیال تھا کیرئیر شادی سے مقدم ہے۔۔۔

بال بچوں میں مگن ہو کر آدمی اپنے آدرش بھول جاتا ہے۔۔۔کفیل جاپان چلا گیا۔۔۔

کاملہ نے بی اے کر لیا تھا۔ایک بھلا سا رشتہ آیا۔لڑکا دبئی کے ایک بینک میں ملازم تھا۔ہم نے اس کی شادی کر دی۔۔۔وہ گھر جو میں نے آرزوؤں کی بھٹی جلا کر بنایا تھا اس میں ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔۔۔اور کفیل کی شادی کے خواب دیکھنے لگے۔۔۔

ایک سال کے بعد کفیل نے ہمیں اطلاع دی کہ اس نے ایک جاپانی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔

کیوں۔۔۔؟ اولاد کے آگے کیوں رکھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

وہ کہتا رہا۔ یہاں آسودہ زندگی گزارنے کے لیے جاپانی لڑکی سے شادی کرنی پڑتی ہے۔

یہ بڑے امیر باپ کی لڑکی ہے۔اس کی وجہ سے رہائش اور آسائش کا ہر سامان مہیا ہو گیا ہے۔مگر میں ٹریننگ ختم ہوتے ہی پاکستان واپس آ جاؤں گا۔ اور اپنی بیوی سومیکا کو بھی لے آؤں گا۔۔۔

میں اسے یقین نہ دلا سکی کہ جاپانی لڑکی میں وہ سحر ہے کہ خود تو اپنے مرکز سے دور نہیں ہوتی مگر شوہر کو اپنی جڑوں سے الگ کر دیتی ہے۔۔۔واپس جانے کے قابل چھوڑتی ہی نہیں۔۔۔

ایک دن جب عدیل دفتر سے واپس آ کر موٹر سے باہر نکل رہے تھے تو میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ عدیل کی کمر جھک گئی ہے۔سر کے سارے بال سفید ہو گئے ہیں۔عدیل تھکے تھکے اور مضمحل نظر آ رہے تھے۔

میں گھبرا گئی۔میں نے پوچھا خیر تو ہے۔۔۔

سوگواری سے مسکرائے اور بولے۔۔۔بڑھاپا تو آنا ہے۔۔۔

مگر اتنی جلدی؟

بندہ اسی فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ میں بوڑھا نہیں ہو سکتا۔اگر موٹر کے انجن کی معیاد ہے تو بندے کی معیاد کیوں نہیں ہے۔۔۔؟

پانچ سال گزرنے کے بعد جب کفیل نے بڑے سلیقے سے بتا دیا کہ اس کے سسر کی اپنی ایک فیکٹری ہے اور میں اس کی فیکٹری میں ہی کام کروں گا۔ میری دو بچیاں ہو گئی ہیں۔

مجھے یہاں رہ کر ان کی تعلیم کا خرچہ بھی اُٹھانا ہے۔۔۔

اس رات عدیل کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں انہیں ہسپتال لے گئی تھی اور رو رو کر کفیل کو واسطے دیئے تھے کہ وہ آ جائے۔۔۔

وہ آیا تھا، بس پانچ دن کے لیے۔۔۔کیونکہ وہ اس سے زیادہ چھٹیاں نہیں کر سکتا تھا۔ چار دن عدیل کے ساتھ ہسپتال میں رہا۔ پانچویں دن چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد عدیل کو دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا۔اور وہ دل کی دل میں لے کر دل کی بازی ہار گئے۔ میں نے کفیل کو فون کر کے بلایا۔

اس نے کہا۔ ماما! کیا میرے آنے سے پاپا زندہ ہو جائیں گے۔اور یہ سب فرسودہ خیالات ہیں کہ آخری بار ان کا منہ دیکھ جاؤ۔ میں انہیں ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر آیا تھا۔

اور میں ان کی وہی زندہ صورت اپنے ذہن میں رکھنا چاہتا ہوں۔

البتہ کاملہ فوراً آ گئی تھی۔ اور پورا مہینہ میرے ساتھ رہی تھی۔۔۔ ہر طرح سے میری دلجوئی کرتی رہی تھی۔۔۔اور جاتے وقت اس نے بھی کہہ دیا تھا۔ ماما اسی خاطر عورتیں بیٹے مانگتی ہیں جو بڑھاپے میں ان کا سہارا نہیں بن سکتے۔۔۔؟ سبھی ماں باپ بیٹا مانگتے ہیں۔ یہ سوچے بنا کہ بیٹے کی اپنی زندگی بھی ہوتی ہے۔۔۔

اس نے کہا تھا اب آپ تنہا رہنے کی عادت ڈالیں۔ میں کتنے دن اپنا گھر بار چھوڑ کر آپ کے پاس رہوں گی۔

وہ گھر جو میری تمنا کی معراج تھا اور جسے تعمیر کرنے میں مَیں نے اپنی جوانی کے شب و روز صرف کر دیئے تھے۔۔۔ وہ میری تنہائی کا مذاق بنا کھڑا تھا۔۔۔سوچ کر تو اس لیے گھر بنایا تھا کہ جنم جنم اس میں رہیں گے۔۔۔مگر یہ کون جانتا تھا جب جنم ایک ساتھ نہیں ہوتا تو مرن ایک ساتھ کیونکر ہو سکتا ہے۔ رسمیں قسمیں ایک طرف، ایک کو تو جانا پڑتا ہے۔۔۔اور جو پیچھے رہ جاتا ہے۔ اُسے مر مر کے جینا پڑتا ہے۔

میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اس گھر کو بنانے اور سجانے میں صرف کیا۔ اس خیال سے کہ بڑھاپے میں ایک دوسرے کی رفاقت میں باتیں کیا کریں گے۔

عدیل نے اپنی جوانی کا خوبصورت وقت فیکٹری کو دے دیا کہ جب بیٹا آ کر سنبھال لے گا۔ تو ہم دونوں بوڑھی، بوڑھا اطمینان سے ایک دوسرے کی صحبت میں رہیں گے۔۔۔

کیا ہر سوچی ہوئی بات پوری ہو جاتی ہے؟

سورج ڈوبنے سے ذرا دیر پہلے میں یہاں اس سرسبز لان میں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ان درختوں سے باتیں کرتی ہوں۔ان پھولوں کو اپنی کہانی سناتی ہوں۔

اگر ہم زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے، اگر ہم وقت اور جوانی کو ہی سب سے بڑی نعمت سمجھتے۔۔۔اگر ہم چھوڑ کر جانے والی چیزوں کو مقصودِ حیات نہ بناتے۔۔۔اگر ہم ایک دوسرے کو جی بھر کر دیکھتے رہتے۔۔۔اگر ہم ایک دوسرے کی ہی سنتے رہتے۔۔۔

اگر۔۔۔؟ کہاں آ کے زندگی کا راستہ روک لیتا ہے۔

ایک دن کفیل کا فون آیا۔ بولا، ماما کب تک ایسی باتیں سوچ سوچ کر کڑھتی رہیں گی۔

آپ یہ گھر بیچ دیں اور میرے پاس آ جائیں۔

تمہارے پاس کیوں۔۔۔؟

میری بچیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ سومیکا اور میں دونوں جاب پر جاتے ہیں۔ کم از کم بچیاں آپ کی تحویل میں رہیں گی۔ اور ہم دونوں کو بھی اطمینان ہوگا۔

میں نے کتنے ارمانوں سے یہ گھر بنایا تھا۔

بس اس عمر میں اب ارمانوں کی بات کرنا چھوڑ دیں۔ جتنا بھی وقت ہے ہمارے ساتھ گزاریں۔

مگر یہ گھر خریدے گا کون۔۔۔؟

وہ ہے نا آپ کی لاڈلی کاملہ۔۔۔اس کا شوہر بینک میں ہے۔ اسے کہیں وہ خرید لے گا۔ کاملہ کی رقم اس کو دے دیں اور میرا حصہ مجھے دے دیں۔

کتنی جلدی میرے بیٹے نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ ابھی تو اس گھر کو بنانے کی تھکن بھی دور نہیں ہوئی تھی۔

میں نے درد میں ڈوب کر یہ بات کاملہ کو بتائی۔۔۔

وہ ہمدردی کرنے کی بجائے چہک اُٹھی۔۔۔

میرا شوہر کیوں خریدے یہ پرانا گھر۔۔۔؟ ہم آئندہ سال دبئی میں نیا گھر خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھیا سے کہیں اس کے پاس بہت سرمایا ہے وہ خود یہ گھر خرید لے۔۔۔

پھر بولی۔۔۔

دیکھنا ماما! اس کی باتوں میں نہ آ جانا۔ کہیں پورا گھر اس کے نام نہ لگا دینا۔ وہ تو آپ کے جگر کا ٹکڑا ہے نا؟

سال بھر سوچنے کے بعد اور درختوں پودوں سے باتیں کرنے کے بعد میں نے سوچا، میں یہ گھر بیچ دوں۔ خود ایک کمرے کا فلیٹ خرید کر اس میں منتقل ہو جاؤں۔ بچوں کے پیسے ان کو دے دوں تا کہ روز کی چیخ چیخ ختم ہو۔۔۔

ایک دن پراپرٹی ڈیلر ایک بندے کے ساتھ آ گیا۔

یہ گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔

دکھا دو ان کو۔۔۔میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

اگلے دن پراپرٹی ڈیلر نے فون کر کے کہا۔

گھر ان کو بہت پسند آیا ہے۔ یہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

وہ آدمی میرے سامنے بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا۔

میری ساری زندگی مڈل ایسٹ میں گزری ہے۔ میری بیوی کو بہت تمنا تھی کہ میں اسے ایک گھر بنا کے دوں اور میں ہمیشہ یہ کہتا رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان میں چل کر تمہیں تمہارے نام کا گھر بنا دوں گا۔۔۔وہ رکا۔

گذشتہ سال اچانک پتہ چلا کہ اسے کینسر ہو گیا ہے۔ اور اس کی بھی آخری سٹیج ہے۔ اب میں اسے پاکستان لا کر ایک گھر تحفے کے طور پر دینا چاہتا ہوں۔ اس کی اس خواہش کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا گھر مجھے اس کے لیے بہت پسند آیا ہے۔۔۔

میں نے یہ گھر اس لیے بنایا تھا کہ دمِ آخر تک اس میں عدیل کے ساتھ رہوں گی۔ اور اب میں یہ گھر کسی دوسری عورت کے نام لگا دوں۔۔۔جو دمِ آخر ایک گھر ہی کی تمنائی ہے۔

اور اس کا شوہر اس کے مرنے سے پہلے اس کی خواہش پوری کر کے سرخرو ہونا چاہتا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ اس گھر میں اکیلا رہ جائے گا۔ اور میری طرح درختوں پودوں سے باتیں کیا کرے گا۔

خدا جانے کون کس لیے گھر بناتا ہے کون رہنے آ جاتا ہے۔

پھر وہ شخص غائب ہو گیا۔۔۔شاید اپنی بیوی کو لینے گیا ہوگا۔

چھ ماہ کے بعد پھر نمودار ہوا۔

پراپرٹی ڈیلر کا فون آیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

میں نے بلا لیا۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُداس اور ٹوٹا ہوا۔۔۔

بیٹھئے۔۔۔

وہ بیٹھ گیا۔

میں اپنی بیوی کو ہسپتال میں چھوڑ کر آیا تھا۔ اچانک اس کی حالت بگڑ گئی۔

اطلاع ملنے پر میں فوراً چلا گیا۔۔۔مگر وہ کومے میں جا چکی تھی۔۔۔

ایک مہینہ اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ اس نے میری ایک نہ سنی۔۔۔ چلی گئی۔ میں اسے یہ بھی نہ بتا سکا کہ میں نے اس کے لیے ایک بہت خوبصورت گھر تلاش کر لیا ہے۔

اور۔۔۔بہت افسوس ہوا۔

اس لیے آپ کو بتائے بغیر چلا گیا۔۔۔

آپ کی۔۔۔آپ کی۔۔۔کوئی اولاد۔۔۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

ایک بیٹا تھا۔۔۔

تھا کیا مطلب۔۔۔؟

عرصہ ہوا سب کچھ لے کر ہم سے الگ ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں کہاں ہے۔ کس دیس میں ہے۔۔۔

اسی کے صدمے نے بتول کو بیمار کر دیا اور وہ اسے پکارتی پکارتی چلی گئی۔

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجیے

سوکھے گلاب

ناصر بغدادی
(کینیڈا)

ٹیکسی گھر کے سامنے کھڑی تھی، اور چھوٹے چچا ایک نوکر کی مدد سے سامان اُتار رہے تھے۔ قریب سے شہلا نے یہ نظارہ دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گئی۔ اُس کے ناپختہ ذہن میں خیالات لاوے کی طرح کھولنے لگے۔ اُس نے سوچا یہ سامان کس کا ہے؟ چھوٹے چچا کا تو نہیں ہوسکتا۔ وہ تو خود گھر کے ایک فرد ہیں۔ پھر۔۔۔ جب وہ قیاس آرائی کی گتھیاں سلجھا نہ سکی تو گردن کو جھٹکا دیتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی۔

وہ ایک چھ سالہ گڑیا جیسی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ قدرت نے اسے حسن اور معصومیت بخشنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا تھا مگر تقدیر کے حوالے سے وہ ایک ایسا ٹوٹا ہوا ستارہ تھی جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اُس کا باپ اُس کی پیدائش سے ایک مہینہ قبل ہی اپنی پہلی اولاد کو دیکھنے کی حسرت دل میں لئے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ کچھ چیزوں کو سمجھنے کا شعور آیا تو اُس نے اپنے باپ کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ ایک بہت ہی خوبصورت جوان تھا۔ اُس کے دمکتے چہرے، اُس کے ہونٹوں کی پُرکشش مسکراہٹ نے جیسے اُس کے باب میں چار چاند لگا دیئے تھے! اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے باپ کی تصویر کو دیکھتی ہی رہے۔ پھر اُس نے اپنی ماں سے کہا تھا:

''ماں۔ میرے ابّا کتنے حسین ہیں! کیا وہ پھر نہیں آسکتے؟''

وہ پھر انہماک سے تصویر کو دیکھنے لگی تھی۔ اُسے لگا کہ اُس کا باپ اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ مگر جلد ہی اُس کی یکسوئی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اُس کے کانوں نے ایک سسکی کی آواز سنی تھی، اُس نے دیکھا اُس کی ماں کی بڑی بڑی کٹورے جیسی آنکھیں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطروں سے لبریز ہو کر چھلک رہی تھیں۔ اُس کا معصوم ذہن چکرانے لگا۔ ماں کے اس طرح رونے نے اُسے حیران کر دیا تھا۔ وہ بھی بار ہا رو چکی تھی مگر اس وقت جب اُس کی کوئی فرمائش پوری نہیں ہوئی تھی یا کسی چوٹ کی وجہ سے اُسے تکلیف پہونچی تھی۔ مگر اُس کی ماں کو تو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ پھر اُس کے یوں رونے کی کیا وجہ تھی؟ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر روتے ہوئے اُسے اپنی ماں بہت خوبصورت لگی۔ وہ تو تھی بھی چاند کا ٹکڑا۔۔۔ سورج کی کرن۔۔۔ شہلا کے نزدیک اُس کی ماں کا دنیا میں کوئی جواب نہ تھا۔

اُن کا خاندان کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اتنے بڑے گھر میں صرف چھ افراد رہتے تھے۔ اُس کی دادی تن و توش اور جسامت کے لحاظ غیر معمولی تھیں مگر اُن کے جسم کے ہر حصے سے بڑھاپا ٹپکتا تھا۔ جھرّیوں بھرے چہرے سے سختی اور کرختگی نمایاں تھی۔ بال روئی کے گالے کی طرح سفید تھے بھنویں برائے نام رہ گئیں تھیں۔ تقریباً تین چوتھائی بال گر چکے تھے مگر مزاج کی سخت گیری میں اُن کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شہلا کو بعض اوقات اُن پر بہت غصہ آتا تھا کیونکہ وہ اُس کی ماں کو بلاوجہ ہی ڈانٹتی رہتی تھیں مگر اتنا کچھ کہنے کے باوجود اُس کی ماں ہمیشہ چپ چاپ ہی رہتی تھی کبھی اُس نے احتجاجاً بھی ایک لفظ نہیں کہا تھا مگر ایسے موقعوں پر اُس کے چہرے کی رنگت بالکل بدل جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی رو پڑے گی۔

دادا، دادی کے بالکل برعکس تھے۔ دھان پان سے آدمی تھے۔ شاید ہوا کا ایک زوردار جھکّڑ انہیں زمین بوس کرسکتا تھا۔ شہلا نے اُن کو بہت کم بات چیت کرتے دیکھا تھا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کی قوتِ گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ بس وہ خاموش خلاؤں میں گھورتے رہتے ہیں۔ نہ جانے کیا بات تھی اُن کو سوکھے پھولوں سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ جب گلدان میں پھول سوکھ جاتے تو وہ بہت دیر تک اُن کو ہاتھ میں لئے گھورتے رہتے، اور پھر آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیتے جیسے ان پھولوں کا خود پے موازنہ کر رہے ہوں۔ اُن کو شہلا سے بہت محبت تھی۔ جب کبھی وہ اُن کے پاس جاتی تو وہ اُس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے اور منہ ہی منہ میں کچھ غیر مربوط الفاظ بڑبڑانے لگتے۔۔۔ بڑے چچا بڑے عجیب و غریب تھے، بعض مرتبہ کئی دنوں تک اُن کی صورت نظر نہیں آتی تھی، اور پھر کسی صبح کو سورج نکلنے سے پہلے ہی اچانک میلے اور گرد آلود کپڑوں میں گھر میں داخل ہوتے، اور آتے ہی سب سے پہلے شہلا کی پیشانی چوم لیتے۔ اُن کے کپڑوں کی بدبو سے اُس کا معصوم ذہن پھٹنے لگتا۔ اور رہ گئے چھوٹے چچا تو وہ کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شہلا ایک مرتبہ پھر ٹھٹک گئی۔ بڑے چچا ایک نوجوان سے مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ آدمی اجنبی تھا اور شہلا نے اس سے پہلے کبھی اُس کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر اُس کو دیکھ کر شہلا کے دل میں ناپسندیدگی کا جذبہ بیدار نہیں ہوا بلکہ اُس کی موجودگی نے یکلخت شہلا کے اندرون میں بے حد لطیف احساسات کو جنم دیا۔ اُس کے چہرے بشرے پر خوشگوار متانت براجمان تھی، اور لباس کے معاملے میں بھی وہ نستعلیق ذوق کا حامل نظر آتا تھا۔ سینے پر جھولتی ہوئی ٹائی کو دیکھ کر اُس کو اپنے باپ کی تصویر یاد آ گئی۔

''اسکول سے آ گئی ہو بیٹی؟'' اُس کو دیکھ کر بڑے چچا نے کہا۔ اجنبی نے اُس کو سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر بڑے چچا سے کہا، ''کیا یہ اطہر کی بیٹی ہے؟''

بڑے چچا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اور پھر اُس اجنبی کے چہرے پر عجیب سا رنگ بکھر گیا۔ اس نے ایک بار پھر شہلا کو غور سے دیکھا اور پیار بھرے انداز میں اُس کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ شہلا کچھ ٹھٹکی، کچھ جھجکی اور کچھ شرمائی، کچھ بھاری ہوگئی۔ اور شہلا خود بخود کھنچتی ہوئی اُس کے پاس پہنچ گئی۔

اُس کے ہاتھ کا ملائم لمس شہلا نے اپنی پیشانی پر محسوس کیا، پھر گالوں پر محسوس کیا۔ وہ ایک نئے جہاں کی رنگینیوں میں کھوگئی۔

بعد میں اُسے پتہ چلا کہ نئے چچا ابّا کے بچپن کے ساتھی اور کلاس فیلو تھے۔ ایک جان دو قالب تھے۔ ابّا کی موت کا انہیں اس قدر دکھ ہوا تھا کہ تین دن تک وہ روتے رہے تھے۔ اور کھانے کا ایک دانہ حلق میں نہیں ڈالا تھا۔ جب دکھ کا موسم رخصت ہوا تو وہ ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر چلے گئے وار آج پورے چھ سال بعد ایک بار پھر اُنہوں نے اس شہر میں قدم رکھا تھا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ مکان ملنے تک کسی ہوٹل میں رہیں گے مگر بڑے چچا اُنہیں زبردستی یہاں لے آئے۔

شہلا بہت جلد اُن سے گھُل مل گئی۔

نئے چچا کے پاس خوبصورت تصویروں کی بہت ساری کتابیں تھیں۔ جب شہلا اُن کے کمرے میں جاتی تو وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ اُس کو دونوں ہاتھوں میں لے کر خلاء میں جھولا جھلاتے۔ مٹھائیاں اور ٹافیاں دیتے، اور تصویروں کی کتابیں اُس کے سامنے رکھ کر کہتے کہ وہ اُن سے اپنا دل بہلائے۔ اور کبھی وہ خود ہی سمجھاتے کہ یہ نیا گرا جھیل ہے، یہ ایتھنز کا بت ہے، یہ ابوالہول ہے۔ مگر وہ اتنی سمجھدار نہ تھی کہ سمجھ سکتی!!

ایک دن وہ دوپہر کا کھانا ختم کر کے اُن کے پاس پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ وہ ابھی تک کھانے میں مصروف ہیں۔ وہ اُن کے قریب بیٹھ کر بغور اُن کے کھانے کے انداز کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے شہلا سے پوچھا کہ اُس کو کھانے میں کیا چیز زیادہ پسند ہے۔

''انڈے'' اُس نے اتنی جلدی سے کہا جیسے اُس کے پوچھنے کی منتظر تھی۔ وہ یہ سن کر دھیرے سے مسکرائے، اور ایک اُبلا ہوا انڈہ اٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''اور آپ کو کیا پسند ہے؟'' اُس نے انڈہ کھاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے بھی انڈے پسند ہیں'' وہ پھر مسکرائے۔ دونوں کی پسند کو مشترک پا کر وہ بہت خوش ہوئی۔

''میں امی سے جا کر کہتی ہوں''

''نہ۔۔۔ خدارا مت کہنا'' وہ اُس کو روکتے رہے مگر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اُس دن سے گھر میں ضرورت سے زیادہ انڈے آنے لگے۔

گھر میں ایک دو دو نہیں بلکہ کئی نوکر تھے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اُس کی ماں خود ہی نئے چچا کا کمرہ صاف کرتی تھی۔ وہ بہت لاپرواہ واقع ہوئے تھے۔ جب وہ کمرے سے نکلتے تو سارا کمرہ کباڑ خانہ دکھائی دیتا تھا۔ ہر شے اِدھر اُدھر بکھری ہوئی۔ اُن کے جاتے ہی امّی نہایت انہماک اور توجہ سے اُن کے کمرے کو ڈرائی کلین کیے ہوئے کپڑوں سے زیادہ صاف وشفاف بنا کر رکھ دیتیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ مرکز سے ہٹ جانے والی اشیاء کو کس طرح اُن کی اصلی جگہوں پر دوبارہ رکھا جا سکتا ہے۔ ہینگرز کے کپڑوں کو ریک پر یا کہیں اور دیکھ کر انہیں پھر سے ہینگرز پر لٹکا دیا جاتا۔ بستر پر بکھری ہوئی کتابیں ایک مرتبہ ریک کی زینت بن جاتیں، ہر چیز دوبارہ اپنے مرکز پر آ کر تھم جانے میں قطعاً تاخیر سے کام نہ لیتی تھی۔ گزشتہ رات نئے چچا کی آمد سے پہلے کمرہ جس طرح نظر آتا تھا، صبح اُن کے جانے کے بعد امّی اُسے پھر اُسی شکل میں بدل دیتی تھیں۔ شہلا نے کئی بار اُنہیں ٹوکا بھی تھا۔

''امّی۔ آپ کیوں کام کرتی ہیں؟ گھر میں نوکر بھی تو ہیں۔''

''بیٹی۔ تمہارے چچا اس گھر میں مہمان ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اُن کی کوئی چیز چوری ہو جائے۔''

تنہائی میں وہ شہلا سے عجیب وغریب باتیں کرتے تھے۔ بعض باتیں تو وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی مگر اس کے باوجود اُس کو وہ باتیں اچھی لگتیں۔ جب وہ باتیں کرتے تو وہ سنتی کم اور اُن کے چہرے کو زیادہ غور سے دیکھتی رہتی۔ اور جب وہ اچانک کوئی سوال کر دیتے تو وہ چونک جاتی اور تب وہ ہنس کر خود ہی اپنا سوال دہرا دیتے۔

''شہلا تمہاری آنکھیں بالکل تمہارے ڈیڈی جیسی ہیں۔'' وہ کہتے ''مگر یہ خوب صورت ناک۔۔۔ یقیناً تم نے اپنی امّی سے حاصل کی ہوں گی اور یہ پتلے پتلے ہونٹ بھی۔''

''کیا آپ نے میری امی کو نہیں دیکھا؟'' اس پر وہ چپ ہو جاتے۔

''آیئے۔ میں آپ کو اپنی امّی دکھاؤں۔'' وہ معصومانہ انداز میں اس طرح کہتی جیسے امّی نہ ہو، کوئی جاپانی گڑیا ہو۔ وہ ہنس دیتے مگر جب اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں اٹھانے لگتی تو وہ گھبرا جاتے۔

''نہیں شہلا۔ میں اس وقت وہاں نہیں جا سکتا۔ پھر کس دن سہی''

عین اسی لمحے شہلا بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ نئے چچا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ اُن کا چہرہ مختلف النوع احساسات کے زیر اثر ہر پل رنگ بدلنے لگا۔ کچھ دیر بعد شہلا ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور نئے چچا کے ہاتھ میں کوئی چیز رکھ کر بولی۔

''دیکھ لیجیے۔ یہ ہیں میری امّی''

نئے چچا نے ایک نظر فوٹو پر ڈالی اور گڑ بڑا کر اُسے شہلا کو واپس کر دیا۔

''شہلا۔ فوٹو لے جاؤ۔ اور کسی سے یہ بات نہ کہنا۔'' معصوم لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔

شہلا کو ایک بات بڑی عجیب معلوم ہوئی تھی۔ جب تنہائی ہوتی تو وہ گھر کے حوالے سے اُس سے باتیں کرتے تھے۔ اُس کو قریب بلا کر گلے سے لگاتے، اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے۔ نئے چچا ہی نے اُس کو ڈیڈی کے متعلق بہت ساری نئی باتیں بتائیں تھیں۔ ایسے موقعوں پر نئے چچا کا چہرہ دھواں دھواں دکھائی دیتا جیسے اُن سے اُن کی کوئی قیمتی شے چھین لی گئی ہو۔ لیکن بڑے چچا یا کسی اور کے سامنے ان کا طرزِ عمل بالکل ہی مختلف ہوتا۔ اُن کا روّیہ اس قدر محتاط

ہوتا کہ وہ اُسے نئے چچا کی بجائے کوئی اور ہی شخص نظر آتے۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ فکر مندانہ انداز سے یوں شہلا کو دیکھتے جیسے انہیں خوف ہو کہ یہ معصوم لڑکی کہیں اُن کی باتیں دوسروں کے گوش گزار نہ کر دے!

وہ ایک بے حد خوبصورت شام تھی۔ نیلے آسمان کی بے کراں وسعتوں میں بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مٹر گشت کر رہے تھے۔ ہوائیں گنگناہٹوں کا راگ الاپ رہی تھیں۔ ایسے میں نئے چچا نے شہلا سے کہا کہ وہ اُس کو بزنس گارڈن میں لے جائیں گے۔ یہ جان کر اُس کا ننھا سا دل خوشی سے جھومنے لگا۔ بہت دنوں پہلے وہ چھوٹے چچا کے ساتھ بھی وہاں ایک بار جا چکی تھی۔ وہ گارڈن اُس کو بہت پسند آیا تھا۔ اُس دن اس کے احساسات آزاد پنچھی کی طرح اُڑانیں بھرتے گئے۔ وہ ہنستی رہی، اُچھلتی کودتی رہی۔ جیسے قدرت نے ہر شے پر اُس کی حکمرانی قائم کر دی ہو۔

''مگر شہلا، پہلے تم اپنی امّی سے اجازت لو۔''

''وہ کچھ نہیں کہیں گی''

''کیوں؟''

''آپ جو ساتھ ہیں'' اُس کی معصومانہ بات پر وہ ہنس دیئے۔ امّی نے اس کو اجازت دے دی۔ تھوری دیر بعد جب شہلا تیار ہو کر باہر آئی تو نئے چچا اُس کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ یوں لگا جیسے کوئی شہزادی حدِ اُفق سے دور، رنگ و نور کی دنیا سے زمین پر اُتری ہو۔ نئے چچا نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

''شہلا تم تو ماشاء اللہ کسی آرٹسٹ کا شاہکار معلوم ہو رہی ہو۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' شہلا نے معصومیت سے پوچھا اور نئے چچا ہنس کر رہ گئے۔

''شہلا۔ زیادہ دیر مت کرنا'' اندر سے اُس کی امّی نے آہستہ سے کہا۔ شہلا نے دروازے کے قریب کھڑی اپنی امّی کو دیکھا۔ اُن کا چہرہ بے حد سرخ ہو گیا تھا!

اُس دن نئے چچا کے ساتھ اُس نے گارڈن کا ایک ایک حصہ دیکھا تھا۔ جب بھی وہ چلتے چلتے رک جاتی تو وہ سمجھتے کہ شاید وہ تھک گئی ہے، اور اُس کے منع کرنے کے باوجود اُس کو گود میں اُٹھا لیتے۔ انہوں نے اُسے فروٹ جوس اور چاکلیٹ کا ایک پیکٹ خرید کر دیا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ بھی اپنے بچپن میں اس چاکلیٹ کو مزے مزے لے کر کھاتے تھے۔ گارڈن میں کھلونوں کی ایک دکان بھی تھی جہاں سے اُنہوں نے بظاہر زندہ رہنے والا ایک ٹیڈی بیئر خریدا اور شہلا سے کہا کہ وہ اُسے اپنی گود میں بھر لے۔ آج سے یہ ٹیڈی بیئر اُسے تنہا محسوس ہونے نہیں دے گا۔ شہلا کو لگا جیسے اچانک اُس کی آنکھوں میں چاند چمکنے لگے ہیں۔

شام ڈھلنے کے بعد جب وہ لان میں پہنچے تو یہاں دودھیا روشنیوں کی تب و تاب نے ہر شے کو روشن کیا ہوا تھا۔ کہیں دور فضا تاریکی سے لپٹ کر سو رہی تھی مگر یہاں ہر شے رنگ و نور کی بارش میں نہا کر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ شہلا حیرت کا بت بنی سب کچھ دیکھے جا رہی تھی۔ شاید پہلی مرتبہ اُسے محسوس ہوا تھا کہ خوشی کس چیز کا نام ہے۔ وہ کچھ دیر تک نئے چچا کے پاس بیٹھی اُن سے باتیں کرتی رہی، پھر کھڑے ہو کر زور زور سے تالیاں بجانے لگی۔ اردگرد کی روشنیوں میں اُس کا چہرہ دوپہر کے سورج کی طرح دہک رہا تھا۔ نئے چچا خاموش بیٹھے صرف مسکراتے رہے۔

واپسی میں گھر کے قریب پہنچنے پر شہلا بولی۔

''کاش۔ آپ میرے ابّا ہوتے'' پہلے تو اس جملے پر اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر وہ پریشان پریشان سے نظر آنے لگے۔ اُنہوں نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولے۔

''ایسی باتیں نہیں کرتے شہلا!'' اُنہوں نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی تھی کہ وہ خود بھی خوف زدہ ہو گئی۔ شاید انہوں نے شہلا کے چہرے سے اُس کے دلی جذبات کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے اس کو گود میں لیا اور والہانہ انداز میں پیار کرنے لگے۔ وہ دن اُس کی زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔

ایک دن انہوں نے شہلا کو بلایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''شہلا۔ ہمارا ایک کام کرو گی؟''

''بس ایک؟ کہیے مجھے کیا کرنا ہے؟''

''کیا یہ پھول تم اپنی امّی کو دے سکتی ہو؟'' انہوں نے دو تر و تازہ، شاداب سرخ گلاب اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ''مگر دیکھو یہ بات کسی سے نہ کہنا''

''امّی سے بھی نہ کہوں؟''

''اُن سے کہہ سکتی ہو'' اُن کے چہرے پر پسینے کے چند قطرے لرزنے لگے۔ اور وہ جلدی سے کمرے سے بھاگ گئی۔ دوسرے کمرے میں امّی سنگھار میز کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ ان کے طویل بال اُن کی پشت پر لہرا رہے تھے۔ آئینے میں شہلا کے عکس کو دیکھ کر وہ بولیں۔

''یہ پھول کہاں سے لائی ہو؟''

''لایئے میں آپ کے بالوں میں لگا دوں۔ نئے چچا نے آپ کو دینے کے لیے کہا ہے''

پھر جیسے اردگرد کی ہر شے کسی زلزلے کے زیر اثر تہہ و بالا ہو کر رہ گئی ہو۔ امّی کے ہاتھ سے کنگھی فرش پر گر پڑی۔ اُن کا چہرہ یوں تیزی سے رنگ بدلنے لگا کہ شہلا سہم کر رہ گئی۔ اُسے لگا جیسے امّی کی بجائے کوئی اور عورت اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہو۔ اُنہوں نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے شہلا سے پھول لیا۔ اُن کے قدم کپکپا رہے تھے۔ وہ پلنگ کی طرف بڑھیں اور بستر پر اوندھی لیٹ گئیں۔ اُن کے بالوں نے اُن کے آدھے وجود کو ڈھک لیا تھا، اور کمرے کی فضا اُن کی دبی دبی سسکیوں سے سوگوار ہو رہی تھی۔ معصوم شہلا کے لیے یہ سب کچھ نا قابل فہم بات تھی۔

''امّی۔ آپ کو کیا ہوا؟''

''شہلا۔'' اُس کی امّی نے اُسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔ اُن کی آواز کمزور تھی۔ ''تمہیں یہ پھول نہیں لینے چاہیے تھے۔'' پھر وہ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئیں۔ اُن کی دونوں آنکھوں میں آنسوؤں کے چند موٹے موٹے قطرے یوں ٹھہرے ہوئے تھے جیسے ہر قطرہ ٹپکتے ہی دائمی زخم کی شکل اختیار کرے گا۔

''شہلا بیٹی۔ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔'' پھر انہوں نے شہلا کو سینے سے لگایا اور دوبارہ رونے لگیں۔ اس بار شہلا نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد، ایک رات شہلا باتیں کرنے کے بعد جب اُن کے کمرے سے نکل رہی تھی تو اُنہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے سوچا نئے چچا حسبِ سابق اُس کے گلے سے لگا کر خدا حافظ کہیں گے مگر اُنہوں نے اُس کا ہاتھ پکڑے رکھا اور چند لحظوں تک خاموشی سے اُن کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ اُن کی پیشانی پر چند تہہ دار شکنیں ابھر آئیں تھیں۔ یہ تو ایک طے شدہ بات تھی کہ وہ کچھ سوچ رہے تھے مگر کیا سوچ رہے تھے، اس کی بابت شہلا کچھ نہیں جان سکتی تھی مگر اُسے اتنا ضرور احساس تھا کہ اُن کی سوچ کا تعلق کچھ نہ کچھ اُس کی ذات سے ضرور ہے۔ اسی دوران انہوں نے پتلون کی پچھلی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا لفافہ نکالا اور شہلا کو دے کر کہا۔

''یہ تم اپنی امّی کو دینا'' اُن کی آواز بے جان سی تھی۔ ''اور کہنا یہ کمرے اور کھانے کی رقم ہے۔''

دوسرے کمرے میں پہنچ کر شہلا نے خاموشی سے لفافہ اپنی امّی کے ہاتھ میں رکھ دیا، اور نئے چچا کے الفاظ دہرا دیے۔ اُس کی امّی کے ہاتھوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ نہ جانے وقت سے کٹا ہوا وہ کون سا سفّاک لمحہ تھا جس نے اُس کی امّی کے اندرون میں اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اُنہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ اُس میں سے چند کڑکڑاتے ہوئے نوٹ نکلے اور سب سے آخر میں ایک نیلے رنگ کا کاغذ برآمد ہوا۔ اچانک جیسے اُس کی امّی کے چہرے پر آگ کے شعلوں نے ناچنا شروع کر دیا ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی، اور پھر اُن کی نظریں کاغذ کے الفاظ پر رینگنے لگیں۔ شہلا نے دیکھا کہ اُن کا وہ ہاتھ بُری طرح لرز رہا ہے جس میں انہوں نے کاغذ پکڑا تھا۔ اُن کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کسی نامعلوم اندرونی بے چینی کو ظاہر کر رہی تھی! اُنہوں نے شہلا کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں نیند کے سبب سرخیاں اُبھر آئیں تھیں، اور اُس کا سر بار بار اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔

''آؤ بیٹی سونے چلیں۔'' اُن کی آواز شاید خود اُن کو اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

کمرے میں ہلکے نیلے رنگ کی سکون بخش روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں بستر پر لیٹ گئے۔ شہلا کی نظریں دریچے سے گزر کر، دُور آسمان میں نور برسانے والے چاند پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس میں بیٹھی ہوئی بوڑھیا ابھی تک چرخہ چلا رہی تھی۔ عین اس لمحے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اُس کے بالوں سے اٹھکیلیاں کرنے لگا اور اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ اُس کی آنکھ پھر کھُل گئی۔ اُس نے دیکھا سنگھاردان کے قریب اُس کی امّی ایک کرسی پر آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھی ہیں۔ وہ گھبرا کر اُن کے پاس پہنچی۔ اُسے لگا امّی سرگوشی کے انداز میں کچھ کہہ رہی ہیں۔ اُن کی پیشانی پسینے سے تر بہ تر تھی۔ اُس نے ان کا ہاتھ تھاما وہ برف کی طرح سرد تھا۔

''امّی ۔۔۔ امّی ۔۔۔''

اُس کی آواز سن کر اُنہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ اُن میں بے بسی تھی، نا اُمیدی تھی، اور زندگی کے خلا کے بے انت ہونے کا احساس بھی تھا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''آؤ۔ سونے چلیں۔''

اُن دنوں اُس کی امّی بالکل ہی بدل گئی تھیں۔ ہمیشہ کھوئی کھوئی رہتیں۔ نہ جانے وہ کون سا بے نام جذبہ تھا جس نے اُنہیں بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے جب اُس کی دادی اُنہیں بُرا بھلا کہتی تو وہ خاموشی سے سر کو جھکا لیتی تھیں مگر اب دادی کے الفاظ سن کر وہ خالی خالی نظروں سے دروازے اور دریچوں کو گھورنے لگتیں۔ اُن کا جسم اور ذہن کبھی ایک جگہ پر موجود نہ ہوتا۔ کبھی کبھی وہ تنہائی میں چپکے چپکے سے سسکنے لگتیں، اور اگر ایسے میں شہلا آ جاتی تو اُن کے آنسوؤں کو بریک لگ جاتا، اور وہ اُس کو اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیتیں۔

ایک دن شہلا اسکول سے لوٹی تو اُس نے دیکھا امّی کمرے میں نہیں ہیں۔ اُس نے رسوئی اور دادی کے کمرے میں دیکھا مگر وہ وہاں بھی نہیں تھیں۔ نئے چچا کے کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی وہ چونک پڑی۔ اُس کی امّی نئے چچا کے سامنے سر جھکائے باتوں میں مصروف تھیں۔ اُن کا جھکا ہوا سرخ چہرہ شرم و حجاب کا ایک دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔ دونوں نے اُس کو دیکھا، اور فوری دونوں کے چہروں کی رنگت تبدیل ہو گئی۔ اُس کی امّی نے اُس کا ہاتھ تھاما اور دونوں جلدی سے دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔

''بیٹی ۔۔۔'' اُس کی امّی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''امّی ۔۔۔ آپ نئے چچا سے باتیں کیجیے نا ۔۔۔''

''تم کو یہ اچھا لگتا ہے؟''

''ہاں امّی ۔ وہ بہت اچھے ہیں! اگر وہ میرے ڈیڈی ہوتے تو؟''

''شہلا ۔۔۔'' اُس کی امّی کی نظریں جلدی سے اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں ۔ انہوں نے اپنا ایک ہاتھ شہلا کے ہونٹوں پر رکھ دیا مگر دوسرے ہی لمحے ہٹا بھی دیا۔

''کیا میں نے بُری بات کہہ دی امّی؟'' شہلا پریشان نظر آنے لگیں۔

''ہاں بیٹی!'' اُنہوں نے ایک طویل سانس لی۔ ''دنیا والے تمہاری اس معصوم خواہش کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔'' اُنہوں نے بھولی بھالی لڑکی کو لپٹا لیا۔ اُس کی امّی نے ذاتی زندگی کی اذیت ناکی کو جس طرح بیان کیا تھا، وہ شہلا

کی فہم کا حصّہ نہ بن سکا۔ وہ مہر بہ لب، یک ٹک اپنی امّی کو دیکھتی رہی۔ اُس وقت امّی کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ اور شاید اُن میں کوئی ادھورا خواب تابناک تعبیر سے مایوسی کے بعد تھک ہار کر سو گیا تھا!

اُس دن شام کو شہلا نے دادی کو دادا کے سامنے گرجتے ہوئے دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب رک گئی اور دروازے کے ایک چھوٹے سے سوراخ سے جھانکنے لگی۔ اُس میں اندر جانے کی جرأت نہیں تھی۔ سامنے مسہری پر دادا نیم دراز خاموشی سے گلدان کے سوکھے ہوئے پھولوں کو تک رہے تھے، اور دادی اُن کے سامنے کھڑی حلق پھاڑ کر چیخے جا رہی تھی۔ دادا نے اپنی زبان کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنی آنکھوں کا استعمال جاری رکھا۔ اُن کی نظروں کا محور سوکھے پھولوں سے بھرا گلدان تھا جس میں شاید اُن کی روح بھی مقیّد ہو کر رہ گئی تھی۔ دادی کی چیخ و پکار میں کئی بار نئے چچا کا نام بھی آیا، اُس کی امّی کا نام بھی آیا۔ شہلا کچھ سمجھ نہیں سکی اور دادی کے باہر نکلنے سے پہلے وہاں سے ہٹ گئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح اُس کی دادی آندھی طوفان کی طرح اُن کے کمرے میں داخل ہوئی، اور گھن گرج آواز میں موسلا دھار بارش کی طرح اُس کی امّی پر برستی رہی۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر شہلا کا ناپختہ ذہن بُری طرح اُلجھ کر رہ گیا۔ اُس کی امّی نے خاموشی سے سب کچھ سنا اور سر کو جھکائے رکھا۔ اُن کی پلکوں پر چند قطرے لرزتے رہے۔ شہلا کا جی چاہا کہ دادی کو دھکّے دے کر کمرے سے نکال باہر کرے۔ اس کم عمری میں بھی وہ جان گئی تھی کہ اس عورت نے اُس کی امّی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے!

کچھ دیر بعد ٹیکسی آ گئی۔ نوکروں نے جلدی جلدی اس میں سامان رکھا۔ وہ اپنی امّی کے ساتھ دریچے میں کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بہت سے سوالات پوچھے مگر ہر بار امّی کے چہرے کو دیکھ کر وہ اپنا ارادہ بدل دیتی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے نئے چچا کو ٹیکسی میں سوار ہوتے دیکھا۔ سوار ہونے سے پہلے اُنھوں نے دونوں کو دیکھا تھا اور پھر جلدی سے اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ اُن کا چہرہ دیکھ کر شہلا کو محسوس ہوا جیسے وہ رو دیں گے یا رو رہے ہیں۔

''امّی۔ نئے چچا جا رہے ہیں؟''

اس پر اُس کی امّی نے اُس کو دیکھا اور خاموشی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''کیا وہ ڈیڈی کی طرح پھر نہیں آئیں گے؟''

امّی نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

عین اسی لمحے ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ امّی خاموشی سے ٹیکسی کو آگے بڑھتے دیکھ رہی تھیں۔ جب موڑ پر نظروں سے غائب ہو گئی تو اُنھوں نے سنگھار میز کے دراز سے دو سوکھے گلاب نکالے جن کی پنکھڑیاں خشک ہو کر سیاہی مائل ہو گئی تھیں۔ اُن کی آنکھوں سے چند آنسوؤں کے قطرے ٹپکے اور پنکھڑیوں میں جذب ہو کر رہ گئے۔

- بقیہ -

یہ گھر میں نے بنایا ہے

اب کیا کہوں۔۔۔؟ میں چپ ہو گئی۔

میں آپ کا گھر خریدنے آیا ہوں۔

اب کس کے لیے۔۔۔؟

بتول کے لیے۔۔۔ اس پر اُس کا نام لکھ دوں گا۔ اور اس کے گھر میں رہوں گا۔

میں سوچنے لگی۔۔۔ شاید میرا ارادہ بدل گیا تھا۔

وہ میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔۔۔

مجھے معلوم ہے آپ کو اپنے گھر سے بہت محبت ہے۔ ہر عورت کو گھر سے محبت ہوتی ہے۔

آپ چاہیں تو فروخت کرنے کے بعد بھی اس گھر میں رہ سکتی ہیں۔

آپ کی کرایہ دار بن کر۔۔۔؟ میں نے بے چینی سے کہا۔

دوسری صورت بھی ہے۔ وہ بولا۔۔۔

میری ہمسفر بن کر۔۔۔ میں حیران پریشان اسے دیکھنے لگی۔

اس عمر میں، میرے بچے مجھ پر لعنتیں بھیجیں گے اور زمانہ کیا کہے گا۔

جب بچے ہمیں ٹھکرا کر چلے جاتے ہیں تو کیا ہم انہیں لعنت ملامت کرتے ہیں۔ زمانے نے کسی کو بخشا ہے جو ہمیں بخشے گا۔۔۔ شادی ایک رفاقت ہوتی ہے۔ اس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں عورت کو مرد کا سہارا درکار ہوتا ہے۔ اور مرد کو ایک ایسی عورت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمہ وقت اس کے اردگرد رہے۔ اس کے لیے چھوٹے چھوٹے کام کرتی رہے۔ اور اسے زندگی کا احساس دلاتی رہے۔۔۔ جیتے جی نہ مرد قبرستان میں رہنا چاہتا ہے نہ عورت۔۔۔

پتہ نہیں وہ کیا کیا کہہ رہا تھا۔۔۔

مگر میں نے یکا یک اسے ٹوک دیا اور کہا۔۔۔

میری ایک شرط ہے۔

کیا۔۔۔ وہ بولا۔

آپ ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں کہ آپ مجھ سے پہلے نہیں مریں گے۔

اب حیران اور پریشان ہونے کی اس کی باری تھی۔

''معمولی آدمی''

سیما پیروز
(لاہور)

میں پی۔آئی۔اے کی پرواز سے رحیم یار خان اپنے جیٹھ کی بیٹی کی شادی میں جارہی تھی۔ جانا تو اویس نے تھا لیکن وہ ایک ڈیلیگیشن کے ساتھ جاپان جارہے تھے۔ جاتے وقت بہت منت سے مجھے جانے کو کہا تھا سو مجبوراً مجھے جانا پڑ رہا تھا۔ میں سسرال والوں سے ذرا فاصلہ ہی رکھتی ہوں۔ ویسے تو وہ اچھے خاصے کھاتے پیتے زمیندار ہیں۔لیکن بالکل پینڈو اور اجڈ ہیں۔

اگرچہ گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں میری شادی سے لے کر اب تک اُن کے ماحول میں بھی کافی تبدیلی آ گئی ہے۔لڑکیوں کو بھی کسی حد تک تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مل گئی ہے لیکن پھر بھی کافی گھٹا ہوا ماحول ہے۔عورتوں بیچاریوں کے ساتھ تو ڈھور ڈنگروں والا سلوک کیا جاتا ہے۔سخت پردے میں گھروں میں بند روٹی اور کپڑا ان کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔اُن لوگوں کے ہاں زنان خانہ بالکل الگ ہے۔آٹھ سال سے بڑی عمر کا لڑکا زنان خانہ میں نہیں جا سکتا۔دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اُن عورتوں کی ابھی تک روایتی پردے سے جان نہیں چھوٹی۔

پاپا نے جب اویس سے میری شادی کا فیصلہ کیا تو میں نے اس کے پینڈو بیک گراؤنڈ ہونے کی وجہ سے اچھا خاصہ ہنگامہ کیا تھا۔

''بگلی اویس بڑا اچھا اور مؤدب لڑکا ہے۔ساری عمر تم سے دب کر رہے گا شکل وصورت کا بھی بُرا نہیں۔فلائنگ سائڈ پہ ہونے کی وجہ سے خوب ترقی کرے گا۔تجھے اس کے پینڈو بیک گراؤنڈ سے کیا لینا دینا۔تونے کونسا سسرال والوں کے ساتھ جا کر رہنا ہے۔جہاں اویس کی پوسٹنگ ہوگی تم اس کے ساتھ رہو گی۔ ماما اور پاپا نے اچھا خاصا لیکچر دیا تھا۔ وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ اُن کا فیصلہ کتنا درست تھا۔اویس بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔

چیک ان کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر جہاز کی روانگی کا انتظار کرنے لگی میں نے وقت گزارنے کے لیے مسافروں کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ایک سے ایک بڑھ کے پینڈو اور جاہل۔اللہ جانے ان لوگوں کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ کسی زمانے میں جہاز میں پڑھے لکھے اور شستہ لوگ سفر کرتے تھے۔اب تو لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کسی ٹرین کے تھرڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے ہیں۔

میرے بالکل سامنے ایک موٹی سی عورت کالی چادر اوڑھے اپنے پانچ عدد بچوں سمیت تشریف فرما تھیں۔دونوں بازوؤں میں کوئی درجن درجن بھر موٹی موٹی سونے کی چوڑیاں، کانوں میں بڑے بڑے جھمکے،انگلیوں میں ڈگ سی انگوٹھیاں جن میں موٹے موٹے نگینے جڑے ہوئے تھے۔''اُف''میں نے مارے کوفت کے برا سا منہ بنایا۔جاہل عورت لگتا ہے جیسے پیتل پہنا ہو۔میں نے فخر سے اپنی ہیرے کی نفیس سی دو عدد انگوٹھیوں اور سونے کی نازک سی چوڑیوں پر نظر ڈالی۔ بچے اس قدر بدتمیز تھے کہ حد نہیں۔بیٹھتے ہی انہوں نے کیک چپس کولڈ ڈرنکس اور نہ جانے کیا کیا منگوا لیا اور نہایت جنگلی پن سے چھینا جھپٹی کر کے کھاتے ہوئے سیٹوں پر کیک اور چپس گرا دیئے۔دو پہر دو بجے فلائٹ کا ٹائم تھا گھر سے بھی یقیناً ٹھونس کر آئے ہوں گے پھر بھی مر بھکوں کی طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ان سے دو سیٹیں چھوڑ کر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا سر پر گھونگھریالے بال جو تیل سے خوب چپڑے ہوئے تھے۔نوکدار مونچھیں،آنکھوں میں وافر مقدار میں سرمے کی دھار، کھڑ کھڑ کرتی لٹھے کی دھوتی اور بوسکی کا کرتا پہنا ہوا تھا۔اس کی طرف جتنی بار بھی اتفاقاً نظر اُٹھی اسے بے تکلفی سے آگے پیچھے کھجاتے ہوئے ہی پایا۔میرا بس چلے تو ان مردوں کے لیے شلوار اور دھوتی قسم کا لباس بین کردوں۔سب کو ٹائٹ قسم کی پتلونیں پہنوا دوں شاید ان کے کھجانے میں کمی واقع ہو جائے۔

شکر ہے ایک خاتون میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھی وہ اچھی ڈیسنٹ لگ رہی تھی ہم دونوں اُن لوگوں کو ہی ڈسکس کرتے رہے۔اتنے میں ایک نوجوان مٹیالی سی شلوار قمیض میں ملبوس قدرے لنگڑاتا ہوا کنارے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔''لوان کی کسر تھی''میں نے ساتھ والی خاتون سے سرگوشی میں کہا:

''یقیناً کوئی دوکاندار ہوگا۔اب پیسہ تو سارا ان دوکانداروں کے پاس آ گیا ہے۔''

خدا خدا کر کے اناؤنسمنٹ ہوئی اور ہم جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔

تقریباً سارے مسافر بیٹھ چکے تھے میرے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔میں خوش ہو رہی تھی کہ شکر ہے خدا کا اُن لوگوں میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں بیٹھا۔میں سوچ رہی تھی کہ اُن خاتون کو بلا لوں تا کہ گپ شپ کرتے جائیں۔لیکن جلد ہی میری خوشی کافور ہوگئی مٹیالے کپڑوں والا نوجوان میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ چکا تھا۔میں نے ناگواری سے منہ بالکل کھڑکی کے ساتھ لگا دیا اور باہر دیکھنے لگی۔جہاز کے ٹیک آف کرنے کے بعد ائر ہوسٹس کولڈ ڈرنک لے کر آئی۔اس نے انکار کر دیا صرف سادہ پانی اور کسی بھی قسم کی کوئی سوئٹس یا کینڈی ڈراپس مانگے۔میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا وہ مجھے کچھ زرد سا لگا۔''اوفوہ یقیناً اسے متلی ہو رہی ہوگی۔ اسی لیے سویٹ منہ میں رکھنی چاہتا ہے۔لو اب یہ الٹیاں کرتا رہے گا۔اُف کیا مصیبت ہے۔''میں نے کراہت سے جھرجھری لی۔تھوڑی دیر کے بعد ائیر ہوسٹس خالی ہاتھ واپس آ گئی۔

''سوری کسی بھی قسم کی سویٹ یا ٹافی نہیں ہے۔''

''پہلے تو وافر مقدار میں مسافروں کو آفر کی جاتی تھیں۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔

میں نے اپنا پرس ٹٹولا تو اس میں تین چار سویٹس مل گئیں۔میں نے

اس لڑکے کو دے دیں کہ وہ کہیں الٹیاں نہ شروع کر دے۔
اس نے شکریہ کہہ کر لے لیں میں نے پھر منہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔ نیلے آکاش پر آوارہ بادلوں کے ٹکڑے دھنکی ہوئی روئی کی طرح ادھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔ بڑا خوبصورت نظارہ تھا۔ میں کافی دیر اس میں کھوئی رہی۔ ائر ہوسٹس کھانے کی ٹرالی لے کر آ رہی تھی۔ ہماری سیٹ تک پہنچی تو لڑکے نے لنچ لینے سے بھی انکار کر دیا۔
''آپ کچھ لے کیوں نہیں رہے۔ کولڈ ڈرنک لاؤں'' ائیر ہوسٹس کی مہربان آواز میرے کان میں پڑی۔
''دراصل پچھلے بدھ کو میرے گردے کا آپریشن ہوا ہے۔ مجھے گھی والی چیزیں منع ہیں۔ ویسے بھی میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔''
''اوہ تبھی بیچارہ زرد سا ہے'' میرے دل میں اس کے لیے قدرے ہمدردی پیدا ہوئی۔
''اتنی جلدی آپ کو سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔''
''لاہور میں کتنے دن ہسپتال میں پڑا رہتا اور پھر آپ کو تو پتہ ہے پرائیویٹ ہسپتالوں کے بل بھرنا کون سا آسان کام ہے۔''
''آپ اکیلے کیوں سفر کر رہے ہیں۔ کسی کو آپ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ خدانخواستہ اگر طبیعت زیادہ خراب ہو جائے تو۔'' میں نے قدرے حیرت سے کہا۔
''آپریشن کے وقت گھر والوں میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں تھا۔ بس میرے دوست کے گھر والے تھے۔''
اس کی بات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی ''عجیب گھر والے ہیں آپریشن کے وقت کوئی اس کے پاس ہی نہیں تھا۔''
کچھ دیر ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔
''کیا گردے میں پتھری تھی یا کوئی اور پرابلم تھی۔''
''نہیں جی میرے گردے تو بالکل ٹھیک تھے۔ میں نے اپنا ایک گردہ کسی کو دیا ہے۔''
''اوہو''! میں نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ''بیچارہ اللہ جانے کیا مجبوری آن پڑی ہوگی جو گردہ بیچنا پڑا۔
''کتنے میں بیچا ہے آپ نے اپنا گردہ؟ آپ کو خوف محسوس نہیں ہوا۔ زندگی داؤ پر لگا دی۔''
''میں نے بیچا تو نہیں۔'' وہ بُرا مان گیا'' میں نے تو اپنے بچپن کے دوست کو دیا ہے۔ اس کے دونوں گردے فیل ہو گئے تھے۔ گھر والوں سے چوری دیا ہے۔''
میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔'' کیا دنیا میں ابھی بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو دوستی کی خاطر اپنے جسم کا ایک حصہ تک دان کر دیتے ہیں۔''
''کیا دوست سے بہت پیار ہے۔''
''ہاں جی دوست بھی مجھے بہت پیارا ہے اور اسے بھی میں بیوہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ جیسے آبدیدہ سا ہو گیا۔
میں اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ مجھے بڑا دلچسپ اور مختلف لگا۔
''تمہارا نام کیا ہے؟''
''جی سانول ہے میرا نام''
''اور دوست کا کیا نام ہے۔''
''اس کا نام عدنان ہے''
''ہم تین دوست ہیں۔ بہت گہرے اور پکے۔ اس کے لہجے میں بچوں جیسی خوشی تھی تیسرے کا نام اکرم ہے۔ ہم تینوں نے بی۔ اے اکٹھے ہی پڑھا ہے۔'' میری دلچسپی کو محسوس کر کے وہ بے تکلفی سے اپنا قصہ سنانے لگا۔
''میرے والد سکول میں کلرک ہیں، اکرم کے والد تحصیلدار ہیں۔ البتہ عدنان کے والد کافی بڑے زمیندار ہیں۔ لیکن عدنان نے اپنے اور ہمارے درمیان کبھی امارت کو حائل نہیں ہونے دیا۔ ہمارے ساتھ اس کا برتاؤ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہم اس کے برابر کے ہوں۔ یہ بہت بڑی بات ہے جی۔ لوگوں کے پاس چار پیسے آ جائیں تو وہ اپنے سے کم تر لوگوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے'' میں چور سی بن گئی۔
''عدنان تو اتنا پیارا بندہ ہے جی کہ میں کیا بتاؤں۔ اپنے گھر کے اچھے اچھے کھانے چھوڑ کر اکثر ہم غریبوں کے گھر بے تکلفی سے کھانا کھا لیتا ہے۔ ہمارے ہر دُکھ سُکھ میں شامل ہوتا ہے۔ اس میں غرور نام کو نہیں۔'' دوست کے لیے اس کے لہجے میں پیار گندھا ہوا تھا۔
''عدنان کی بیوی سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔'' میں اس کی بیوی کے بارے میں جاننا چاہتی تھی وہ تھوڑی دیر کو خاموش ہو گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ کسی اجنبی خاتون کو بتائے یا نہ بتائے پھر گویا ہوا'' وہ جی اکرم کی بہن ہے۔ میں دل ہی دل میں اسے چاہنے لگا تھا آپ یقین کریں ہم نے کبھی ایک دوسرے سے بات تک نہیں کی تھی۔ کبھی گذرتے ہوئے کبھی بیٹھک میں روٹی وغیرہ پکڑاتے ہوئے اس کی ایک جھلک نظر آ جاتی تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ پڑھائی سے فارغ ہو کر اچھی سی نوکری ڈھونڈنے کے بعد اس کا ہاتھ مانگ لوں گا۔'' وہ جیسے ماضی میں کھو گیا۔
''پھر تمہاری اس کے ساتھ شادی کیوں نہ ہو سکی۔ کیا اکرم کے گھر والوں نے انکار کر دیا''
''نہیں اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ میرے بات کرنے سے پہلے ہی اس کا رشتہ عدنان نے مانگ لیا''
''کیا وہ بھی تمہیں چاہتی تھی؟''
''شاید چاہتی ہی تھی۔ جب عدنان سے رشتے کی بات چل رہی تھی ایک دن اچانک وہ مجھے ڈیوڑھی میں مل گئی تھی اس روز وہ پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئی۔

باقی صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ کیجیے

ریشہ نیستاں

سید سعید نقوی
(امریکہ)

''نسیم'' وہ یقیناً نسیم ہی تھی۔ ایک لمحے، محض ایک لمحے کے لیے ہماری نظریں ملی تھیں، تو مجھے ان آنکھوں میں وہی بیس برس پرانی حیرت نظر آئی تھی۔ لیکن میری نظریں دھوکہ بھی کھا سکتی ہیں۔ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں کہ نظریں دھوکہ کھانے پر کمر بستہ رہتی ہیں۔ بیس برس پہلے میری عمر محض نو برس کی تھی۔ کیا نو برس کی عمر کے خدوخال انتیس سالہ آدمی میں پہچانے جا سکتے ہیں۔ لیکن بعض دفعہ معاملہ خدوخال کا نہیں ہوتا، ایک نامعلوم مانوسیت ہوتی ہے، جو خدوخال سے بڑھ کر کوئی چیز ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں وہ حیرت بھری شکایت جو اس دن نظر آئی تھی، وہی آج دوبارہ نظر آئی۔ لیکن اس نے مجھ سے نظریں کیوں چرالیں؟ فوراً مڑ کر تیز قدموں سے سڑک کے اس پار کیوں چلی گئی۔ مجھے ان سوالات کے جواب معلوم تھے، میں اپنی ذات میں خود ہی شرمسار سا ہو گیا۔

اس کی بات اور تھی، لیکن میں خود کیوں اسے آواز نہ دے سکا۔ میں تو اس پر نظر پڑنے سے پہلے ہی اسے پہچان چکا تھا۔ جیسے آپ کسی کو اس کی پرچھائیں سے پہچان لیتے ہیں، یا اس کی مخصوص خوشبو سے، یا بو سے۔ یا شاید یہ اس کے چلنے کا انداز تھا، یا اس کے مڑنے کا طریقہ۔ کچھ تو تھا کہ میں اس سے کوئی دس گز دور تھا۔ میں ایک دکان میں داخل ہو رہا تھا اور وہ برابر والی دکان کے باہر، چبوترے پر بیٹھی چوڑی والے سے جھک کر کچھ سودا کر رہی تھی۔ اس کی پشت پر نظر پڑتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ نسیم ہی ہے۔ میری نظروں کی تپش اپنی پشت پر محسوس کر کے اس نے جھکے جھکے ہی گردن گھما کر ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ پھر اس کی نظروں میں تمسخر اتر آیا۔ میں بیس برس سے یہی سوچتا تھا کہ اس سے نگاہیں ملیں تو ان میں کیا تاثر ہوگا، کیا وہ مجھے پہچان سکے گی۔ وہ شاید تمسخر ہی تھا، یا پھر وہ حیرت جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ وہ سیدھی ہوئی اور فوراً سڑک عبور کر کے دوسری جانب چلی گئی۔ اس نے مڑ کر مجھ پر دوسری نگاہ نہ ڈالی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے آواز دینا چاہی، مگر میرا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ میرے حلق سے اس کا نام ادا نہ ہوا۔ پھر بھی میں اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکا میری نظریں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک کہ سڑک کی دوسری جانب وہ مڑ کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اس نے مڑ کر مجھے دوبارہ نہ دیکھا۔

بٹوارے سے پہلے بھی حالات اچھے ہی تھے۔ میرے والد کا گجرات میں کپڑے کا کاروبار تھا۔ انتہا کی کاروباری سوجھ بوجھ تھی۔ اسی کارن بٹوارے سے کئی سال پہلے ہی ابا نے بہت سی نقدی کے بدلے سونا خرید لیا تھا۔

''بہت ذہین ہے تمھارا باپ۔ ڈھیر سارے کاغذی نوٹوں کی بجائے سونے کی چھوٹی ٹکیوں کو چھپانا زیادہ آسان تھا'' دادی مجھے فخر سے بتاتیں، تو ان کے چہرے پر ابا کے لیے محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے۔ ابا اپنی کاروباری سوجھ بوجھ، پہلی دولت اور خوش قسمتی لے کر کراچی آئے تو لکشمی نے بھی وفاداری نبھائی اور ان کے دامن سے بندھی ساتھ چلی آئی۔ چند ہی سالوں میں پھر وہی ریل پیل ہو گئی۔ صرف خریداروں کا حلیہ بدل گیا تھا۔ کشور، راجیش اور شکنتلا کی جگہ ندیم، آصف اور حمیدہ نے لے لی تھی۔

یوں میں منہ میں سونے کا نہ سہی چاندی کا چمچہ لے کر ضرور پیدا ہوا تھا۔ ہزار گز پر بنا خوبصورت بنگلہ، جس کے سامنے اور پچھواڑے میں سبزے کی بہار تھی۔ گھر میں دو گاڑیاں، ڈرائیور، مالی، خانساماں، جمعدارنی اور ہاں نسیم۔ بٹوارے کو اب بیس برس ہو چکے تھے۔ جن کی قسمت کا ستارہ سرحد کے اس پار بھی چمک اٹھا تھا، ان کے لیے تو بٹوارہ تاریخ کی کتابوں کا حصہ بن چکا تھا۔ جو اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے تھے، ان کے لیے تو قیامت ابھی کل ہی گزری تھی، اور یہ امتحان ابھی جاری تھا۔ میری امی کلفٹن کے ایک اسکول میں پرنسپل تھیں۔ ابا نے یہاں آ کر بوہری بازار میں کپڑوں کا کاروبار کر لیا تھا۔ اللہ نے ایسی برکت دی کہ جلد ہی ایک دکان صدر اور ایک کلفٹن میں بھی کھل گئی۔ کاروبار بڑھا تو ابا کے پاس وقت کم پڑنے لگا۔ ہفتے کے چھ دن صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک وہ اپنے پسینے اور کاروباری ذہانت کو کرنسی میں ڈھالتے رہتے۔ یہ ایسی ٹکسال تھی کہ تھکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ خود امی بھی صبح آٹھ بجے کی نکلی شام چار بجے سے پہلے گھر کہاں آتی تھیں۔

''نسیم اسے آج نہلا دیا تھا'' امی مجھے گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھتیں

''جی میڈم جی۔ اسکول سے آنے کے بعد نہلا کر کپڑے بدلائے اور پھر ایک گھنٹے کے لیے سلا دیا تھا'' نسیم نے چائے انڈیل کر پیالی امی کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ امی کا اصرار تھا کہ انہیں میڈم کہہ کر بلایا جائے۔

''اور کھانا کھلا دیا تھا؟''

''جی میڈم، میں نے خود اپنے ہاتھ سے کھلایا تھا''

''ہاتھ سے کھلایا تھا؟'' انہوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر تیزی سے سرزنش کی

''نہیں میڈم، چاول تو کانٹے سے ہی کھلائے تھے''

امی نے بھینچ کر مجھے پیار کیا اور پیار سے میرے سر کے بال بگاڑ دیے۔ کالج سے امی کی واپسی کے بعد دن کے یہ دو تین گھنٹے سب سے اچھے ہوتے۔ امی میرے لاڈ اٹھاتیں، مجھے اپنے ساتھ ساتھ رکھتیں۔ پھر وہ قیلولے کے لیے لیٹ جاتیں اور میں ایک دو گھنٹے نسیم کے پاس رہتا۔ ابا کے آنے کے بعد ہم تینوں رات کا کھانا ساتھ کھاتے۔ نسیم کو گھر کے پچھلے حصے میں ایک کمرہ ملا ہوا

تھا۔ چوکیدار، مالی، ڈرائیور، جمعدارنی سب روز کے ملازم تھے، آتے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے پھر چلے جاتے۔

ابا میری سالگرہ ہر سال بہت دھوم سے مناتے۔ آج آٹھویں سالگرہ بھی اسی دھوم سے ہو رہی تھی۔ تین چار میری عمر کے بچے بھی تھے، لیکن زیادہ تر امی اور ابا کے دوست تھے۔ ابا نے باغ میں تنبو لگا کر سارا انتظام کیا تھا اس موقع کے لیے خاص طور پر دو باوردی بیرے بلائے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کیک کاٹنے پر سب نے خوب تالیاں بجائی تھیں۔ میں کیک کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھ کر کانٹے سے کھا رہا تھا، لیکن میرا دل ان ڈبوں میں اٹکا ہوا تھا جس پر سب خوبصورت رنگین کاغذ لپیٹ کر میرے لیے قسم قسم کے تحفے لائے تھے، لیکن وہ امی کی ہدایت پر نسیم اندر لے گئی تھی۔ پلیٹ رکھ کر میں جلدی سے مڑا کہ بھاگ کر اندر جاؤں، تو ابا کے پیروں سے ٹکرا گیا، ان کی پیالی سے چائے چھلک کر ان کے سوٹ پر دھبے ڈال گئی۔

''نسیم، نسیم،'' امی نے آواز دی ''اسے اندر لے جاؤ۔''

یہ ایک عام سی پکار تھی جو گھر میں اکثر سنائی دیتی۔ اسے اندر لے جاؤ۔ نو برس کی عمر تک یہ سب سے مانوس جملہ تھا جو وقت کو روک دیتا تھا۔ میں شاید بہت چھوٹا تھا کہ اپنے والدین کی طرف کوئی برائی سوچ سکتا۔ یہ گویا اطلاع تھی کہ میں نے کوئی کام غلط کر دیا ہے، نسیم آ کر مجھے موقع واردات سے دور لے جاتی۔ عموماً میرے کھیلنے کے کمرے میں۔ یہاں چاروں طرف الماریوں میں بچوں کی کتابیں سجی تھیں، درمیان میں قالین پر چھوٹی بڑی کاریں، اور ریل کا ایک سیٹ۔ نسیم اکثر قالین پر بیٹھ کے مجھے کہانی سناتی۔ کبھی امی فارغ ہوتیں تو وہ بھی کونے میں پڑی آرام کرسی پر جھولتیں اور ساتھ مجھے کہانی سناتی جاتیں۔ نسیم مجھے گود میں بٹھا کر کہانی سناتی، مجھے سمجھاتی کہ مجھے سب کے سامنے بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے، میرے گالوں پر خوب پیار کرتی، میرے نخرے اٹھاتی، اسے اپنے کپڑے ملگجے ہو جانے کا بھی خیال نہ ہوتا۔ ایک ہی کہانی اگر کرسی پر بیٹھ کر سنائی جائے یا گود میں بٹھا کر تو اس کا اثر اتنا مختلف کیوں ہوتا ہے؟

آج بھی یہی ہوا۔ نسیم آ کر مجھے لے گئی۔ مجھے نہ جانے آج کیوں اتنا رونا آ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ سب کے سامنے مجھے بھیج دیا گیا تھا۔ میرے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ نسیم میرے سامنے بیٹھ گئی، مجھے گلے سے لگایا، تسلی دی، میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ مجھے اچھا لگا۔ مجھے پتہ تھا کہ اگر میں چپ ہو گیا تو اس کا دلار کم ہو جائے گا۔ جب میرا رونا کم نہ ہوا تو نسیم کو ڈر ہوا کہ کہیں باہر آواز نہ جائے، وہ مجھے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی، باہر بڑے میری سالگرہ مناتے رہے۔

نسیم کا کمرہ سردیوں میں بھی بہت گرم رہتا۔ باقی گھر کے مقابلے میں یہاں نسبتاً اندھیرا تھا کمرے میں ایک مخصوص بو رچی تھی۔ نسیم کی بو، تنہائی کی بو یا سادہ بےلوث محبت کی بو۔ اب بھی سوچتا ہوں تو فیصلہ نہیں کر پاتا۔ میرے خیال میں یہ سب کی ملی جلی بو تھی لیکن اس میں تنہائی کا عنصر سب سے نمایاں تھا جو اس وقت میرے لیے ایک اجنبی لفظ تھا۔ ایک کونے میں نواڑ کی ایک چارپائی تھی، جس پر چارخانوں کا کھیس بچھا رہتا۔ ایک طرف چھوٹی سی الماری جس میں نسیم کے چند جوڑے اور چند کتابیں تھیں۔ نسیم نے بٹوارے سے پہلے مولوی عالم تک پڑھا تھا۔ اب بھی امی اسے نسیم حجازی اور راشد الخیری کی کتابیں اور اسی قسم کے رسالے لا کر دیتی تھیں۔ پلنگ کے نیچے نسیم کا ایک ٹرنک تھا، چھوٹا سا ایک ٹین کا بکس، جسے وہ اکثر کھولے اس میں محو رہتی۔ یہ عموماً بند رہتا۔ نسیم کو سختی سے ہدایت تھی کہ مجھے اپنے کمرے میں نہ لے جائے۔ امی، ابو کے سامنے وہ بہت احتیاط برتتی۔ لیکن اکثر امی کے آنے سے پہلے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آتی، یہ ہم دونوں کا چھوٹا سا راز تھا۔ مجھے اس عمر میں بھی اس بات کا ادراک تھا کہ اگر امی ابا کو پتہ چل گیا تو میرا اس کمرے میں آنا بند ہو جائے گا۔ مجھے سب سے زیادہ اس ٹرنک کی جستجو رہتی، جسے نسیم کبھی نہ کھولتی۔

میں سسکتا ہوا نسیم کے بستر پر لیٹ گیا، اور آنسو بہانے لگا۔ نسیم میرے پاس ہی بیٹھ گئی اور پیٹھ تھپتھپانے لگی۔ میرا رونا بند نہ ہوا تو اس نے مجھے خود سے لپٹا لیا۔ مجھے اس کے جسم کی کھٹی سی بو اچھی لگی۔ میں نے اس کی گود میں سر رکھ دیا اور بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیئے۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی گرمی سے مجھے راحت مل رہی تھی۔ گو ابھی گرمیاں رخصت نہیں ہوئیں تھیں، لیکن مجھے اس کے جسم کی گرمی میں مانوسیت لگی، مجھے اس کے بازوؤں کا گداز اچھا لگا، میں نے سر اس کے سینے پر رکھا اور سو گیا۔

امی، ابا سالگرہ کے مہمانوں سے فارغ ہو کر اندر آئے، تو میں واپس اپنے کھیلنے کے کمرے میں آ چکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح بہلا کر نسیم نے مجھے تحفے کھولنے سے باز رکھا تھا، اگر میں خود ہی کھول لیتا تو امی اور ابا ناراض ہوتے۔

''کتنا بڑا ہو گیا ہے میرا لال، ماشاءاللہ پورے آٹھ سال کا'' امی نے بڑھ کر مجھے لپٹا لیا، اور میرے سر پر بوسہ دیا۔ امی کے پاس سے شنیل کے قیمتی پرفیوم کی مہک اٹھ رہی تھی، ٹھنڈی مہک۔ ''ہاں بھئی آج تو ہمارا بیٹا واقعی شہزادہ لگ رہا تھا'' ابا نے بھی بڑھ کر مجھے گود میں اٹھا لیا

''مجھے پتہ ہے تم تحفے کھولنے کے لیے بے چین ہو'' امی نے ہنس کر میرے گال پر چٹکی لی ''چلو دیکھتے ہیں کیا تحفے ملے۔ میں تو شیخ صاحب کا تحفہ دیکھنے کے لیے بے چین ہوں'' امی نے معنی خیز نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔

''ہاں بھئی، محض تمھارے کہنے پر ہی میں نے ان کی بیٹی کی شادی میں اتنا قیمتی سیٹ دیا تھا'' ابا خوشدلی سے بولے۔ سالگرہ میں دیے جانے والے تحائف کا حساب رکھا جا رہا تھا، تعلقات کی گرمجوشی میں لین دین کی گرمائش بھی شامل تھی۔ چائے گرانے والی واردات بھلائی جا چکی تھی۔

میں اسکول سے لوٹا تو نسیم گیٹ پر ہی کھڑی تھی۔ میری اسکول بس میں ابھی کچھ بچے باقی تھے۔ یہ بس ہر بچے کو اس کے دروازے تک چھوڑنے جاتی،

روز نسیم گیٹ پر ہی میرا انتظار کرتی۔

''آ گیا میرا شہزادہ۔ میں نے آج تمھارے لیے خاص چیز بنائی ہے'' اس نے مسکرا کے میرا بستہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ گرمی میں اس کی ہتھیلی پسینے میں بھیگ رہی تھی، مگر مجھے برا نہیں لگا۔

''کیا بنایا ہے، بتاؤ ناں، بہت زور کی بھوک لگی ہے'' میں نے ضد کی

''بوجھو تو جانیں'' نسیم نے مسکرا کے اپنا مخصوص فقرہ دہرایا

''انڈے کا حلوہ'' میں نے سوچ کر کچھ توقف کے بعد پوچھا

ناں

''کھیر''

ناں

''تم ہی بتاؤ ناں'' میں نے ہار مان لی

''تم تو بہت جلدی ہار مان لیتے ہو۔ میں نے تمھارے لیے پراٹھا بنایا ہے، شکر والا'' نسیم کو معلوم تھا کہ شکر والا پراٹھا مجھے بہت پسند ہے۔ میں اس کا ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگنے لگا، وہ بھی ہنستی ہوئی میرا بستہ سنبھال کے میرے پیچھے آ گئی۔

''پہلے کپڑے بدل لو، نہالو'' نسیم نے سمجھایا

''نہیں پہلے پراٹھا'' میں نے ضد کی

''چلو اچھا آؤ، بس کپڑے بدل لو، نہانا بعد میں'' نسیم مجھے اٹھا کر کمرے میں چلی گئی

''اچھا ٹھیک ہے، لیکن پھر آج تمھارے کمرے میں سوؤں گا''

''میڈم کو پتہ چل گیا تو میری پٹائی ہوگی'' اس کا خوف مصنوعی نہ تھا، لیکن اس نے میرے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

میں نسیم کے کمرے میں روز ہی آتا، لیکن ہر بار مجھے اس کا کمرہ پر اسرار سا لگتا۔ نیم اندھیرا، سوندھا سوندھا، جس میں نسیم کی بو رچی تھی۔ میں اس کی چیزیں الٹنے پلٹنے لگا

''بیٹا یہ مت کرو'' نسیم نے مجھے پیار سے ڈانٹا

''یہ کیا ہے'' میں نے دلچسپی سے نسیم کے ٹرنک کو دیکھا جو آج پلنگ سے آدھا باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے دلچسپی سے اس تاج محل کو دیکھا جو نسیم نے ایک دوپٹے میں لپیٹ کر اس میں رکھا ہوا تھا۔ نسیم کا ٹرنک پہلے کبھی نہیں کھلا تھا۔

''یہ کیا ہے'' میں نے تاج محل ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''اسے مت چھوؤ'' وہ میری جانب لپکی، اور غیر معمولی سختی سے وہ تاج محل میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں کچھ روہانسا سا ہو گیا تو اس نے احتیاط سے اسے دوپٹے میں لپیٹ کر ٹرنک میں واپس رکھا، اور ٹرنک واپس پلنگ کے نیچے پہنچ گیا۔ اس کا رویہ پہلے کبھی اتنا روکھا نہ ہوا تھا

پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے مجھے لپٹا لیا۔

''وہ میرے امی ابا کی نشانی ہے'' مجھے لگا کہ وہ رو رہی ہے۔

''میرے پاس بس ان کی یہی ایک چیز ہے۔ جب کہ تمھارے پاس تو تمھارے امی ابا ہیں، ان کی ہر چیز ہے، میرے پاس اور کچھ نہیں۔ صرف یہ تاج محل ہے، ہاتھی دانت کا، جسے ابا نے شادی پر میری امی کو دیا تھا'' نسیم بے دھیانی میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی، وہ اس لمحے میری ہم عمر ہو گئی تھی۔ ایک چھوٹی لڑکی جو اپنے ہم عمر دوست سے وقت کی سختیوں کی شکایت کر رہی تھی۔ شاید بچے کپڑے سستے پہنے ہوں یا مہنگے، ان کے اندر دل ایک ہی لے پر دھڑکتے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا سوائے اس بات کے کہ یہ کھلونا اسے بہت عزیز ہے۔

نسیم بھی بٹوارے کا شکار تھی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کے لیے نکلی تھی، مگر کراچی پہنچنے سے پہلے سب لٹا چکی تھی۔ ماں، باپ، ایک بہن اور سارا ساز و سامان۔ لٹے پٹے قافلے کے ساتھ مہاجر کیمپ میں مقیم تھی۔ امی اسے سولہ برس کی عمر میں مہاجر کیمپ سے اٹھا لائیں تھیں۔ ان پندرہ سالوں میں اب وہ ہمارے گھر کا ہی ایک فرد بن چکی تھی۔ لیکن دوسرے درجے کی فرد۔ والدین کے اکلوتے بیٹے کی دیکھ بھال اس کے ذمہ نہ ہوتی تو شاید وہ بھی اب تک فارغ ہو چکی ہوتی۔ امی نوجوان ملازموں پر بہت کڑی نظر رکھتی تھیں۔ خانساماں، چوکیدار، مالی سب ہی ادھیڑ عمر کے تھے، اور شادی شدہ۔ گھر کی صفائی کے لیے پہلے بھی امی نے ایک لڑکی رکھی تھی، لیکن ایک سال بعد ہی فارغ کر دی گئی کہ دودھ والے سے اس کی بے تکلفی بہت بڑھ رہی تھی۔

''نسیم میرے کپڑوں پر استری کر دی ہے'' امی نے آواز دے کر پوچھا۔

''جی میڈم، اور صاحب کے جوتے بھی چوکیدار پالش کر کے دے گیا ہے، آپ کے بیڈروم میں رکھے ہیں''

''یہ میرے بال بنانے میں ذرا مدد کر دو، دیر ہو رہی ہے اور یہ سوکھ ہی نہیں رہے'' نسیم جو میری کتابیں اسکول کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔ بیگ زمین پر رکھ کر تیزی سے مڑی، صبح کا وقت اس کے لیے عذاب ہوتا، ہم تینوں کو صرف وہی فارغ نظر آتی۔ اسے اپنا وقت صاحب، میڈم اور ان کے بچے میں تقسیم کرنا پڑتا۔ بدحواسی میں مڑی تو دروازے کے پاس رکھی تپائی سے ٹکرائی، اور اس پر رکھا خوبصورت گلدان زمین پر گر کے ٹکڑے ہو گیا۔

نسیم کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ بہت مہنگا گلدان تھا۔ اس دن میری سالگرہ پر شیخ صاحب نے یہی گلدان تحفے میں دیا تھا، تو اسے دیکھ کر امی ابا کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ 'کچھ ٹوٹا ہے کیا؟'' امی کی آواز میں تیزی اور اشتعال تھا۔ میں نے نسیم کی طرف دیکھا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے کچھ بدلی بدلی تھی۔ اب اس کے کپڑے صاف ستھرے رہنے لگے تھے، گزشتہ روز میں نے اس کے کمرے میں ایک لپ اسٹک بھی دیکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، امی دروازے پر موجود تھیں۔

''ارے، یہ کیسے ٹوٹ گیا، اتنا قیمتی گلدان تھا، کمبخت'' امی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے نسیم کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرا دھواں ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے امی اسے ماریں تو نہیں، تنخواہ سے پیسے بھی نہیں کاٹتیں۔ لیکن اس کی عزت اتار کے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتیں۔ اسی وجہ سے اس کا چہرا دھواں ہو رہا تھا۔ مجھ سے اس کا رشتہ عجیب تھا۔ وہ اس گھر میں ملازمہ تھی، لیکن ساتھ ہی میری آیا۔ میری دوست اور غم گسار بھی۔ میرے سامنے بے عزت ہونا یقیناً اس کے لیے بہت دشوار تھا

''امی، میں اسکول کا بستہ اٹھا رہا تھا، اس سے ٹکرا گیا، غلطی سے ٹوٹ گیا امی، آئی ایم سوری'' میں نے منہ بسورا

''ارے کوئی بات نہیں بیٹا، چوٹ تو نہیں آئی، ایسے سو گلدان تم پر قربان'' امی نے مجھے لپٹا لیا۔ ''کانچ کے قریب مت جانا۔ نسیم اٹھا کے باہر پھینکو یہ ٹکڑے، بال میں خود ہی بنا لوں گی'' امی واپس لوٹ گئیں۔

نسیم نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مجھے لپٹا لیا، اور بھینچ کر خوب مجھے پیار کیا۔ اس کا جسم ہل رہا تھا، مجھے پتہ تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ میرا جی چاہا کہ وہ مجھے ایسے ہی لپٹائے رہے۔

''پیار کرو یہاں گال پر''، نسیم نے کہا

میں نے اس کی گردن میں بازو حمائل کر کے ایک دو نہیں تین پیار کر ڈالے۔ اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کی نمی بھی اچھی لگی۔ بس کی آواز آئی تو اس نے ایک ہاتھ میں بستہ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام کر باہر چلی۔

میں اسکول سے واپس آیا تو نسیم میری منتظر تھی۔ اس نے بھڑکیلا شوخ لباس پہن رکھا تھا، اور مجھے لگا کہ اس کے ہونٹوں پر شاید لپ اسٹک بھی لگی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرا کھل اٹھا، وہ مجھے لے کر اندر چلی گئی۔ میں یہ بات نوٹ کیے بنا نہ رہ سکا کہ امی کے آنے سے پہلے وہ پھر اپنے روز کے ملگجے لباس میں واپس آ چکی تھی اور اس کے ہونٹوں سے سرخی بھی غائب تھی۔ اب یہ روز کا معمول بن گیا۔ میں اسکول سے واپس آتا تو نسیم گیٹ پر منتظر ہوتی۔ اس کے جسم کی مخصوص کھٹی بو کی جگہ اب صابن کی سی خوشبو آتی۔ اس کے ہونٹوں پر سرخی چمکتی، اس کے بالوں کا قرینہ بدل گیا تھا، اس کی چال میں مستی آ گئی تھی۔ لیکن امی کی واپسی سے پہلے پرانی نسیم واپس آ جاتی۔

''نسیم، یہ ابھی تک تیار نہیں ہوا، اسکول سے دیر ہو جائے گی'' امی نے نسیم کو جھڑکا، اور میرے سرہانے بیٹھ کر میرے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرنے لگیں، پھر انہوں نے میرا ماتھا چھوا۔

''ارے، اسے تو بخار ہے۔ جب ہی آنکھ نہیں کھل رہی، بیٹا گلے میں درد ہو رہا ہے کیا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا

''موسم بھی تو بدل رہا ہے'' امی بڑبڑائیں ''اچھا آج اسکول مت جاؤ۔ میں رک جاؤں تمھارے پاس؟''

''نہیں میڈم، آپ حرج نہ کریں، میں ہوں ناں'' نسیم جلدی سے بولی۔

''اچھا یہ دوائی ہے، ایک چمچہ ابھی میں دے رہی ہوں، ایک پھر چھ گھنٹے بعد دے دینا۔ میں جلدی آ جاؤں گی اور گاڑی واپس بھیج دوں گی۔ اگر ذرا بھی طبیعت ٹھیک نہ ہو تو اسکول آ جانا، ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں گے'' امی نے جھک کر مجھے پیار کیا۔ جاتے جاتے وہ نسیم کو درجنوں ہدایات دے گئیں۔

امی کے جانے کے بعد میری طبیعت کچھ بہتر ہو گئی۔ نسیم میرے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی، میں اس سے لپٹ گیا، آج مجھے اس کے سینے سے لپٹنے میں ایک نئی انوکھی راحت ہو رہی تھی۔ یہ میرے لیے بہت نئے احساسات تھے، لیکن نسیم کچھ بے چین سی تھی،

''تم یہاں لیٹو، میں ذرا بال بنا لوں'' مجھے ناشتہ کرا کے وہ بہت پیار سے بولی۔ نسیم کا غسل خانہ بھی علیحدہ تھا۔

''میں وہاں تمھارے بستر پر لیٹوں گا''

''نہیں تم یہاں لیٹو، میں ابھی نہا کر آئی''

''نہیں میں تمھارے بستر پر لیٹوں گا'' میں منہ بسورنے لگا ''ورنہ امی سے بتا دوں گا''

''کیا بتا دو گے'' وہ گھبرا گئی

''یہی کہ تم نہائیں تھیں''

اوہ، اس نے سکون کا سانس لیا۔ ''اچھا امی کو مت بتانا''

میں نسیم کے بستر پر جا کر لیٹ گیا، اور اس کی رضائی اوڑھی تو اس کی مخصوص بو نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے دھیرے سے اتر کر اس کے پلنگ کے نیچے سے ٹرنک کھینچا، اس میں تالہ نہیں تھا، میں نے کھول کر اس میں سے تاج محل نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ نسیم نہا کر آئی تو میں نے وہ تاج محل رضائی میں چھپا لیا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے، وہ الماری میں لگے چھوٹے سے آئینے میں کھڑی اپنا سراپا دیکھتی رہی۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں، شاید امی کی دی ہوئی دوا کا اثر ہو رہا تھا۔

''سوچ رہی ہوں اپنی ناک چھدوا لوں'' اس نے آئینے میں مجھے دیکھ کر کہا، وہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے سوتا پا کر اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور بد سلیقگی سے سرخی ہونٹوں پر تھوپ لی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نسیم کے بستر میں ہی تھا۔ اس کا بستر چھوڑنے کو دل نہ چاہا ''نسیم'' میں نے آواز دی تو کوئی جواب نہ ملا۔

''نسیم، نسیم'' پکارتا ہوا میں اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کھیل کے کمرے میں گیا، وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ شاید امی کے کمرے میں صفائی کر رہی ہو۔ یہ سوچ کر میں مڑا تو کھڑکی سے پچھلے باغ پر نظر

پڑی۔نسیم وہاں جامن کے درخت کے نیچے کھڑی تھی،اس کے نزدیک، بہت نزدیک ہمارے ہمسایوں کا نیا ڈرائیور کھڑا تھا۔دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔نسیم کا ہاتھ ڈرائیور کے کندھے پر تھا۔ڈرائیور نے جھک کر شاید اس کے کان میں کچھ کہا،نسیم ہنس کر پیچھے ہوگئی اور ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلنے لگی۔ڈرائیور نسیم کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔وہ ہنس رہی تھی۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''نسیم ،نسیم'' میں کھڑکی کے پاس جا کر چلاّیا۔کیا کر رہے تھے یہ دونوں؟

جالی کے تاروں سے آزاد ہو کر میری آواز باہر کی جانب لپکی اور نسیم کے خوابوں کو منہدم کر گئی۔اس نے چونک کر مجھے دیکھا،اور واپس گھر کی جانب دوڑی۔ میں نہ جانے کیوں رونے لگا اور سیڑھیاں اتر کر نسیم کے کمرے میں جا گھسا۔نسیم کمرے میں داخل ہوئی تو میں وہ تاج محل ہاتھوں میں اٹھائے کھڑا تھا۔

''ارے بیٹا اسے واپس رکھو'' اس کی آواز میں خوف تھا

میں نے نفرت سے اس کی جانب دیکھا اور زور سے تاج محل پکے فرش پر دے مارا۔اس کے کانچ بکھر گئے،اور ایک چھوٹا ٹکڑا میرے پاؤں کو زخمی کر گیا۔نسیم کی آنکھوں میں شکایت بھری حیرت اتر آئی۔وہی حیرت جو آج بیس برس بھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی

''یہ کیا کیا؟'' وہ میرے پاؤں سے بے نیاز، اپنے تاج محل کے ٹکڑے چن رہی تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر اس کے پاؤں بھگو رہے تھے، میں نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی اور اپنے کھیل کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔میں صبح سو کر اٹھا تو نسیم نوکری چھوڑ کر جا چکی تھی۔اسی طرح جیسے آج وہ مجھے دیکھ کر سڑک عبور کر گئی تھی۔لیکن وہ حیرت زدہ آنکھیں پیچھے چھوڑ گئی تھی۔آج بیس برس بعد بھی اس کی آنکھیں مجھ سے وہی سوال کر رہی تھیں۔

بقیہ : معمولی آدمی

''سانول کیا تم نہیں جانتے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''میں کچھ کہے بنا الٹے قدموں لوٹ آیا''

''اگر تم عدنان کو بتا دیتے تو کیا وہ تمہارے راستے سے ہٹ نہ جاتا''

''یقیناً وہ ایسے ہی کرتا''

''پھر تم نے اسے بتا کیوں نہیں دیا''

''میں نے بہت غور کیا تو عدنان ہر لحاظ سے مجھے اپنے سے لاکھ درجے بہتر لگا۔ مجھے تو شادی کرنے کے لیے ابھی لمبا سفر طے کرنا تھا۔والد صاحب ریٹائر ہونے والے تھے گھر پر تین جوان کنواری بہنیں بیٹھی تھیں اور نوکری بھی کون سی گورنری مل جانی تھی۔'' اس کی آواز میں ہلکا سا دُکھ اور طنز تھا۔

''ویسے بھی عدنان بہت پیارا اور اچھا انسان ہے۔وہ یقیناً عدنان کے ساتھ سکھی اور خوش رہتی۔میں اسے کیا دے سکتا تھا۔سائل کے انبار،غربت اور محرومیاں۔''

''ان کی شادی کو کتنے برس ہوئے ہیں۔''

''پانچ برس ہوگئے ہیں۔ایک پیارا سا تین سال کا بیٹا ہے۔سب کچھ بہت اچھا جا رہا تھا۔وہ اپنے گھر میں بہت سکھی تھی۔خوش بھی ہوگی۔دنیا کی ہر نعمت اسے میسر تھی۔سب سے بڑھ کر عدنان کا پیار۔جان چھڑکتا ہے اس پر۔نہ جانے کیسے عدنان کے دونوں گردے خراب ہوگئے۔نہ وہ شراب پیتا ہے نہ سگریٹ۔نہ کوئی اور بری لت ہے اس کو۔پتہ نہیں کیسے ہوا یہ سب اور کیوں ہوا؟'' وہ بیحد دُکھی ہوگیا۔

''وہ تو پیسے والے لوگ ہیں۔کسی سے بھی گردہ خرید سکتے تھے۔تم نے اپنے اوپر یہ ظلم کیوں کیا؟ ابھی جوان ہو۔ساری زندگی تمہارے سامنے پڑی ہے۔''

''کسی سے گردہ خریدا تھا انہوں نے۔اس کی والدہ نے بھی اپنا گردہ دیا تھا لیکن دونوں نے کام نہیں کیا۔وہ بس آدھے سے بھی کم گردے کے سہارے زندہ تھا۔کیسا کڑیل جوان تھا۔دنوں میں گھل کر رہ گیا تھا۔اور وہ بھی توری کے پھول جیسی مرجھا کر رہ گئی تھی۔'' اس کے چہرے پر ایک الوہی جذبہ تھا۔

''اللہ کا شکر ہے میرا گردہ اس کو سُوٹ کر گیا ہے۔انشاء اللہ اب وہ بالکل تندرست ہو جائے گا۔دعا کریں جی اللہ تعالیٰ اسے صحت کے ساتھ لمبی حیاتی دے اور میری قربانی رائیگاں نہ جائے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''آمین'' میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔

جہاز اب بادلوں سے نیچے آ رہا تھا۔لیکن وہ ایک معمولی سا پینڈو آدمی بادلوں سے کہیں اونچا آکاش کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔

''آسودگیٔ جاں''

محمود الحسن
(راولپنڈی)

وارفتگی شوق کا اظہار کریں ہم
دل کھول کے اب کیوں نہ انہیں پیار کریں ہم

پہنائیں دل و جاں کو محبت کا لبادہ
پھر حوصلہ تابِ رُخِ یار کریں ہم

اِک عمر گزاری ہے رہِ راست پہ ہم نے
اب پیرویِ جُبّہ و دستار کریں ہم!

جس جُرم کی پاداش میں پہنچے ہیں سرِ دار
اے کاش وہی جُرم کئی بار کریں ہم

آسودگیِ جاں سے نہیں ہم کو سروکار
پیوست رگِ جاں میں کوئی خار کریں ہم

ہوں پیشِ نظر عارض و گیسوئے محمدؐ
دن رات ثنائے شہِ ابرارؐ کریں ہم

تسکینِ دل وجاں کی ضرورت ہے تو پھر کیوں
محمودؔ غمِ اندک و بسیار کریں ہم

❍

اختر شاہ جہاں پوری
(بھارت)

چہرۂ غم پہ مسرت کا نشاں ڈھونڈتے ہو
تم کو کیا ہو گیا کیا چیز کہاں ڈھونڈتے ہو

حال جب یہ ہے تو کیا ہوگا بھلا مستقبل
تیر ترکش میں ہیں اور کماں ڈھونڈتے ہو

ہر طرف آگ ہے جلتا ہوا صحرا ہر سُو
ایسے عالم میں بھی خوابوں کا جہاں ڈھونڈتے ہو

عکس جس کا مرے باطن سے ابھرتا ہی نہیں
وہ بدن بھی مری غزلوں میں نہاں ڈھونڈتے ہو

زندگی کے لیے جب شرط سفر ٹھہرا ہے
سر چھپانے کے لیے پھر بھی مکاں ڈھونڈتے ہو

سرخیِ بنتِ عنب کم تو نہیں ہے لیکن
جام پر بوسئہ تاثیر لباں ڈھونڈتے ہو

زندگی دشت کی مانند ہے پھر بھی اخترؔ
لوگ اس دشت میں ہی جائے اماں ڈھونڈتے ہیں

❍

غالب عرفان
(کراچی)

سلسلہ ٹوٹے ہوئے پندار کا
حادثہ ہے کانچ کی دیوار کا

ٹوٹ کر بکھرا تو اندازہ ہوا
اک شکستہ عہد کی رفتار کا

دیکھنا ہے اس حصارِ ذات سے
سارا منظر ذات کے اُس پار کا

منظروں میں ساری صدیاں عشق کی
دسترس میں ایک لمحہ پیار کا

فاصلوں کے آئنے کے رُوبرو
ایک پردہ وقت کے اسرار کا

سر پھری پاگل ہوا کے سامنے
اک نظارہ ناؤ اور پتوار کا

چشمِ عرفاؔں سے اُلجھ کر رہ گیا
مسئلہ تہذیب کی اقدار کا

○

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

کوئی جواز تو ہو گا وہاں نہ جانے میں
وہ میں کہ آگے تھا اپنا قدم بڑھانے میں

ارادہ ترکِ تعلق کا کر لیا میں نے
ہزار شرم تھی حائل اسے بتانے میں

مجھے وفا بھی جو یاروں کی آزمانا تھی
کہ آئی کام روایت دیا بجھانے میں

میں خود ہوں مرکزی کردار وہ نہ جان سکا
عجب مزا ملا قصہ اُسے سنانے میں

مجھے خبر ہے وہ بھولے سے یاد آئے گا
کچھ اور دیر لگے گی اُسے بھلانے میں

عجیب خوف تھا دل میں سکول جاتے ہوئے
کہ آنکھ نم ہوئی بچے کی مسکرانے میں

اٹھی ہیں انگلیاں مجھ پر زمانے بھر کی حسؔن
میں روپڑا تھا دلاسہ اُسے دلانے میں

○

خیال آفاقی
(کراچی)

ذوق دید اور نکھر جائے گا پھر دیکھیں گے
شوق جب حد سے گزر جائے گا پھر دیکھیں گے

آنکھ مصروف ہے تصویرِ نگاراں میں ابھی
جب کوئی دل میں اُتر جائے گا پھر دیکھیں گے

آج تو لگتا ہے آئینہ ہمارے حق میں
کل یہ جب ہم سے مکر جائے گا پھر دیکھیں گے

دل کو لینے دو ابھی اور تڑپنے کا مزا
درد دریا ہے، اتر جائے گا ، پھر دیکھیں گے

وقت، کہتے ہیں رفوگر ہے، چلو یونہی سہی
زخم دل جب کوئی بھر جائے گا پھر دیکھیں گے

گھر مقدر تو نہیں ہے کہ سنور بھی نہ سکے
بخت جب اپنا سنور جائے کا پھر دیکھیں گے

گل کو ہنس لینے دو، شبنم کو بھی رو لینے دو
جب یہ سب کھیل بکھر جائے گا، پھر دیکھیں گے

ہوش باقی ہے ابھی اپنی تباہی کا ہمیں
جب یہ احساس بھی مر جائے گا، پھر دیکھیں گے

اس سے پہلے بھی کئی دور سے گزرنے ہیں خیالؔ
خیر سے یہ بھی گزر جائے گا، پھر دیکھیں گے

○

قیصر نجفی
(کراچی)

ہوشیار اے جہان خود آرا
رخ بدلتا ہے وقت کا دھارا

ہے کوئی جو مجھے کمک بھیجے
میں ہوں اپنے خلاف صف آرا

مجھ کو گانا ہے زندگی کا گیت
لا ذرا موت اپنا اکتارا

میں نے تو خود پہ فتح پائی ہے
ہیں خجل کیوں سکندر و دارا

فتح مندی سلام کر اس کو
وہ جو آسانی سے نہیں ہارا

ہم یہ کس آسمان پر ہیں جہاں
ٹوٹ جاتا ہے روز اک تارا

وہ لہو کس کے ہاتھ پر ڈھونڈے
تو نے اے زندگی جسے مارا

اب چلے ہو سنوارنے قیصرؔ
کھیل ہی جب بگڑ گیا سارا

○

شکیلہ رفیق
(کینیڈا)

مری ہستی کو کن کی وہ صدا دے
اسے پھر زیست کا حاصل بنا دے

مرے جیون کو اں دھیاروں نے گھیرا
اسے شمع فروزاں کی دعا دے

نہ دیا انگارے اس جھولی میں میری
ادھر بکیا ہے کچھ کلیاں تو لا دے

شکست آثار لمحوں سے بچا کر
سند یسہ کامرانی کا سنا دے

کھڑی ہوں تشنہ لب صحرائے جاں میں
تو اس صحرا کو باران بقا دے

مرے آنگن میں اندھیارا بہت ہے
زرا بجھتے دیئے کی لو بڑھا دے

○

اشرف جاوید
(لاہور)

کرو تکلّفِ بے جا نہ ہچکچاؤ میاں
رہو خوشی سے ، یہاں روز آؤ جاؤ میاں

ہوا کے ساتھ کہاں تک لڑو گے خالی ہاتھ!
جو بچ رہا ہے، اُسی کو سمیٹ لاؤ میاں

پَروں میں مُنہ کو چھپائے قفس میں کیا رہنا
اُٹھاؤ سر، کبھی دیوار و در ہلاؤ میاں

کوئی کواڑ کھلے، کوئی در ہو رنگ آرا
بہت اُجاڑ گلی ہے، صدا لگاؤ میاں

کہاں سے آئے ہو؟ جانا کہاں ہے؟ کون ہو تم!
سناؤ حالِ دلِ زار، کچھ بتاؤ میاں

کیا ہے قطعِ تعلّق، تو اپنے تک رکھّو !
گھروں کے بیچ میں دیوار مت اُٹھاؤ میاں

یہ رات عام نہیں ہے، یہ رات ہجر کی ہے!
یہاں چراغ نہیں جلتا، دل جلاؤ میاں

کہاں سے سیکھ لیا جینے کا ہُنر تو نے !
یہ اِحتیاط بَلا کی، یہ رکھ رکھاؤ میاں

جنابِ میر سے قائم ہے عاشقی کا بھرم
تمھارے جیسے بہت دیکھے، جاؤ جاؤ میاں

○

کھنگی

(پنجابی کہانی تحریر و ترجمہ)

حنیف باوا
(جھنگ)

آج صبح سے ہی آسمان پر کالے بادل چھانے لگے تھے۔ جب وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا تو دیکھا کہ آسمان بادلوں کالا سیاہ ہو چکا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی مینہ ٹوٹ کر برسے گا لیکن ابھی تک تو ایک بوند بھی نہیں گری تھی۔ وہ حویلی کے لان کی جانب برآمدے میں سویا ہوا تھا۔ جتنی حویلی خوبصورت تھی اتنا ہی لان بھی خوبصورت تھا۔ وہ تمام کا تمام پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ سبز گھاس کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے ہریل توتوں کے چھوٹے چھوٹے پر اُگ آئے ہوں۔ مالی نے کاٹ کر اُس گھاس کو ایسے ہموار کیا ہوا تھا کہ گھاس کی ایک بھی شاخ نے فرش سے سر کو اوپر نہیں اٹھایا ہوا تھا۔ ہوا میں قدرے خنکی تھی۔ صحن میں لگائے گئے سفیدے اور یوکلپٹس کے پیڑوں کے نازک پتے اس طرح کھل کھلا کر ہنستے ہوئے لگ رہے تھے جیسے ہوا اُن کے تلووں کو سہلا رہی ہو۔ آج نہ جانے وہ کیوں صبح اتنی جلدی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شائد ٹھنڈی ہوا نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ وہ تو اتنی جلدی اُٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ انگلینڈ میں وہ یونیورسٹی جانے سے تھوڑی دیر پہلے بستر کو چھوڑتا اور جلدی سے تیار ہو کر یونیورسٹی کی طرف چل پڑتا۔ آج اُٹھتے ہی پہلے اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر لان میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کا بھیگا بھیگا سا موسم اُسے بہت اچھا لگا۔ جب اس کی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھی تو اسے کالے سیاہ بادل آنکھوں کے راستے سے اندر اترتے ہوئے محسوس ہوئے اور جیسے اُن بادلوں نے اس کے مرجھائے ہوئے اندر کو تر و تازہ کر دیا ہو۔ وہ اپنے کمرے میں آنے کی بجائے کھیتوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج وہ اس ٹھنڈی میٹھی رُت سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے شائد اُسے ایسے سُندر موسم کو انجوائے کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ بھلا طالب علموں کو زندگی میں ایسے موسموں سے لُطف اٹھانے کے بھلا کب مواقع ملتے ہیں۔ اُن کا تو تمام دن لکھنے پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔ فرید ایسے طلباء میں سے تھا جن کے ہاتھ کبھی کتاب سے مبرا نہیں ہوتے۔ وہ بڑا ذہین طالب علم تھا۔ اسی لیے وہ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق رکھتا تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم تو اپنے گاؤں کے سکول سے ہی حاصل کی تھی پھر وہ لاہور اپنے ماموں کے ہاں چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے میں اُس کے اچھے بھلے نمبر تھے پھر وہ بیرسٹر بننے کے لیے لندن چلا گیا۔ وہاں پر اُس کے بڑے ماموں قیام پذیر تھے۔ وہاں بھی وہ پوری لگن اور شوق سے پڑھتا رہا۔ لندن میں اُس کے ماموں کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ اسی لیے وہاں پر اُسے کسی بھی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ویسے بھی وہ کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ وہ اپنے علاقے کے بہت بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ بھلا وہ روپوں پیسوں کی وجہ سے تنگ دست کیسے ہو سکتا تھا۔ آخیر وہ کئی سالوں کی سخت ریاضت کے بعد بیرسٹر بن کر لوٹ آیا۔ آنے کے بعد اس نے پہلے اپنے چھوٹے ماموں کے پاس کچھ روز گزارے۔ پھر وہ اپنے گاؤں رشید پور آ گیا۔ یہاں آئے ہوئے اُسے ابھی پانچ چھ روز ہی ہوئے تھے۔ آج اُس نے پہلی دفعہ صبح کے خوبصورت نظارے کو دیکھا اور دیکھتے ہی اُس کی سندرتا کے گھیراؤ میں آ گیا۔ فرید کی قانون کے خشک حروف کے ساتھ ساتھ ادب کے بلیغ حرفوں کے ساتھ بھی دوستی ہو گئی تھی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ فرید کو ہر چیز کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلندی اور پستی کا جو تصور لے کر حویلی سے وہ نکلا تھا وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اور پھر انگلینڈ جیسے ترقی یافتہ ملک میں تو ایسے تصور کی پرچھائیں کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسے دیس میں رہتے ہوئے بھلا اُس میں تبدیلی کیسے نہ آتی۔ لیکن جب فرید اپنے گاؤں آیا تو آتے ہی پہلی بات اُس کے والد کے منہ سے یہ سنی گئی۔

''فرید پتر۔ مانا کہ تعلیم نے تیرے اندر وسعت پیدا کر دی ہو گی لیکن یہاں تم نے فرید بن کر نہیں رہنا۔ ایک جاگیردار کا بیٹا بن کر رہنا ہے۔ جیسا تُو یہاں سے جانے سے پہلے تھا۔ یہاں تجھے کتابوں سے حاصل کئے ہوئے علم کو انہیں کتابوں کے صفحات کو لوٹا کر بھول جانا پڑے گا۔ یہاں پر تو نے وہی کچھ کرنا ہے جو میں کہوں گا۔ یہاں رہتے ہوئے تجھے نیچے کی طرف نہیں اوپر کی طرف دیکھنا ہو گا۔ سمجھ گیا نا میری بات کو؟۔۔۔ فرید نے جب اپنے باپ کی بات کو تسلیم کیا تو کچھ اُداس سا ہو گیا تھا۔ باپ کے اندر پند و نصائح کے بعد فرید نے اپنے اندر کی وسعت کو کھرچنے کی بہت کوشش کی لیکن اس میں اُسے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بھلا وہ اتنے عرصے سے نقش ہو چکے اُس احساس کو اتنی جلدی کیسے نکال باہر کرتا۔ جب بھی وہ گھر سے نکل کر گاؤں کی آڑی ترچھی گلیوں میں آتا تو اُس کی نگاہ حویلی کی چوٹی سے سرک کر اُن گھروں پر ضرور پڑتی جن میں رہنے والے بھی فرید جیسا ہی جسم رکھتے تھے۔ جن کی آنکھیں، ہاتھ، کان، ناک فرید جیسے ہی تھے۔ اُس کا بہت دل چاہتا کہ وہ ان مکانوں کے اندھیروں میں جا کر اُنہیں اپنے گلے سے لگائے۔ اُن کے دُکھ سکھ بانٹے۔ لیکن وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکا۔ اسی لیے کہ ہمیشہ اُس کے والد کی نصیحتیں اُس کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتیں۔ اس کے پاؤں جیسے زمین میں دھنس جاتے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ان مکانوں میں نہیں جا سکتا تھا وہ تو ایک ترقی یافتہ اور آزاد ملک سے پڑھا ہوا تھا جہاں پر اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی آزادی تھی۔ ہر کسی سے ملنے کی آزادی تھی۔ جس قدر وہ وہاں رہ کر آزاد خیال ہو گیا تھا اتنا ہی وہ یہاں آ کر پابند سلاسل سا ہو گیا تھا۔ اسی لیے اب اُس کا کوئی فیصلہ اُس کا اپنا نہیں رہ گیا تھا۔ اُسے اب ہر بات کرنے سے پہلے بہت زیادہ سوچنا پڑتا تھا۔ اس صورتِ حال میں اُسے اپنا تمام

پڑھاہوابے کار لگنے لگتا۔لیکن علم کی روشنی اُسے مایوس ہونے سے بچائے رکھتی۔

آج جب وہ صبح سویرے اُٹھا تو موسم کی خوبصورتی اور چڑیوں کے میٹھے گیتوں نے جیسے اُسے سحر زدہ سا کر دیا تھا۔موسم کی اس خوبصورتی اور چڑیوں کی میٹھی چہچہاٹ سے لطف اندوز ہونے میں اب کوئی چیز بھی سرِ راہ نہیں ہوسکتی تھی اس لیے وہ بے دھڑک ہو کر اُٹھا اور لحاف کو پرے کرتے ہوئے چارپائی کے نزدیک پڑے ہوئے جوتے پہنے اور کھیتوں کی جانب چل پڑا۔گاؤں کی تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا وہ باہر کی آزاد فضا میں آ گیا اور پھر وہ اس پگڈنڈی پر ہولیا جس کے دونوں جانب ہری بھری فصلیں ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے کھیل رہی تھیں۔ اُسے ان لہلہاتی فصلوں میں چلنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔باہر آ کر وہ خود کو اس طرح آزاد محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اپنے والد کی حویلی کے بندی خانے سے نکل کر محسوس کرتا تھا۔گاؤں آنے کے بعد وہ پہلی بار براہِ راست فطرت سے ہم کلام ہونا چاہ رہا تھا۔وہ مٹک چال سے چلتا بھی جا رہا تھا اور سلفے کی لاٹ کی طرح لہراتی فصلوں کو ہاتھوں سے چھو بھی رہا تھا ایسا کرتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ان فصلوں کی نرماہٹ اُس کے انگ انگ میں سما رہی ہو۔اس طرح وہ موسم سے لطف لیتا جا رہا تھا۔آخیر وہ پگڈنڈی ختم ہوگئی۔ جہاں پر اس کا اختتام ہوا وہاں پر ایک ٹیوب ویل لگا ہوا تھا۔ٹیوب ویل کا پانی ایک جھرنے کے پانی کی طرح کھیلتا ہوا جس پکے کھال سے ہو کر گزر رہا تھا اُس کے کنارے پر بیٹھی ہوئی گاؤں کی لڑکیاں کپڑے دھو رہی تھیں۔فرید کو وہ کپڑے دھوتی ہوئی دوشیزائیں بہت اچھی لگیں لیکن ان کے نزدیک جانے کا اُسے حوصلہ نہ ہوا اور وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور اُن کی طرف بڑبڑ دیکھنے لگا۔اُس کا من تو یہ چاہتا تھا کہ وہ اُن کے پاس جا کر اُن سے میٹھی میٹھی باتیں کرے۔اُن کے دکھ سکھ میں شریک ہو لیکن ایسا کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔اس لیے کہ اُس کے اندر اُس کا والد چھپا بیٹھا تھا۔جب کبھی بھی اُس کے اندر لوگوں کے ساتھ ربط بڑھانے کا احساس اُبھرتا تو اُس کا والد اُس کے اندر سے فوراً باہر آ جاتا اور اُس کے اس احساس کو ایک ہی گھونٹ میں پی لیتا۔ اُس وقت بھی وہ اُن کے نزدیک جانے کی بجائے سلہے مراثی کی چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔سلہا ٹیوب ویل آپریٹر دے طور تے کم کردا سی۔وہ صرف یہی ایک کام نہیں کر رہا تھا اور بھی اُس کے ذمے بہت ساری ذمہ داریاں تھیں لیکن جس وقت فصلوں کو سینچنا ہوتا اُس وقت وہ تمام دن ٹیوب ویل پر ہی رہتا۔آج بھی وہ ٹیوب ویل کے پاس چھپر کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔فرید کو دیکھتے ہی وہ چارپائی سے فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''دھن بھاگ ہمارے آپ نے ہم غریبوں کی جانب بھی چکر لگایا۔ آئیں منجی پر بیٹھیں''

''نہیں یار تو بیٹھ۔''فرید کا جواب تھا۔

''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کھڑے رہیں اور آپ کا نوکر بیٹھ جائے۔''سلہا نہایت عاجزی سے بولا۔

''لے یار اگر تو چاہتا ہے تو میں بیٹھ جاتا ہوں'' کہہ کر فرید پائنتی کی طرف ہو کر بیٹھنے لگا لیکن فرید کی نظر کبھی کبھار اب بھی حویلی کی جانب چلی جاتی۔

''نہیں چوہدری جی۔۔۔ یہاں نہیں، اُدھر''سُلہے نے سرہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔''آپ سرہانے کی جانب ہی بیٹھے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔''

''یہاں بیٹھنے سے کیا میری شان میں کمی آ جائے گی''فرید کے اندر کا چوہدری جیسے سُوں گیا تھا۔

''نہیں ایسی بات تو نہیں۔لیکن چوہدری کا کام پائنتی پر بیٹھنا نہیں۔ یہ کام تو ہمارے جیسے کمیوں کا ہے۔''

''یہ بات ہے تو تُو سرہانے کی طرف ہی بیٹھے گا۔''فرید نے اُسے زبردستی بازو سے پکڑ کر سرہانے کی طرف بٹھا دیا۔

''یہ کیا کیا فرید جی آپ نے''سلہے نے جیسے خود کو گناہگار سمجھتے ہوئے کہا۔''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے تو آپ کو سرہانے کی جانب بٹھایا ہے۔''اتنی بات کہتے ہوئے فرید وہاں سے چل پڑا۔

''بیٹھیں چوہدری صاحب''سلہے نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''بس یار اب میں چلتا ہوں۔''فرید نے پیچھے مڑ کر کہا۔

فرید نے اب اگلے کھیتوں کی طرف رُخ کر لیا۔وہ حویلی سے جیسے جیسے دُور ہوتا جا رہا تھا اُس کے اندر آزادی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر آسمان کی اور دیکھنے لگا۔آسمان پر بادلوں کی آمد و رفت اُسی طرح جاری تھی۔ہوا کے جھونکوں کی تیزی میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی تھی۔لیکن صبحِ صادق کے وقت جو خنکی تھی اُس میں کچھ کمی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔پر پھر بھی فرید صبح کی مانند اس موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔اور آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔آگے سرسوں کی فصل اپنے جوبن پر تھی۔اس کے زرد رنگ پھولوں کو دیکھ کر فرید بڑا خوش ہوا۔یہ سرسوں شاید وقت سے پہلے کاشت کی ہوئی تھی۔اسی لئے جلد پھولوں نے بہار کا رنگ جما دیا تھا۔پھولوں کی سندرتا اُس کے اندر اترتی جا رہی تھی۔ وہ انہیں نرم ہاتھوں سے سہلانے لگا۔ایسا کرتے ہوئے اُس کے اندر جیسے کچھ ٹھنڈسی پڑ گئی تھی۔اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی دوشیزہ کے ملائم بالوں کو چھیڑ رہا ہو۔کچھ دیر تک تو وہ مسلسل پھولوں کو سہلاتا رہا اور اپنے اندر خنکی اُتارتا رہا۔پھر اُس نے ایک گچھا توڑا اور اُس کے ساتھ جیسے کھیلنے لگا۔فرید آگے بھی بڑھتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گچھے سے کھیل بھی رہا تھا۔آگے کچھ خواتین کپاس کے کھیت میں کھڑی تھیں شاید وہ کپاس چُن رہی تھیں۔وہ چاہنے لگا کہ وہ ان کے نزدیک جا کر رُک جائے اور انہیں کپاس چُنتی ہوئی دیکھتا رہے۔اس لیے وہ کھیت کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔اس کے نزدیک ہی وہ پھُٹی چن رہی تھیں۔جب انہوں نے چھوٹے چوہدری کو دیکھا تو انہوں نے اپنا کام

بند کر دیا اور اُس کے پاس آ گئیں۔

''آپ نے اپنا کام کیوں بند کر دیا۔ جاؤ جا کر کپاس چُنیں۔ میں تو تمہیں یہ کام کرتے ہوئے دیکھنے آیا تھا۔''

''کپاس چُننا تو ہمارا روز کا کام ہے۔ آپ نے کونسا ہمارے پاس روز آنا ہے۔''

''کیا میں ہر روز نہیں آ سکتا؟'' فرید نے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔

''آ سکتے ہیں۔ چوہدری صاحب آپ تو جب چاہیں آ سکتے ہیں۔'' تمام نے ایک زبان ہو کر کہا۔

''چوہدری کو آپ چھوڑیں۔ جائیں جا کر پھُٹی چُنیں۔ آپ پھُٹی چُنیں گی تو میں آپ کو دیکھتا رہوں گا''

''اس طرح کھڑے ہو کر آپ اچھے نہیں لگتے۔ میں دوپٹہ بچھا دیتی ہوں تو آپ اس پر بیٹھ جائیں۔'' اُن میں سے ایک نے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔

''نہیں نہیں یہ نہیں کرنا۔ میں اس طرح ہی ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک ہے پھر جتنی دیر تک آپ یہاں کھڑے رہیں گے ہم بھی نہیں بیٹھیں گی اور یہیں کھڑی رہیں گی۔''

''اگر آپ نے یہاں کھڑے ہی رہنا ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔ ویسے آپ مجھے کپاس چُنتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔''

اتنی بات کہہ کر فرید وہاں سے جلدی چل پڑا۔ ان میں سے جو ضعیف العمر تھیں وہ پھر سے کپاس چُننے میں مصروف ہو گئیں۔ جو جوان تھیں وہ اُسے دُور تک دیکھتی رہیں جب تک وہ آنکھ سے اوجھل نہیں ہو گیا وہ بُت بن کر وہیں پر کھڑی رہیں۔

''کتنا خوبصورت ہے فرید بابو۔۔۔ اُن کی آنکھیں جیسے بول بول کر کہہ رہی ہوں۔''

فرید اب ایک اور پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اُس پگڈنڈی کے آس پاس بھی فصلیں ہی فصلیں لہرا رہی تھیں۔ وہ چلتا ہوا کبھی فصلوں کو دیکھتا اور کبھی آسمان کی جانب نظر اٹھا لیتا۔ آسمان پر بکھرے بادلوں کا رنگ اب کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ کالے سیاہ بادلوں کی جگہ اب سلیٹی رنگ کے بادلوں نے لے لی تھی۔ ہوا میں کچھ اور خنکی آ گئی تھی۔ لیکن فرید اس موسم کو بھی انجوائے کرتا جا رہا تھا۔ یہ پگڈنڈی تو دُور تک آگے ہی آگے جا رہی تھی لیکن آگے فصلیں ختم ہو گئی تھیں۔ سامنے تو خالی کھیت ہی کھیت تھے۔ فرید فصلوں کے اختتام پر ہی رُک گیا۔ اُس کا آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا بھلا انجوائے کرنے کو خالی کھیتوں میں کیا رکھا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا اس کے دائیں طرف زمین سرسبز گھاس سے بھری پڑی تھی۔ فرید کی نظر فوراً اُدھر اُٹھ گئی۔ گھاس بڑی تازہ اور شبنم سے بھی بھیگی ہوئی تھی۔ بھلا ایسی سرسبز گھاس کسے نہیں بھائے گی۔ فرید کو بھی اس تازہ اور ملائم گھاس نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پگڈنڈی سے دست کش ہو کر گھاس میں گھُس گیا۔ ابھی وہ کچھ دیر ہی چلا تھا آگے اُس نے دیکھا کہ ایک شخص گھاس کھودنے میں مصروف تھا۔ وہ شخص ستر پچھتر سال کا بوڑھا تھا۔ اُس نے قمیص اتار رکھی تھی اور صرف کمر کے گرد ایک پرانا سا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ وہ کرموں گھسیارا تھا۔ گھاس کاٹتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن پھر بھی وہ کھرپا چلائے جا رہا تھا۔ اُس کے کھرپے کا پچھلا حصہ قدرے ٹوٹا ہوا تھا اور اُس پر میل کی کئی تہیں جمی ہوئی تھیں اور اُس کا پھل بھی گھس کر باریک ہو چکا تھا۔ کھرپے کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے گھسیارے اور اُس کھرپے کی عمروں میں کوئی خاص تفاوت محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ فرید آہستگی سے اُس کے پاس گیا اور اُس کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ کرموں اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کے عقب میں کون بیٹھا ہے۔ کچھ دیر کے بعد کرموں بابا اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید اُس کی گھاس پوری ہو چکی تھی جب اُس نے اپنی گردن پیچھے کی طرف موڑی تو دیکھا پیچھے چھوٹے چوہدری صاحب بیٹھے ہوئے تھے وہ اُسے دیکھ کر حیران ہو کر بولا۔

''چوہدری جی آپ یہاں؟'' بڑھاپے کی وجہ سے اُس کی آواز قدرے لڑکھڑا رہی تھی۔

''کیا میں یہاں نہیں آ سکتا؟''

''آ سکتے ہیں۔ کیوں نہیں آ سکتے؟ آپ کو کون روک سکتا ہے بھلا یہاں آنے سے'' کرموں کے لہجے میں بڑی بے چارگی تھی۔

''لیکن آپ نے گھاس کاٹنا کیوں چھوڑ دیا؟''

''میں نے حسبِ ضرورت گھاس پوری کر لی تھی۔''

اب آپ دوبارہ کھرپہ نہیں چلا سکتے۔

کیوں نہیں جی۔ بابا گھسیارا بھلا اپنے چوہدری کی بات کو کیسے رد کر سکتا تھا۔ اس نے کھرپا پکڑا اور ویسے ہی گھاس کی جڑوں میں گھمانے لگا۔

''بابا ذرا کھرپا مجھے پکڑانا۔''

بابا گھاس کاٹنے سے رک گیا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔

''یہ لیں چوہدری صاحب''

فرید نے کھرپا پکڑا اور بڑے بے ڈھنگے پن سے گھاس کی جڑوں میں مارنے لگا۔ کرموں گھسیارا فرید کو اس طرح کھرپا چلاتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

''چھوٹے چوہدری صاحب کھرپا چلانا آپ کا کام نہیں۔ یہ کام ہمارے جیسوں کو ہی اچھا لگتا ہے۔''

''کوئی کام بھی کسی کی میراث نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نا میں کر کے دیکھوں اس کام کو۔''

''آپ بڑے لوگ ہیں یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔''

دراصل آپ گھاس کاٹتے ہوئے مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ کیوں نہ میں بھی اچھا بن کر دیکھوں۔

باقی صفحہ۷۲ پر ملاحظہ کیجیے

ریشماں

شائستہ عالم

(کیلیفورنیا)

بھینسوں کے باڑے میں گھاس پھوس کے ڈھیر کے اندر چھپی ہوئی بارہ سال کی معصوم ریشماں سخت دہشت زدہ تھی۔ بھوک اور پیاس کی شدت نے اسے بے حال کیا ہوا تھا اسکی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ کوئی دو گھنٹے پہلے یہاں اسے اسکی بھابی چھپا گئی تھی۔ گھاس کے انبار کے اندر اسے دفن کرنے سے پہلے اس نے روتے ہوئے اسکے دونوں رخسار اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا'' دیکھ ریشماں یہاں سے اس وقت تک باہر نہ نکلنا، جب کہ میں خود تجھے نہ نکالوں۔ تیرا بھائی جان سے مارنے کو تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اگر تو اسے مل گئی تو وہ تجھے مار ڈالے گا'' اور کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے معصوم ریشماں نے خالی خالی نظروں سے بھابی کو دیکھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ بھائی اسے کیوں مارنا چاہ رہا ہے۔ اس نے ایسا کیا کیا ہے؟ وہ تو جب اسکول سے واپس آتی تھی تو بھابی اسے کھانا کھلاتی تھی اور وہ اپنا اسکول کا کام ختم کر کے باہر اپنی سہیلیوں کے ساتھ شام کو کھیلنے نکل جاتی تھی واپس آنے پر بھائی گھر پر ہوتا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتا۔ سب مل کر رات کا کھانا کھاتے، ہنستے بولتے۔ بھائی اپنے سارے دن کی روداد بھابی کو سناتا، کسی بات پر وہ ناراض ہوتا اور کسی بات پر خوش ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے اسے نیند آنے لگتی تو بھابی اسے اس کے کمرے میں سُلا آتی۔

مگر آج ایسا کیا غضب ہو گیا، نہ اسے کھانا ملا نہ پانی۔ گھر آتے آتے اسے سخت بھوک لگی ہوئی ہوتی تھی۔ بستہ پھینک کر وہ بڑے نخرے سے ٹھنک کر کہتی ''بھابی مجھے کھانا دو بڑی بھوک لگی ہے'' اور بھابی اسے ایک محبت بھری میٹھی سی ڈانٹ لگا کر کہتی 'جا تو پہلے ہاتھ منہ تو دھو لے پھر دیتی ہوں کھانا'' اور وہ مزے سے کھانا کھاتی اور بھابی سے باتیں کرتی جاتی۔ مگر آج وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ بھابی نے اسے لپک لیا اور تقریباً گھسیٹتی ہوئی بھینسوں کے باڑے میں لے آئی۔ کیا ہوا، کیا ہوا بھابی؟ وہ پوچھتی ہی رہی؟ بھابی مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی رہی اور اسے چھپے رہنے کی نصیحت کر کے واپس چلی گئی۔

وقفے وقفے سے گھر کے اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ اسکا بھائی قادر پاگلوں کی طرح اسے پورے گاؤں میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ وہ بار بار گھر کے اندر آ کر بیوی سے اس کا پوچھتا جس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آج وہ گھر ہی نہیں آئی۔ اور وہ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح باہر اسکی تلاش میں نکل جاتا۔

ماجرہ یہ تھا کہ قادر کی زمین اس کے چچا زاد بھائی سلطان کی زمین سے جڑی ہوئی تھی۔ آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا۔ کبھی سلطان کی بھینسیں قادر کی زمین پر آ کر اسکی فصل چٹ کر جاتیں، کبھی پانی کا جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ پانی میں انکی برابر کی حصہ داری تھی مگر سلطان اکثر اس واحد ٹیوب ویل کے پانی کا رخ اپنی زمین کی طرف موڑ دیتا۔ بدقسمتی سے ٹیوب ویل سلطان کی زمین کے حصے میں آتا تھا مگر حق دار قادر بھی تھا۔ سلطان کی اس بددیانتی کی وجہ سے اکثر فساد کی نوبت آ جاتی۔ لڑائی جھگڑا ہوتا۔ صلح صفائی کرا دی جاتی، جھگڑا ٹمک جاتا اور کچھ دنوں کو سکون ہو جاتا، مگر دیرپا نہیں۔ آج پھر وہی پانی کا ہی مسئلہ تھا۔ سلطان نے پھر پانی کا رخ اپنی زمین کی طرف موڑ لیا تھا۔ قادر اور سلطان کی پھر لڑائی ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت گاؤں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں تھے۔ ویسے بھی وہ اس روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ چکے تھے کوئی صلح صفائی کو نہ آ سکا۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی معاملہ اتنا بڑھا کہ آن کی آن میں وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا، دونوں نے ہتھیار اٹھا لئے اور جو ہونا تھا وہ ہو گیا، قادر کو جب تک ہوش آتا سلطان اس کے ہاتھوں اپنے ہی کھیتوں میں مارا جا چکا تھا۔

حواسوں میں آنے کے بعد معاملے کی سنگینی کا احساس ہونے پر قادر اسکی لاش کھیت میں ایک جگہ چھپا کر گھر آ گیا۔ گھر آتے آتے اسکا دماغ ایک منصوبہ بنا چکا تھا۔ عزت اور جان بچانے کے لئے اس سے اچھا طریقہ اسے سوجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

گھر میں گھستے ہی اس نے اپنی بیوی سے ریشماں کا پوچھا، معلوم ہوا کہ وہ ابھی اسکول سے نہیں آئی۔ بیوی نے پوچھا وہ کیوں ریشماں کا پوچھ رہا ہے مگر قادر کچھ نہ کہتے ہوئے پھر باہر نکل گیا۔ ریشماں کی بھابی گاؤں ہی میں پلی بڑھی تھی اسے معلوم تھا کہ یہاں کیا کیا ہوتا ہے۔ عزت اور بے عزتی کے معمولی معاملات کو لوگ اپنی انا کا مسئلہ بنا کر کیسے کیسے انسانی جانوں سے کھیلتے ہیں، گھر کے گھر اجاڑنے کے بعد بھی انہیں اپنے فعل پر ذرہ برابر شرم اور افسوس نہیں ہوتا۔ قادر کی آنکھوں میں اترتے ہوئے خون کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہ رہا ہے۔ سارا معاملہ تو اسکی سمجھ میں نہیں آ سکا مگر وہ بے چینی سے ریشماں کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔

قادر نے چار سال کی ریشماں کو اسکی گود میں اس وقت ڈالا تھا جب وہ دلہن بن کے قادر کی زندگی میں آئی تھی۔ بدقسمتی سے وہ ماں نہ بن سکی تھی۔ اس نے اپنی معصوم نند پر ہی اپنی ساری مامتا لٹا دی اور آج اسکی ممتا خطرے میں تھی۔ ریشماں کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر اسے اپنی بانہوں میں دبوچا اور بھینسوں کے باڑے میں چھپا کر گھر آ گئی۔ اسکا ذہن بس ایک ہی بات سوچ رہا تھا'' اب کیا ہوگا'' کہ اچانک لات مار کر قادر دروازہ کھول کر اندر آ گیا آتے ہی اس نے بیوی کے بال پکڑ لئے'' کہاں ہے؟ کہاں چھپایا ہے اسے تو نے؟''۔۔'' کہیں نہیں قادرے، کہیں

نہیں۔۔وہ گھر پرنہیں ہے‘‘ جھٹکا دے کرقادر نے اسے زمین پر گرادیا۔وہ پورے گاؤں کو کھنگال چکا تھااوراب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اور کہیں نہیں، گھر پر ہی ہے۔گھڑی کی گھڑی وہ کچھ سوچ رہا تھا،اسکی آنکھیں جوخون کے رنگ کی طرح سرخ ہورہی تھیں چمکیں اوروہ بھینسوں کے باڑے کی طرف لپکا۔بھابی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے’’چھوڑ دے قادرے چھوڑ دے۔۔بچی ہے‘‘ قادر نے پلٹ کر اسے دیکھا’’تونے اسے باڑے میں چھپایا ہے؟‘‘ اس نے جھٹکے سے اپنی ٹانگیں بیوی کی گرفت سے چھڑائیں ۔بھابی بدحواس ہوکر دوپٹہ چھوڑ کر اسکے پیچھے بھاگی۔۔’’قادرے چھوڑ دے۔۔تیری بہن ہے۔بچی ہے۔اسکی کوئی خطانہیں‘‘ مگر قادر موت کی طرح باڑے میں پہنچ چکا تھا۔ بھائی اور بھابی کی چیخ وپکار تھرتھر کانپتی ہوئی ریشماں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسکا معصوم وجودسراپا خوف بن چکا تھا۔

بھائی اسکے سر پرپہنچ گیا۔پاگلوں کی طرح گھاس پھوس کے ڈھیر میں وہ اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ریشماں گھاس کے ڈھیر سے نکل کرکھڑی ہوئی بھینسوں کے بیچ میں جا کر چھپ گئی۔یہ وہ بھینسیں تھیں جن سے وہ کھیلتی تھی۔انہیں چارہ کھلاتی تھی وہ ان سے بہت پیار کرتی تھی وہ بھی اس سے پیار کرتی تھیں۔آج وہ ذرا کی ذرااسکی پناہ گاہ بن گئی تھیں۔معصوم حیوان اسے ایک انسان کی حیوانگی سے بچانے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر ناکام تھیں۔بھابی کی فریادیں جاری تھیں اور بھائی پورے باڑے کا چکر لگا کرآخرکار بھینسوں کے طویلے پرپہنچ گیا۔بھینسوں کی ٹانگوں میں چھپی تھرتھر کانپتی ہوئی ریشماں اسے نظر آ ہی گئی۔اس نے اسے وہاں سے گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا اورقریب پڑی تیز کھرپی ہاتھوں میں اٹھالی۔لرزتی کانپتی تھرتھراتی بھابی نے آخری کوشش کے طور پر اسکی ٹانگیں دوبارہ پکڑ لیں’’چھوڑ دے قادرے تیری بہن ہے،معصوم ہے۔۔بے گناہ ہے‘‘اسکی آواز اسکا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

اور قادرے کے کانوں تک اس کی التجائیں پہنچ بھی نہیں رہی تھیں۔اسکی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔خوف سے نڈھال۔۔دہشت زدہ ریشماں کا کام تمام کرنے میں اسے ذراوقت نہ لگا۔

سلطان کی لاش کے پاس ریشماں کی لاش ڈال کرقادر نے سلطان کے قتل کا جواز فراہم کر دیا تھا!!!

- بقیہ -

کھنگی

’’آپ ایسے ہی بہت اچھے لگتے ہیں۔‘‘ بابے گھسیارے نے تعریف کے رنگ میں کہا۔

بابے گھائی کی یہ بات سُن کرفرید نے مزید کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور کھرپا بابے گھسیارے کے ہاتھ میں پکڑادیا۔بابے نے کھرپا پکڑ کر نیچے رکھ دیا۔خوداکیلے ہی گھاس کی ڈھیریوں کو یک جاہ کر کے ایک کپڑے میں باندھنا چاہالیکن اکیلے کیسے باندھا جاسکتا تھا۔فرید نے بنا کچھ کہے گٹھڑی باندھنے میں اُس کی مدد کی۔گٹھڑی باندھی جاچکی تھی لیکن وہ تنہا اُسے کیسے اُٹھاتا۔اُس نے اُٹھانے کی کوشش تو کی لیکن فرید کو کہنا مناسب نہ سمجھا۔کہتا کیسے۔ایسے کاموں کے لیے بھلا چوہدریوں کو کیسے کہا جاسکتا تھا؟ لیکن فرید ساری بات کو سمجھ گیا تھا۔کرموں کو گٹھڑی سے اس طرح کُشتی کرتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا۔

’’ٹھہر بابا ذرا میں اُٹھوادیتا ہوں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے فرید آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے گٹھڑی کو اُٹھا کر ایک جھٹکے سے اُس کے سر پر رکھ دی۔

’’بھلا ہو پُتر تیرا‘‘ بابے نے دعائیہ انداز میں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

’’بابا کرمو!اس میں بھلے کی کونسی بات ہے بھلا۔‘‘فرید کی اس بات کے بعد بابے کے ہونٹ جیسے سِل سے گئے۔وہ مزید کچھ نہ بولا۔آخیراُس نے فرید کو سلام چوہدری صاحب کہا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔بابا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا جارہا تھا۔گٹھڑی کے بوجھ تلے اُس کی کمر دوہری ہوتی جارہی تھی۔ فرید اُسے جاتے ہوئے کو دیکھتا رہا اور منہ میں انگلی دبا کر سوچنے لگا۔شاید اُسے اُس پر ترس آرہا تھا۔اسی لئے اُس کی سوچوں نے حرفوں کا روپ دھارلیا۔

یہ گٹھڑی میں نے کیوں نہ اٹھائی۔اس سے بھلا میرا کیا بگڑ جاتا۔بلکہ مجھے تو یہ چاہیے تھا کہ اس گٹھڑی کو اُس کے گھر تک پہنچاتا۔

جب بابا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو فرید سامنے سے نظریں ہٹا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔اب پھر سے کالے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔موسم ایک بار پھر سہانا ہو گیا تھا۔

بابے کے اوجھل ہونے کے بعد فرید بھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔لیکن جاتے ہوئے اُس کے اندر سے دوسری سوچ اُبھری جیسے جیسے وہ حویلی کے قریب ہوتا گیا وہ سوچ گہری ہوتی گئی۔وہ سوچ تھی:

’’شاید میں بابے کی میلی کچیلی گٹھڑی کو کبھی نہ اُٹھاتا۔کبھی بھی نہ۔‘‘

عید کا فرشتہ

رونق جمال
(درگ، بھارت)

شہر کے بازاروں میں چاروں طرف عید کی رونقیں اپنے شباب پر تھیں۔ دکانیں اُبل کر سڑکوں پر آ گئی تھیں اور گاہکوں کو للچارہی تھیں۔ عالی شان کپڑے جوتے ٹوپیاں رنگ برنگی چوڑیاں طرح طرح کے میک اپ کے سامان مہندی، میوے، سوئیاں اور خوشبوعات وغیرہ۔ احمد کے گھر میں یتیمی راج کر رہی تھی۔ ماں کسی رئیس کے گھر برتن مانجھنے جاتی تھی اور وہ تینوں بہن بھائی عمر کی مناسبت سے ماں کا ہاتھ بٹانے کی تگ ودو میں لگے رہتے۔ احمد سڑکوں اور گلیوں میں پلاسٹک کاغذ اور پٹھے چن کر کباڑی کو بیچ دیتا اور چار پیسے کما کر ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا تو ماں ممتا سے اُس کی پیشانی چوم لیا کرتی تھی۔ بازار میں عید کی رونقیں بڑھی تو احمد کی کمائی بھی بڑھ گئی تھی۔ اُسے معمول سے زیادہ جھلیاں کاغذ اور پٹھے ملنے لگے تھے۔ اس لیے وہ صبح صبح اُٹھ کر بازار پہنچ جایا کرتا تھا تا کہ دوسرے لڑکوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ ڈھیر ساری جھلیاں کاغذ اور پٹھے جمع کرلے۔ رات کو بھی وہ دیر گئے تک بازار کی خاک چھانتا رہتا تھا کیونکہ دکاندار دکان بند کرنے سے پہلے جھاڑو لگا کر کچرے کا ڈھیر سڑک پر پھینک دیا کرتے تھے۔ احمد لپک کر ڈھیر سے اپنے کام کی جھلیاں کاغذ اور پٹھے کے ڈبے وہاں سے اُٹھا لیا کرتا تھا۔

رمضان کا آخری عشرہ تھا۔ طاق راتیں شروع ہو چکی تھیں۔ بازار میں گہما گہمی بڑھ گئی تھی۔ بچے ماں باپ کی اُنگلیاں تھامے خریداری کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے۔ احمد بچوں کو ماں باپ کے ساتھ دیکھ کر اپنی یتیمی پر مایوس ہو جاتا تھا۔ اُس کی مایوسی اُس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی جب وہ بچوں کو اپنے پسند کے کپڑے جوتے ٹوپیاں خریدتے دیکھتا یا بڑی بڑی تھلیاں ہاتھوں میں اُٹھائے اُن کے چمکتے ہوئے چہروں کو دیکھتا۔ یتیمی کا ناگ اُسے اندر ہی اندر ڈسنے لگتا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ بول پاتا نہ کچھ کر پاتا۔ ایک خاموش آہ نکل جاتی اور وہ بے بسی سے سر جھکائے آگے بڑھ جاتا۔ آج اُس نے بازار کے تین چکر لگائے تھے اور چوتھی بار رات کا کھانا کھا کر نکلا تھا۔ بازار میں وہی چہل پہل وہی گہما گہمی دیکھ کر وہ بھی یوں ہی دکانوں میں سجے سامان کی زیارت کرنے کی غرض سے گھومنے لگا۔ ایک دکان کے باہر سجے بچوں کے کپڑے دیکھ کر اُس کے قدم رک گئے اور وہ کھڑے کھڑے شاندار کپڑوں کو نہارنے لگا۔ اُس کی نظریں ایک خوبصورت بشرٹ پر جا کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ اُس بشرٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا نہار رہا تھا اور سوچ رہا تھا اے کاش اُس کے ابو زندہ ہوتے تو وہ ضد کر کے یہ بشرٹ خریدتا۔ یہ سوچ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں وہ روک نہیں سکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہچکیاں مار کر رونے لگا اور آگے بڑھ گیا۔ اب اُس کا دل بھی رو رہا تھا۔ اس لئے وہ سیدھا گھر پہنچا اور خاموشی سے بستر میں گھس کر سو گیا۔

نیند کی دیوی نے پوری طرح اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اس لیے وہ بُڑبُڑا رہا تھا۔ ''ابو مجھے وہ والی بشرٹ دلا دو۔۔۔ ابو۔۔۔ ابو کتنی خوبصورت بشرٹ ہے وہ۔۔۔ اُسے پہن کر میں عیدگاہ پر جاؤں گا تو میرے درست اُس بشرٹ میں مجھے دیکھ کر حیرت زدہ ہو جائے گے۔۔۔!! کہ احمد نے کتنی شاندار بشرٹ خریدی ہے۔۔۔ کتنا جچ رہا ہے احمد اُس بشرٹ میں۔۔۔!! دلا دو نا ابو۔۔۔ پلیز۔۔۔!!!

نیند میں احمد کے بُڑبُڑانے اور رونے کی آواز سن کر اُس کی ماں اس کے قریب آ گئی اور غور سے اُس کی بڑبڑاہٹ کو سُننے لگی۔ بیٹے کی بُڑبُڑاہٹ کو سُن کر ماں کا کلیجہ کانپ گیا اور اُس نے بیٹے کو نیند سے جگا کر سینے سے لگا لیا۔

''میرے لال۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تجھے۔۔۔!؟ تو یہ کیا بُڑبُڑا رہا ہے؟ کونسی بشرٹ ہے وہ!!؟؟ بیٹا تو یتیم ہے اور میں بیوہ ہوں۔۔۔!! ایسے خواب مت دیکھ بیٹا جو پورے نہ ہو سکیں۔۔۔!!''

اور وہ بیٹے کو لپٹا کر زاروقطار رونے لگی۔ عید۔۔۔! عید کی خوشیاں بچوں کی فرمائشیں اُس کی مجبوریاں، غربت، پریشانیاں، بے بسی اور احمد کی بُڑبُڑاہٹ نے اُسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ آج وہ پھر سے بیوہ ہو گئی ہے!! اسی اثنا میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ حیران رہ گئی کہ اتنی رات گئے کون ہوگا۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کون ہیں آپ۔۔۔؟''

''میں ارشد خان ہوں۔۔۔ خان ڈریس سینٹر کا مالک۔۔۔!! اس گھر میں تھوڑی دیر پہلے ایک بچہ داخل ہوا تھا۔ شاید وہ آپ کا بیٹا ہے۔!! تھوڑی دیر پہلے میں اُس کا پیچھا کرتے ہوئے آپ کا گھر دیکھ کر گیا تھا۔ معاف کرنا دکان جا کر لوٹ کر آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی!!

''کیوں کیا کیا ہے احمد نے۔۔۔؟''

''ارے نہیں۔۔۔ گھبرایئے مت کچھ نہیں کیا ہے آپ کے بیٹے نے وہ تو بہت ہی پیارا بچہ ہے!!'' تب تک احمد بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ احمد کو دیکھ کر ارشد خان نے کہا:

''ہاں میں اسی بچے کی بات کر رہا تھا۔ آپ کا یہ بچہ بہت لائق ہے میں اسے پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ بڑی محنت سے کاغذ جھلیاں اور پٹھے جمع کرتا ہے۔ بہت محنتی ہے۔ آج یہ میری دکان میں سجی ایک بشرٹ کو نہارتے نہارتے رونے لگا تھا۔ اُسے روتا دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ بشرٹ میں اسے دوں گا۔ میں نے دکان سے باہر نکل کر اسے آواز بھی دی تھی لیکن شاید یہ سُن نہیں سکا ہوگا۔ اس لیے میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے آپ کے گھر تک آ کر آپ کا گھر دیکھ کر دکان لوٹا اور یہ اس کے پسند کی بشرٹ لے کر آیا ہوں۔ آپ یہ

باقی صفحہ ۹۵ پر ملاحظہ کیجیے

آخری نشان

میر صاحب حسن
(ممبئی، بھارت)

''اے بھوجی! کہاں جات ہو؟'' سبھاش نے راجدوت دھیمی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''کہاں جئیہے؟ جہاں تو جات ہا.....اوہیں...... کچہڑی''۔سیتلا دیوی نے جواب دیا

''چلا بَیٹھا پچھواں..... چھوڑ دیب..... جلدی آوا'' سیتلا دیوی کچھ سوچتے ہوئے راجدھوت پر بیٹھ گئی۔پندرہ کلومیٹر کا طویل سفر دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔کچہری کے دروازے پر پہنچ کر سبھاش نے بائیک روک دی۔سیتلا دیوی خاموشی سے اتر کر اندر چلی گئی۔سبھاش نے بھی گاڑی پارک کی اور اندر کورٹ نمبر۳رمیں چلا آیا جہاں پہلے سے ہی اس کا وکیل موجود تھا۔

کچھ دیر بعد منادی نے آواز دی۔

''کیس نمبر۳۷۷/۱۸۲اے۔سبھاش یادو بمقابلہ سورج یادو''۔

کیس کی شنوائی شروع ہو چکی تھی۔سبھاش اپنے وکیل کی جانب پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ سورج یادو آج نہیں آیا تھا اس لئے اس کی پتنی سیتلا دیوی موجود تھی۔سورج یادو کے وکیل اوماشنکر نے ایک مہینے بعد کی تاریخ لے لی تھی اور شنوائی پوری ہو چکی تھی۔

ایک دروازے سے سیتلا دیوی اپنے وکیل سے باتیں کرتے ہوئے باہر آئی۔اور اس کے سامنے سے ہی اس کا دیور سبھاش اپنے وکیل چندر بھان سنگھ کے ساتھ کینٹن کی طرف نکل گیا۔

صحن میں بیٹھے دونوں کنبوں کو، جو کبھی ایک ہوا کرتے تھے، اشوک یادو بڑی دیر تک نہارتا رہا۔دونوں ہی طرف دیواروں پر، دروازے پر، یہاں وہاں خون کے نشان تھے، جسے گزرتے وقت نے سُکھا کر نشان کی صورت میں رہنے دیا تھا۔کچھ دیر بعد اشوک اٹھ کر دھیرے دھیرے صحن میں ٹہلنے لگا۔وہ بچ بچ کر چل رہا تھا جیسے اس کے پیر کسی کو لگ نہ جائیں حالانکہ صحن خالی تھا، زمین میں برسوں کی دھول مٹی جمع تھی مگر اشوک کے ذہن میں وہاں کئی لوگ تھے۔

ریاست اتر پردیش میں ایک بہت مشہور ضلع ہے اعظم گڑھ، اسی ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں رام گڑھ ہوا کرتا تھا...شاید اب بھی ہے۔ارے نہیں..... نہیں..... فلم ''شعلے'' والا رام گڑھ نہیں۔اس رام گڑھ میں نہ تو ٹھاکر تھا جو گبر سنگھ کو اپنی ٹھوکروں سے مار گراتا اور نہ ہی بسنتی جس کی باتیں دلوں کو لبھاتیں۔ہاں قرب وجوار میں ڈاکو دھرمو سنگھ کا نام ضرور مشہور تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رابن ہوڈ ٹائپ کا تھا۔یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ پکی سڑک سے ایک چھوٹا سا راستہ گاؤں تک جاتا تھا۔راستے میں دونوں طرف کھیت تھے۔ایک طرف گنے لہلہاتے تو دوسری طرف کوئی دوسری فصل تیار ہوتی۔ پکی سڑک سے اترتے ہی داہنے ہاتھ کی طرف ایک بستی نظر آتی تھی جسے 'فقیرانہ' کہا جاتا تھا اور بائیں طرف 'ہریجن' رہتے تھے۔تھوڑا سا آگے بڑھ کر ایک ٹیوب ویل نظر آتا تھا جسے اس گاؤں کے سب سے بڑے رئیس دھنپت یادو نے بنوایا تھا تا کہ کھیتوں میں پانی پہنچ سکے۔سامنے سڑک کے بیچوں بیچ ایک چبوترا سا نظر آتا تھا جس پر چند مورتیاں تھیں جس کی صبح وشام پوجا ہوتی تھی۔بالکل اس پیڑ کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد تھی ۔اس مسجد سے سٹی زمین پر آم کے پیڑ تھے جن پر ابھی بور آنا شروع نہیں ہوا تھا۔یہاں چند مکانات میاں لوگوں کے تھے جن میں ایک ڈاکٹر ذکی صاحب بھی تھے۔تھوڑا سا آگے بڑھ کر میاں لوگوں کا بڑا سا آموں کا باغ تھا۔باغ کے ایک طرف ایک چھوٹا سا اسکول تھا جس کے پیچھے یادو گھرانے آباد تھے۔ان ہی گھرانوں میں ایک گھرانہ دھنپت یادو کا تھا جو کافی دولتمند تھا اور اثر ورسوخ رکھتا تھا۔رام گڑھ میں سب سے بڑی حویلی دھنپت یادو کی ہی تھی اس کے بعد ڈاکٹر ذکی کی ذکی منزل کا نمبر آتا تھا۔

اشوک اسی امیر دھنپت یادو کا پوتا تھا۔آج برسوں بعد وہ اپنی خاندانی حویلی میں آیا تھا۔اس کی آمد کی خبر سن کر سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا تھا۔اشوک کوئی معمولی شخص تو تھا نہیں۔اس کی ملکیت میں یہ حویلی، باغات اور سینکڑوں بیگھا زمین تھی جن کا وہ اکلوتا وارث تھا۔یہی نہیں اشوک مقامی ممبر اسمبلی بھی تھا۔برسوں بعد حویلی کے دروازے کھولے گئے، وہ اندر داخل ہوا اور ایک کرسی منگوا کر اس پر بیٹھ گیا۔پھر کچھ دیر بعد اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔اس نے اپنی آواز پر قابو کر لیا تھا مگر آنکھیں قابو میں نہ تھیں۔ساحل سے ٹکرانے کے لئے موجیں بے چین تھیں اور آخر ٹکرا ہی گئیں۔موجیں تیز تھیں جن کے ٹکرانے سے آوازیں بھی پیدا ہوئیں اور پھر اکیلے میں اشوک خوب رویا۔

سبھاش یادو شام ہونے سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ بغل کے گھر سے رونے کی آوازیں اس کے کان میں پہنچی۔اس نے فوراً اپنی بیوی سوگندھا سے دریافت کیا۔سوگندھا نے بتایا کہ سورج یادو اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو بنارس اسپتال لے گئے تھے جہاں ڈاکٹر نے چیک اَپ کیا اور بتایا کہ اس کے ٹونسل بڑھ گئے ہیں اس لیے آپریشن کرنا ہوگا۔جب سے وہ گھر آئے ہیں اور بھوجی سیتلا دیوی کو خبر ملی ہے بس وہ روئے جا رہی ہیں۔ڈیڑھ سال کے بچے کا آپریشن کرنا ہوگا، کیا ہوگا بھگوان جانے؟

''ٹونسل...ٹونسل...یہ کون سی نئی بیماری نکل آئی ؟ کیا ہوا ہے میرے بچے کو؟'' سبھاش پسینے پسینے ہو رہا تھا۔اس کا لہو کھول رہا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنے بھتیجے کو دیکھ لے، اسے گود میں اٹھا لے۔

''گلے میں کوئی گلٹی ہوتی ہے..... آپریشن سے اس کو باہر نکال دیا

جاتا ہے۔اب بھگوان بھلا کرے۔بھوجی روئے جات ہی،ہم لوگ جائے بھی نہ سکت ہیں۔بڑی چنتا ہوت ہے''۔سوگندھا یہ کہتے ہوئے غمزدہ سی ہوگئی تھی۔

سبھاش بھی بے چین ہوا اٹھا تھا۔اس کا بس چلتا تو فوراً دوڑ کر چلا جاتا اور اپنے بھائی سورج کے گلے لگ کر اسے دلاسہ دیتا۔مگر وہ مجبور تھا۔

دراصل دونوں بھائیوں کے درمیان چھوٹے سے ایک بیگھا باغ کے لئے مقدمہ چل رہا تھا۔دونوں بھائیوں کے درمیان بات چیت بند ہو چکی تھی۔

سورج یادو کے تین بیٹے تھے جن کی عمریں بالترتیب سترہ، بارہ اور ڈیڑھ سال تھیں جبکہ دو بیٹیاں جڑواں تھیں جن کی عمر پندرہ سال تھی۔اسی طرح سبھاش یادو کے صرف چار بیٹے تھے جن کی عمریں بالترتیب پندرہ، تیرہ، گیارہ اور نو سال تھیں۔

سبھاش نے پوری رات جاگ کر گزاری۔اور صبح تڑکے گھر سے کچھ دور سڑک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔تھوڑی دیر میں اسے اس کا بڑا بھتیجا سنیل نظر آیا۔ سبھاش تیزی سے سنیل کے قریب آیا اور پوچھنے لگا۔

''بنارس کے ڈاکٹر نے کیا کہا... بھیا کیسے ہیں؟... انھیں سمجھاؤ کہ ٹونسل کا آپریشن کوئی بڑا آپریشن نہیں ہوتا۔ہم رات ہی ڈاکٹر ذکی صاحب کے گھر جا کر ان سے پوچھے تھے۔ان کے بیٹے کو بھی یہی ہوا تھا پندرہ بیس منٹ لگا تھا آپریشن میں اور لڑکا ٹھیک ہو گیا تھا۔سمجھے بیٹا سنیل! بھوجی کو بھی سمجھا دینا''۔وہ بنا رکے بولتا چلا گیا۔

''چاچا جی! آپ نہیں آسکتے گھر میں؟ کب تک جمین کے لئے جھگڑا ہوتا رہیگا؟ بتایئے چاچا جی۔آپ تو گیانی ہو، بتایئے؟''

''سنیل! تُو کالج جا اور شام میں سب کو سمجھا دینا'' یہ کہہ کر سبھاش آگے نکل گیا۔

دس پندرہ دن بعد سوگندھا نے سبھاش کو بتایا۔

''کل جیٹھ جی اور جیٹھانی، چھٹکے بابو کو بنارس لے جارہے ہیں آپریشن کے لئے۔ایک بیٹی نیلیما ساتھ جارہی ہے اور باقی بچے گھر پر ہی رہیں گے۔بھور ہوتے ہی وہ لوگ چلے جائیں گے''۔سبھاش فکرمند ہو گیا اور آپریشن کے بارے میں سوچتا رہا۔

صبح گاڑی کی آواز پر سبھاش باہر نکل آیا تو اس نے دیکھا کہ سورج اور اس کی پتنی سیتلا دیوی چھوٹے بیٹے کو لئے جیپ میں سوار ہو چکے ہیں۔ساتھ نیلیما بھی ہے۔سیتلا دیوی کی نظریں سبھاش سے ملیں تو سبھاش نے جلدی سے نمستے میں ہاتھ جوڑ دیے۔سورج کی نظریں جیسے ہی سبھاش پر پڑیں اس نے منہ پھیر لیا۔اور پھر وہ لوگ بنارس کے لئے روانہ ہو گئے۔

''جب تک بھیا، بھوجی نہیں آجاتے سب کا دھیان رکھنا سوگندھا''۔سبھاش نے اپنی بیوی سے کہا۔

بڑے بھتیجے سنیل سے ہی سبھاش کو پتہ چلا کہ آپریشن ہو گیا ہے، سب ٹھیک ہے اور دو دن میں گھر آجائیں گے۔

اب اتنے برسوں بعد اشوک اپنی حویلی میں موجود تھا اور ہر چیز کو بغور دیکھتا جارہا تھا۔اسی اثنا میں اشوک کا سیکریٹری رمن سنگھ قریب آیا اور اس نے کہا۔

''بھیاجی! گاؤں کے مکھیا، میڈیا والے اور کئی لوگ ملنا چاہتے ہیں ۔اور یہ بھی پوچھ رہے ہیں کہ آپ رکو گے یا چلے جاؤ گے؟ اگر رکنا ہے تو انتجام کیا جائے کیونکہ حویلی میں تو رکا نہیں جاسکتا۔برسوں سے بند پڑی تھی۔کئی دن صرف صفائی میں لگ جائیں گے۔''

نہیں..... ہم رکیں گے نہیں۔چلے جائیں گے۔سب کو بٹھاؤ۔مل لیتے ہیں اور حویلی کی صفائی کا انتظام کرواؤ جلد سے جلد''۔اشوک نے حکم دیا۔

کچھ دیر بعد اشوک باہر آیا۔سبھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔باری باری اس نے سب سے ملاقات کی اور اعلان کیا کہ اس حویلی کی جگہ جلد ہی ایک بڑا اسپتال بنایا جائے گا جس میں غریبوں کا مفت علاج ہوگا اور ساتھ ہی اس ایک بیگھا زمین پر ایک اسکول بنایا جائے گا۔

اب پرندے اپنی منزلوں کی جانب روانہ ہو چکے تھے، سورج کہیں چھپ جانا چاہتا تھا۔اشوک بھی شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔

اشوک اعظم گڑھ میں اپنے ماما کندن سنگھ یادو کے یہاں پلا بڑھا تھا ۔شبلی کالج سے اس نے گریجویشن کیا تھا اور پھر بزنس میں شامل ہو گیا۔ماما نے صحیح موقع دیکھ کر بنارس کے ایک دولتمند گھرانے کی لڑکی اسمیتا سے اس کا بیاہ کر دیا۔

کالج کی سیاست میں اشوک سرگرم رہا تھا۔کالج کا جنرل سیکریٹری بن چکا تھا۔قدرت نے شاندار آواز عطا کی تھی۔ہزاروں کے مجمعے میں جب وہ بولتا تو لوگ بس اسے سنتے رہتے۔سیاست میں اس کی دلچسپی تھی چنانچہ اس نے ایک نئی ابھرتی ہوئی سیاسی پارٹی جوائن کر لی۔اسمبلی الیکشن میں اسے پارٹی نے ٹکٹ دیا۔الیکشن میں عوام نے ریاستی حکومت کو نکار دیا اور نئی پارٹی کو موقع دیا، اس طرح وہ ایم ایل اے بن گیا۔

اشوک دیر رات گئے گھر پہنچا۔

سب سو گئے تھے۔اسمیتا نے کھانا گرم کرنا چاہا مگر اشوک نے منع کر دیا۔اور سگریٹ سلگانے لگا۔اس کے ذہن میں جانے کیا کیا خیالات آنے لگے تھے۔

دنیا میں ہر فساد کی جڑ تین چیزوں کو کہا جاتا ہے زر، زن، زمین۔کسی بھی جنگ کو دیکھ لیجئے وجوہات میں یہی چیزیں ملیں گی۔ایک دروپدی نے مہابھارت کروایا۔بھیشم پتاما، گرو ویاس، درونا چاریہ، یدھشٹر یہاں تک کہ شری کرشن بھی جنگ کو نہ روک سکے۔اشوتھاما آج بھی جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔

ہندو پاک کی جنگ، ہندو چین کی جنگ، سب کیا ہیں زمین کے لئے ہی تو ہیں۔اپنی برتری ہر کوئی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ایک دوسرے سے بڑھ کر زمین و زر کا مالک ہونا چاہتا ہے۔

دھنپت رائے، اشوک کے دادا تھے ان کے پاس بھی تو سب کچھ تھا، خاندان تھا، بیٹے بیٹیاں تھیں، زمین و جائیداد تھی، باغات تھے۔ زمین و جائیداد، باغات آج بھی موجود ہیں مگر خاندان...... خاندان..... کہاں ہے؟ سب کیا ہوئے؟

دھنپت یادو کے دو بیٹے تھے۔ سورج یادو اور سبھاش یادو۔ سورج کا دل پڑھائی میں نہ لگا تو دھنپت نے اسے کاروبار میں لگا دیا۔ سبھاش نے بنارس سے گریجویشن کر لیا تھا۔ دونوں بیٹے بڑے ہوئے تو شادی ہوگئی اور دھنپت کے انتقال کے بعد ہی بٹوارہ۔ بٹوارہ نے حویلی کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ دروازہ ایک سے دو ہوگئے، صحن دو ہوگئے، خاندان بھی دو ہوگئے۔ بڑا بیٹا سورج یادو اور چھوٹا سبھاش یادو۔ ایک لڑکی رشمی یادو تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں رہتی ہے۔ دھنپت یادو انگریزوں کے زمانے میں زمیندار ہوا کرتے تھے مگر اب زمینداری تو نہ تھی اکڑ باقی تھی، جائیداد باقی تھی۔ ساری زمینیں، باغات سب دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک چھوٹا سا باغ تقریباً ایک بیگھا حویلی کے دائیں طرف تھا۔ دائیں طرف کا حصہ سبھاش کو ملا تھا اس لئے اس باغ پر اس نے قبضہ کیا۔ سورج یادو نے بھی اس پر اپنا حق جتایا۔ حق حاصل کرنے کی جدوجہد باتوں سے آگے بڑھی، ''تو تو۔ میں میں'' تک پہنچی۔ بھائیوں کا جھگڑا بیویوں تک پہنچا۔ بات اور آگے بڑھی تو اس کا اثر بچوں پر نظر آنے لگا کبھی کبھی وہ بھی ایک دوسرے سے کترانے لگے۔ معاملہ پنچایت میں پیش آیا۔ سرپنچ ڈاکٹر ذکی نے فیصلہ دیا جسے سبھاش یادو نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اب معاملہ کورٹ میں داخل تھا۔

کورٹ میں اس طرح کے مقدمے برسوں تک چلتے رہتے ہیں۔ سورج کا سالا کشور بڑا شاطر دماغ تھا۔ وہ سورج کو چڑھاتا رہتا کہ کسی طرح ہار نہ ماننا وہ زمین اس کا حق ہے۔ سبھاش پڑھا لکھا تھا اس کی بیوی سوگندھا بھی تعلیم یافتہ تھی۔ آپسی تناؤ، رنجش، ایک خون ہوتے ہوئے بھی دوری، روز روز کورٹ کچہری کے چکر سے دونوں پریشان تھے۔ ایک دن دونوں نے سوچا کہ کیوں نہ سورج سے فیصلہ کر لیا جائے اور اگر یہ زمین اسے چاہئے تو دے دیتے ہیں بدلے میں کہیں اور لے لیں گے۔ مگر اسی شام ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے آپسی دوری کو اور بڑھا دیا بلکہ اب مار پیٹ تک بات آ پہنچی۔

ہوا یوں کہ سبھاش کا بڑا لڑکا راجیش باغ میں آم توڑ رہا تھا کہ تبھی سورج اور اس کا سالا کشور وہیں سے گزرے۔ راجیش کو آم توڑتے انھوں نے دیکھ لیا۔ سورج نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ آئندہ باغ میں نہ آئے۔ جب تک سورج منع کرتا کشور نے ایک لکڑی سے راجیش کو مار دیا۔ چوٹ زور کی تھی سر سے خون نکلنے لگا۔ راجیش گھبرایا روتا گھر پہنچا۔ سبھاش باہر نکل آیا اور اسی دن دونوں بھائیوں میں خوب لڑائی ہوئی، گالی گلوج تک نوبت آئی۔ اس واقعہ نے صلح کے معاملہ کو ٹال دیا۔

کورٹ میں تاریخ پر تاریخ ملتی رہی، یوں تین سال گزر گئے۔ ایک تاریخ پر سبھاش سوگندھا کے ساتھ اور سورج، کشور کے ساتھ کورٹ میں حاضر تھے۔ جج کے جلدی چلے جانے کی وجہ سے ان کے کیس کا نمبر نہیں آیا تھا۔ کورٹ کے گیٹ پر دونوں کا سامنا ہو گیا۔ کشور نے سبھاش پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

'' کچہریوں میں اپنی پتنی کے ساتھ گھومت ہا، یہاں کیس لڑا جات ہے، کوئی پارک تھوڑے ہے۔ یہ تو بھیا چپ رہت ہیں ناہی تو ہم تو بندوق سے فیصلہ کر دیں''۔ یہ سن کر سبھاش کو غصہ آ گیا۔ اس نے کشور پر ہاتھ اٹھا دیا۔ سورج نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، کئی گھونسے اپنے بھائی سبھاش کو جڑ دیے۔ وہ تو سوگندھا بیچ میں آ گئی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے چلانے لگی۔

''جیٹھ جی...... جیٹھ جی..... چھوڑ دیجئے..... چھوڑ دیجئے...'' وہاں موجود لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ تب کہیں دونوں بھائی اپنی اپنی جیپ میں روانہ ہوئے۔

اگلی صبح کشور باہر نکلا تو اس کی نظر سبھاش پر پڑی جو اپنے صحن میں بیٹھا اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ کشور نے اسے دیکھتے ہوئے طعنہ مارا۔

'' کا ہو! بندوق سے پھیسلہ کر لیا جائے''۔ یہ سنتے ہی سبھاش اس کی طرف دوڑا۔ ہاتھ میں بندوق اور کارتوس کی پیٹی تھی۔

کشور کی آواز سن کر سورج بھی باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ کشور چھپ رہا ہے اور سبھاش کے ہاتھ میں بندوق اور کارتوس موجود ہے۔ وہ گالی گلوج کرنے لگا۔ کشور نے سورج کو دیکھا تو آگے بڑھ بڑھ کر گالیاں دینے لگا۔ اپنے بھانجے سے اس نے بھی بندوق اور کارتوس منگوا لئے۔ سبھاش کے بیوی بچے بھی وہیں آ گئے اور سورج کی پتنی بچے بھی سب باہر نکل آئے۔

سورج کے ساتھ کشور تھا جو گالیاں دے رہا تھا سبھاش اکیلا تھا۔ ایک طرف سیتلا دیوی سورج کو سمجھا رہی تھی تو دوسری طرف سوگندھا سبھاش کو۔ جب تک کشور نے سبھاش کے پتا دھنپت رائے کو گالی دے دی۔ بس کیا تھا سبھاش نے اس پر گولی چلا دی۔ کشور چکرا کر گرا۔ کشور کو گولی لگتے ہی سورج نے سبھاش پر فائرنگ کی مگر اسی وقت سبھاش کا لڑکا درمیان میں آ گیا اور گولی اس کے سینے کے پار ہوگئی۔ ایک کہرام مچ گیا۔ گاؤں کے لوگ بھی ان کی حویلی کے قریب آ گئے مگر کسی کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ قریب آتا۔ دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں بندوق تھی اور دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

سوگندھا اپنے بیٹے کی لاش پر اور سیتلا دیوی اپنے بھائی کی لاش پر پڑی تھیں۔ سبھاش نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھی تو اس نے اپنے بھتیجے سنیل پر فائر کر دیا۔ گولی سنیل کے سینے میں پیوست ہوئی وہ گر پڑا۔ سورج نے سنیل کو گرتے دیکھا تو سبھاش کے دوسرے لڑکے پر فائر کر دیا۔ پورا صحن خون سے تر بتر ہو گیا تھا۔ سوگندھا سر پٹکنے لگی۔ سبھاش نے سورج کے لڑکوں پر فائرنگ کر دی۔ لڑکے لڑکیاں ایک کے بعد ایک ڈھیر ہوتے گئے۔ دونوں بھائیوں نے موت کا اندھا ناچ شروع کر دیا تھا۔ دروازے پر ہاہاکار مچا تھا۔

باقی صفحہ ۱۱۷ پر ملاحظہ کیجیے

''کہن زنجیر''

نعیم الدین نظرؔ (میر پور خاص)

چمن میں کوئی گُل خندہ نہیں ہے — بھلا کیا باغباں اندھا نہیں ہے
خوشی تقسیم کرتا ہوں جہاں میں — یہ کارِ خیر ہے دھندہ نہیں ہے
ہے کسی کی قبر، بوسیدہ بہت ہے — کسی کا نام بھی کندہ نہیں ہے
بنی آدم کے سب بندے ہیں لیکن — خدا کا ایک بھی بندہ نہیں ہے
جسے دیکھا پریشاں حال دیکھا — یہاں تو کوئی فرخندہ نہیں ہے
کبھی جو راہ دکھلاتا رہا تھا — ستارہ اب وہ رخشندہ نہیں ہے
مرے لہجے کی تلخی پر نہ جانا — زباں گندی ہے، دل گندہ نہیں ہے
وفاؤں کی تجارت کرنے والو — یہ دھندہ آج بھی مندہ نہیں ہے
نظرؔ رکتی نہیں چہرے پہ اُس کے — وہ بندہ عام سا بندہ نہیں ہے

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

جہاں کو کیوں نہ میں تسخیر کر لوں — سبھی کے خواب کی تعبیر کر لوں
جہاں ہو محترم سب کی عبادت — وہاں معبد نیا تعمیر کر لوں
گواہی دیں مِری معصومیت کی — میں وہ لمحے ابھی زنجیر کر لوں
مری تقدیر کو یکسر بدل دے — کوئی ایسی ہی میں تدبیر کر لوں
رواجوں کی کہُن زنجیر کو میں — ہمیشہ کے لیے نخچیر کر لوں
بچا لے جو کسی بھی بے گناہ کو — کوئی بے نام سی تعزیر کر لوں!

○

یونس صابر (پشاور)

جگایا آلِ آدم کو سلوکِ آ گہی نے — جڑے ہیں ماشاءاللہ اس میں حکمت کے نگینے
مرے کچھ دوست شاعر شوقیہ کرتے سیاست — انہیں مارا مگر تعلیم کی کم مائیگی نے
بڑے خوش باش تھے مل جائے گی آخر وزارت — ڈُبویا ان کو بے تُک شاعری، رشوت گری نے
غزل رُوحِ سخن ٹھہری لُبھاتی ہے زباں کو — سکھاتی زندگی کرنے کے شائستہ قرینے
تھا منظر دیدنی، مہدیؔ حسن کا جہلم آنا — بُلایا آپ کو اُس پار سے گلزار جی نے

○

عارف شفیق (کراچی)

بظاہر تو دلوں پہ طنز کے نشتر چلاتی ہے
یہ میری شاعری سوئے ضمیروں کو جگاتی ہے

مرے دل میں اتر جاتا ہے دکھ پنجرے کے پنچھی کا
مجھے پردیس میں جب بھی وطن کی یاد آتی ہے

پرندے پھول جگنو تتلیوں کے خواب مت چھینو
مرے احساس کی دنیا انہی سے جگمگاتی ہے

نواسی میں مری سارے ہنر ہیں اپنی نانی کے
مری بکھری کتابیں وہ سلیقے سے سجاتی ہے

کراچی شہر میں جب بھی صدا کا قحط پڑتا ہے
مری سچائی مجھ کو پھر سرِ مقتل بلاتی ہے

یہ دنیا ہے یہاں ہر اک قدم تم سوچ کر رکھنا
خطا اک لمحے کی بھی عمر بھر آنسو رلاتی ہے

کبھی بے وجہ اپنے بیٹے کو میں ڈانٹ دیتا ہوں
مری پوتی بھی مجھ کو دیکھ کر پھر مسکراتی ہے

ہماری منزلیں اور راستے دونوں جدا ٹھہرے
نئے اک موڑ پر ملنا ہمارا حادثاتی ہے

میں بوڑھا ہو گیا ہوں پھر بھی ہر اک رات کو عارف
مری ماں خواب میں آ کر مجھے لوری سناتی ہے

سبیلہ انعام صدیقی (کراچی)

جہاں میں جس کی شہرت کُو بہ کُو ہے
وہ مجھ سے آج محوِ گفتگو ہے

رہا آباد خوابوں میں جو اب تک
خوشا قسمت! کہ اب وہ روبرو ہے

کبھی وہ پیار سے اک پھول لائے
بہت دن سے مری یہ آرزو ہے

نہیں آتا غزل میں نام کوئی
تعلّق اس قدر با آبرو ہے

مرا احساس جس سے ہے معطّر
وہی خوشبو تو میرے چار سُو ہے

سراپا میرا جو ہے اتنا رنگیں
یہ اُس کی یاد کا ہی رنگ و بُو ہے

جہاں کل تک تھا مایوسی کا صحرا
وہاں امّید کی اک آبجُو ہے

وہ آوازیں جو دل میں گونجتی ہیں
مری انفاس کی وہ ہاؤ ہُو ہے

مجھے لے جائے جو منزل کی جانب
اب ایسے کارواں کی جستجُو ہے

مرا ظاہر نظر آتا ہے جیسا
مرا باطن بھی ویسا ہُو بہُو ہے

سبیلہ سوچ اتنی پاک رکھّی
ہر اک مضمون میرا باوُضُو ہے

حبیب الرحمٰن چوہان (میر پور خاص)

لب گریزاں تو ہے زباں خاموش
پھر مرے قتل پر جہاں خاموش

عزتِ نفس تار تار ہوئی
چُن کے دیوارِ مہرباں خاموش

چند یادوں کا تجربہ اور پھر
ہو گئی عمرِ جاوداں خاموش

دن کو بچوں سے زندگی تھی یہاں
رات کو ہو گئے مکاں خاموش

حشر برپا ہے مری رگ رگ میں
اور میں ہوں کہ بے زباں خاموش

درد ہوتا نہیں مجھے کچھ بھی
میرے اندر ہے اک جہاں خاموش

شب سیاہی مہیب سناٹا
سو گئی زندگی کہاں خاموش

سانس لیتے حبیب ہیں زندہ
سرد جذبات ہیں فغاں خاموش

شہاب صفدر (لاہور)

جذبوں کے ساتھ زورِ ہنر ختم ہو گیا
ہے برف سدّ راہ، سفر ختم ہو گیا

تُو نے خدا کے نام پہ اے بندۂ خدا
اتنا ڈرا دیا ہے کہ ڈر ختم ہو گیا

آنکھوں میں رتجگوں کی چمک پڑگئی ہے ماند
لگتا ہے تیرے غم کا اثر ختم ہو گیا

مانا اب اور دوری و فرقت ہے ناگوار
ملنے کے بعد شوق اگر ختم ہو گیا

باہر اُسی طرح رہا سرسبز و سایہ دار
اندر لگا وہ روگ شجر ختم ہو گیا

شاید تمہیں پتہ نہیں وحشت کا سلسلہ
پاتے ہی جنگلوں کی خبر ختم ہو گیا

ہیں دھوپ میں گری ہوئی پلکوں کی چلمنیں
دُھند اس قدر تھی ذوقِ نظر ختم ہو گیا

بھائی یہ حشر کا نہیں تھا نشر کا حساب
دو در رہا شروع مگر ختم ہو گیا

ہر یاد ایک رستا ہوا زخم ہے شہاب
اک عہد......خوں کر کے جگر......ختم ہو گیا

ابراہیم عدیل (جھنگ)

روشنی کا خوف کھانے سے نکل
اب تو پتھر کے زمانے سے نکل

سوچ کوئی راستہ نزدیک کا
دور جانے کے بہانے سے نکل

خود پہ اب اتنا بھروسہ بھی نہ کر
اپنے دشمن کے نشانے سے نکل

سبز کونپل چشمِ گل کی تازگی
رنج کے ہر شاخسانے سے نکل

آفتابِ فکر کی اُجلی کرن
ظلمتوں کے مردہ خانے سے نکل

یہ نہیں ہے دہر میں تیرا مقام
بے ثباتی کے فسانے سے نکل

اپنے اندر کی شعلگی مت بجھا
برف کے اس آستانے سے نکل

جگنوؤں جیسی کبھی تو بات کر
آگ پانی میں لگانے سے نکل

ہجر ہے اک دعوتِ فکر و عمل
وصل کا احساں اٹھانے سے نکل

دشمنی کی فصل بڑھتی ہے عدیل
دوستوں کو آزمانے سے نکل

عطاءالرحمٰن قاضی (عارف والا)

اسیرِ دشت ہوں ریگِ رواں ہے گھر میرا
میں رک بھی جاؤں تو جاری ہے سفر میرا

رواں دواں ہوں مثالِ ہوائے آوارہ
ازل سے گردشِ دوراں ہے مستقر میرا

مری نگاہ نے کیا کیا دیے فریب مجھے
کھلا نہ خود پہ کبھی نقطۂ نظر میرا

یہ کس نے میرے لہو میں اتار دی خوشبو
یہ کس نے نام لکھا ہے گلاب پر میرا

بجز یقین، یہاں کون قاطعِ منزل
بجز گمان، یہاں کون ہم سفر میرا

صراحتوں نے نئی الجھنوں میں ڈال دیا
صدف کی قید میں ہے آج بھی گہر میرا

کوئی تو ہے جو برنگِ طلسمِ خواب، عطا
دکھا رہا ہے مجھے عالمِ دگر میرا

○

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

نئے رشتوں کو ہے آغاز دینا — کسی کا دُور سے آواز دینا
جو طائر پر بریدہ ہیں قفس میں — اُنہیں کچھ طاقتِ پرواز دینا
یہ میری آرزو ہے زندگی کو — ہر اک لمحہ تبسم ساز دینا
اگر سمجھو میں اس کا مُستحق ہُوں — محبت کا مجھے اعزاز دینا
اگر تنہائیاں ڈستی ہوں دل کو — تُم ایسے میں مجھے آواز دینا
وُہی ہے داستاں اس زندگی کی — اسے ہے اک نیا انداز دینا
مجھے محروم رکھنا ہر خوشی سے — مگر جو غم ہوں بے انداز دینا
جفا کے نغموں میں اک عمر گزری — کبھی دل کو وفا کا ساز دینا
پلٹ کر عرشؔ آئیں گے کہاں یہ — گئے لمحوں کو کیا آواز دینا

○

نوید سروش (میر پور خاص)

کون جیتا ہے اب قرینے سے — دل ہی بھرتا نہیں ہے جینے سے
ٹھوکریں کھا چکے، چلے آؤ — آ رہی ہے صدا مدینے سے
عشق ہے کوئی حادثہ تو نہیں — دل میں اُترے وفا کے زینے سے
کیسے پاتا وہ اُس کی گہرائی — جب وہ اُترا نہیں سفینے سے
تجربہ ہے مشاہدہ تو نہیں — بات بنتی ہے غصّہ پینے سے

○

شفیع ہمدم

(فیصل آباد)

جب شبِ غم تیری یادوں کا بسیرا ہو گا — مشک و عنبر سے مہکتا ہوا ڈیرا ہو گا
جو میرے گردشِ حالات پہ ہنس دیتا تھا — اس کو بھی گردشِ ایام نے گھیرا ہو گا
جو تیری زلف گرہ گیر کو قابو کر لے — تیری بستی میں کوئی ایسا سپیرا ہو گا
زیست کے گھور اندھیروں سے نہ گھبرا جانا — رات بیتے گی تو گلرنگ سویرا ہو گا
رام کرنے کے اسے لاکھ جتن تو کر لے — وہ ستم گیں نہ میرا ہے نہ تیرا ہو گا

○

خدا دیکھتا ہے، مگر دیر سے

لیوٹالسٹائے

ترجمہ: فیروز عالم

(امریکہ)

روس کے ایک گاؤں ''ولادیمیر'' میں ڈیمیٹری ایوانووچ نامی ایک نوجوان تاجر رہتا تھا اسکی دو دکانیں اور ایک ذاتی مکان تھا۔ ڈیمیٹری ایک پرکشش، سنہری گھونگر بالوں والا شخص تھا وہ اپنی کم عمری میں موسیقی کا دلدادہ تھا اور کبھی کبھی شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر تھوڑا سا غل غپاڑہ بھی کر دیا کرتا تھا مگر جب سے اسکی شادی ہوئی تھی وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا، اس نے شراب چھوڑ دی تھی اور پوری محنت سے اپنی تجارت اور اپنے کنبے پر توجہ دینے لگا تھا۔ ایک موسم سرما میں جب قریبی قصبہ میں سالانہ تجارتی نمائش لگی تھی، اور وہ اس میں شرکت کے لئے جانے کو تیار تھا اسکی بیوی اس کے پاس آئی اور کہا ''ایوانووچ۔۔ آج کہیں نہ جاؤ، رات میں نے تمہارے بارے میں ایک بہت برا خواب دیکھا ہے۔ وہ یہ سن کر ہنسا اور کہنے لگا شاید تم نے سوچا ہے کہ میں راستہ بھول جاؤنگا۔ وہ کہنے لگی مجھے یہ تو پتہ نہیں مگر خواب بہت برا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جب تم گھر واپس آئے اور تم نے اپنی ٹوپی اتاری تو تمہارے سارے بال سفید تھے'' اس نے پھر ہلکا سا قہقہ لگایا اور بولا۔ یہ تو مبارک خواب ہے اسکا مطلب شاید یہ ہے کہ میں اپنا سارا سامان بیچ دونگا اور تمہارے لئے جھولی بھر کر چاندی کے کھنکتے سفید سکے لاؤنگا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے کنبے کو الوداع کہا اور سفر پر چل دیا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھا کہ اسے ایک اور تاجر اسی نمائش میں جاتا ہوا ملا۔ وہ اس تاجر کو پہلے سے جانتا تھا۔ دونوں باتیں کرتے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے اور جب رات ہوئی تو دونوں نے ایک ہی سرائے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ کھانے کے بعد دونوں نے تھکن اتارنے کے لئے قہوہ پیا اور پھر اپنے اپنے کمرے میں شب بسری کے لئے چلے گئے۔

ایوانوچ کی دیر تک سونے کی عادت نہ تھی۔ وہ طلوع آفتاب سے پہلے اٹھا، اپنے گاڑی بان کو گھوڑا گاڑی تیار کرنے کو کہا اور سرائے کے مالک کو جسکی کاٹیج تھوڑی دور سرائے کے پیچھے جہاں جنگل شروع ہوتے تھے، رات کا کرایا دیا اور واپس آ کر گاڑی بان سے چلنے کو کہا۔ ابھی وہ بمشکل پچیس میل ہی گئے ہوں گے کہ اسکے گاڑی بان نے کہا کہ گھوڑوں کو چارہ پانی کی ضرورت ہے۔ وہ قریبی سرائے میں رک گئے۔ گھوڑے پانی پینے لگے، اس نے سماوار سے گرم قہوہ نکالا اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنے گٹار کو چھیڑنے لگا۔ ابھی اس نے کوئی دھن شروع بھی نہیں تھی کہ گھنٹیوں کی چھن چھن آواز کے ساتھ دو گھوڑوں کی ایک سرکاری گاڑی اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی اور اس میں سے ایک فوجی افسر اور دو سپاہی اتر کر اسکی جانب بڑھے۔ انہوں نے اسے خوشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کرنے شروع کر دئے کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کیا کرتا ہے اور اسکا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے۔ ایوانووچ نے بڑی لاپرواہی اور خوش مزاجی سے انکے سوالوں کے جواب دئے بلکہ انہیں سماوار سے گرم گرم قہوے کی بھی پیشکش کی جو انہوں نے رکھائی سے ٹھکرادی۔ پھر افسر نے پوچھا اس نے رات کہاں گزاری تھی۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ وہ کہاں ٹھہرا تھا اس پر انہوں نے پوچھا کیا تم کسی کے ساتھ تھے۔ اس نے اس تاجر کے بارے میں تفصیل سے بتایا جس کے ساتھ وہ ٹھہرا تھا۔ پھر کہنے لگا تم لوگ مجھ سے ایسے سوال کر رہے ہو جیسے میں کوئی چور ہوں۔ میں ایک باعزت تاجر ہوں جو اپنی اشیا فروخت کرنے جا رہا ہوں اس پر فوجی افسر نے کہا اس لئے کہ وہ تاجر جس کے ساتھ تم نے رات گذاری تھی صبح اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا اور اسکی گردن کسی تیز دھار آلے سے کٹی ہوئی تھی۔ آخری دفعہ تم ہی اس سے ملے تھے اور تم ہی علی الصبح کسی کے اٹھنے سے پہلے وہاں سے چل دئے تھے۔ ہم تمہارے سامان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تیزی سے اسکا سامان کھولنا شروع کیا اور پھر اچانک افسر نے ایک چیخ ماری اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار بڑا چھرا تھا جس پر تازہ جما ہوا خون لگا تھا۔ وہ کہنے لگا '' آہا۔۔ یہ پکڑا، یہ کس کا چھرا ہے؟؟'' ایوانوچ کا تو رنگ فق ہو گیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ یہ چھرا کیسے اس کے سامان میں آ گیا۔ وہ خوف سے کپکپانے لگا۔ اس سے گھبراہٹ میں کچھ بولا بھی نہیں گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بار بار یہی کہتا رہا مجھے نہیں معلوم، نہیں یہ میرا نہیں۔۔ میرا یقین کرو یہ میرا نہیں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ مگر اس کی خوف سے کپکپاہٹ، چہرے کی زردی، ہکلاہٹ اور سامان سے خون آلود چھرے کی برآمد نے پولس کی نظروں میں اسے مجرم ٹھہرا دیا تھا۔ افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پیر باندھ کر گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیں۔ گاڑی چل دی، وہ راستے بھر روتا رہا، اسکا سامان اور نقدی زار روس کے حکم سے ضبط کر لی گئی تھی۔ وہ انجان لوگوں کی تحویل میں تھا اور بے سہارا تھا۔

اسے قریبی شہر لے جایا گیا اور مقدمہ شروع ہوا۔ تحقیق کے دوران اس کے گاؤں والوں نے گواہی دی کہ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ شراب پیتا تھا اور غل غپاڑہ مچاتا تھا اور کبھی کبھی غیر اخلاقی حرکتوں کا مرتکب ہوتا تھا مگر شادی اور بچوں کے بعد نیک ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی پر سخت ناامیدی اور مایوسی کا عالم تھا اس کے بچے بہت چھوٹے تھے اور ایک تو بہت ہی چھوٹا اور شیر خوار تھا۔ پہلے تو اسے اپنے شوہر سے ملنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی مگر کئی درخواستوں کے بعد جب وہ اس سے ملنے گئی تو اسے زنجیروں میں جکڑا دیکھ کر اور جرائم پیشہ موالیوں اور چرسیوں کے درمیان دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بار بار اس سے پوچھتی تھی ''اب ہم کیا کریں، تم ہی بتاؤ اب ہم کیا کریں'' وہ کہنے لگا تم زار روس '(شہنشاہ روس) کو درخواست دو کہ وہ ایک بے گناہ انسان کو سزا پانے اور اسکے

ساتھ ہونے والی اس بے انصافی سے روکیں۔اس پر اسکی بیوی کہنے لگی ’’ڈیمیٹری میں انہیں درخواست دے چکی ہوں مگر وہ نا منظور ہو چکی ہے۔ایوانوچ کاش تم میری بات مان لیتے اور اس دن نہ جاتے۔پھر اسکے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔۔کاش کاش۔‘‘ وہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر پیار سے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی۔۔ڈیمیٹری۔۔۔میں تمہاری بیوی ہوں اچھے برے وقت میں تمہاری ساتھی، مجھے بتادو کیا تم نے یہ قتل کیا ہے‘‘اس کے چہرے پر غم کی ایک گہری پرچھائیں آئی اس کے مہنہ سے یہی نکلا۔۔اف اف۔۔میرے خدا، یعنی تم بھی مجھ پر شک کرتی ہو۔پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا اور سسکیاں لے کر رونے لگا۔اسی وقت پہریدار آ گیا اور اس نے سختی سے کہا ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اب تم لوگ چلے جاؤ۔اس نے مجبوراً اپنے بچوں اور بیوی کو آخری دفعہ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور کھڑکی سے پلٹ آیا۔وہ ایک سخت جذباتی طلاطم میں مبتلا تھا۔وہ اپنی چھوٹی سی کاٹ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔وہ سوچنے لگا کہ اگر میری اپنی بیوی بھی مجھ پر شبہ کرنے لگی ہے تو صرف خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ میں بے قصور ہوں اس لئے اب دنیا سے کسی قسم کی اپیلیں کرنا بے سود ہے۔اگر میں سچا ہوں، جو میں ہوں اور خدا یہ جانتا ہے تو مجھے بس اب اسی سے اپیل کرنی چاہئے اور صرف اسی سے امید کرنی چاہئے کہ وہ میرے ساتھ انصاف کرے گا۔بس اس کے بعد اس نے اپنی رہائی کی کوئی کوشش نہیں کی۔اپنی حالت پر صبر کر کے ہتھیار ڈال دئے، بس اللہ سے لو لگائی اور بہتری کی دعائیں کرنے لگا۔ایوانووچ کو شدید کوڑے مارنے کی سزا اور ملک بدر کر کے سائبیریا، جو روس کی سرد دوزخ ہے اور جہاں روس کے خطرناک ملزموں کو مرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا، میں قید کی سزا دی گئی تھی۔کوڑوں کی مار سے اسکے جسم پر جگہ جگہ گہرے زخم پڑ گئے تھے اور جیسے ہی وہ تھوڑے سے بہتر ہوئے اسے سائبیریا روانہ کر دیا گیا۔اس نے سائبیریا میں چھبیس سال دوسرے خطرناک قیدیوں کے ساتھ سخت مشقت کرتے گذارے۔اس کے سنہری بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے، اسکی داڑھی ایک بے ترتیب جھاڑی کی طرح اسکی نعف تک بڑھ گئی تھی، غذا کی کمی کی وجہ سے اسکا جسم گھل گیا تھا اور بس ہڈیاں ہی نظر آتی تھیں، اسکی کمر جھک گئی تھی، وہ آہستہ آہستہ چلتا تھا اور اسے کسی نے کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا مگر اسکی عبادت اور دعائیں ویسے ہی جاری تھیں، شاید اس نے اپنے اللہ سے انصاف کی امید نہیں چھوڑی تھی۔

قید خانے میں وہ جوتے گانٹھ نے سیکھ گیا تھا اور اس سے اسکی کچھ بچت ہو گئی تھی جس سے اس نے کچھ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی کتابیں خرید لی تھیں۔جب تھوڑی بہت روشنی ہوتی تو انہیں پڑھتا تھا اور اتوار کے دن چرچ میں باقاعدگی سے حاضری دیتا تھا۔اسے قید خانے کے نگہبانوں میں خاص عزت حاصل ہو گئی تھی اور دوسرے قیدی بھی اسکا بہت احترام کرتے تھے وہ اسے دادا میاں کہتے تھے بلکہ وہ دادا میاں ہی مشہور ہو گیا تھا۔قیدی اپنے آپس کے جھگڑے نبٹانے کے لئے بھی اسی کے پاس آتے تھے۔اسکی بڑی عزت تھی اور خاص معاملات میں جیل خانے کے افسران بھی اسکی رائے لیا کرتے تھے۔روسی قوانین کے تحت اسے اپنے کنبے سے کسی رابطے کی اجازت نہیں تھی اور اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

ایک دن قیدیوں کی تازہ کھیپ وہاں لائی گئی۔شام کو انہیں آنگن میں جمع کیا گیا پرانے قیدی انکے گرد جمع ہو گئے اور ان سے پوچھنے لگے کہ کس نے کیا جرم کیا ہے اور وہ کس گاؤں یا قصبے سے تعلق رکھتے ہیں۔پرانے قیدی بڑی دل چسپی سے انکے حالات جاننے کو بیقرار تھے مگر ایوانووچ لاتعلق سا، زمین پر نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ایک نیا قیدی جو ساٹھ سال کا تھا مگر مضبوط جسم کا مالک تھا اور اپنی عمر سے کم لگتا تھا بڑے غرور سے کہنے لگا مجھے تو ایک گھوڑا چرانے کی سزا ملی ہے۔میں نے تو گھوڑا چرایا بھی نہیں تھا، مجھے گھر جانے کی جلدی تھی اور پھر اس گھوڑے کا مالک میرا دوست بھی تھا اسی لئے میں نے گھوڑا کھول لیا۔میری نیت گھر پہنچ کر اسکا گھوڑا واپس کرنے کی تھی مگر راستے میں مجھے پکڑ لیا گیا، میری ایک نہ سنی گئی اور بڑی حد تک مجھ بے قصور کو یہاں بھیج دیا گیا۔واہ رے واہ کیا دنیا ہے۔۔میں سوچتا ہوں مجھے تو سالوں پہلے یہاں آنا چاہئے تھا جب میں نے سچ مچ ایک بڑا جرم کیا تھا مگر جب تو کوئی مجھے نہیں پکڑ سکا۔۔اور اب جب کہ میں نے کوئی جرم کیا بھی نہیں میں یہاں پھنس گیا ہوں‘‘ کسی نے پوچھا’’تم کہاں سے ہو، تمہارا کون سا گاؤں ہے‘‘اس کے جواب سے ایوانووچ چونک اٹھا’’میں ’’ولادی میر‘‘ سے ہوں، میرا نام سیمانووچ ہے، میرا کنبہ وہیں سے ہے‘‘ایوانووچ کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی، اس نے سر اٹھایا اور کہنے لگا’’ ولادی میر سے، سیمانو وچ۔۔مجھے بتاؤ کیا تم گاؤں ولادی میر میں کسی ایوانووچ کے کنبے کو جانتے ہو؟‘‘ سیمانووچ کہنے لگا کیوں نہیں، وہ کنبہ تو بہت خوشحال اور مالدار ہے انہیں کون نہیں جانتا۔۔مگر یہ مشہور ہے کہ انکے باپ نے کسی کو قتل کیا تھا اور اب وہ کہیں سائبیریا میں عمر قید کاٹ رہا ہے‘‘ پھر کہنے لگا اچھا دادا میاں تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں ہو؟؟ تم نے ضرور کوئی بڑا جرم کیا ہوگا‘‘ ایوانووچ کا دل نہیں چاہا کہ وہ اسے اپنی بدقسمتی کی کہانی سنائے کیونکہ اسے یقین تھا کہ کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔وہ کہنے لگا بس میں اپنے جرم پر یہاں چھبیس سال سے ہوں۔کون سا جرم؟ نو وارد نے پوچھا؟ مگر ایوانووچ نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا’’جو بھی تھا شاید میں اسی کا حقدار تھا اور میں اسکی سزا بھگت رہا ہوں‘‘ ایوانووچ نے تو صاف جواب نہیں دیا مگر دوسرے قیدیوں نے سیمانووچ کو بتایا کہ کیسے کسی نے ایک تاجر کو قتل کر کے اس کے سامان میں چھرا رکھ دیا اور واقعاتی شواہد کے تحت ایوانووچ گرفتار ہو گیا۔یہ سن کر سیمانووچ اپنی رانوں پر ہاتھ مار مار کر بے ساختہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا حیرت ہے یقیناً حیرت ہے مگر دادا جی تم تو ضرورت سے زیادہ ہی بوڑھے ہو گئے ہو، ارے تم تو واقعئی بہت بوڑھے ہو گئے ہو‘‘اس پر دوسرے قیدی پوچھنے لگے کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیا تم نے کبھی پہلے ایوانووچ کو دیکھا تھا مگر سیمانووچ نے اسکا کوئی جواب نہیں

دیا صرف یہ کہا خوب ہے، کیا حیرت ہے کہ ہم پھر ایک دفعہ ان حالات میں مل رہے ہیں۔ یہ سب سن کر ایوانو وچ کو خیال آیا کہ یقیناً سیمانو وچ نے یہ واقعہ سنا ہے اور شاید اسے معلوم بھی ہو کہ قتل کس نے کیا ہے۔ اس نے سیمانو وچ سے پوچھا کیا تم نے یہ واقعہ سنا ہے یا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ اس تاجر کو کس نے قتل کیا۔ سیمانو وچ اسی لاپرواہی سے کہنے لگا ''سنا ہے؟۔۔کیسے نہیں سنتا۔ کس نے نہیں سنا، یہ واقعہ تو گلی گلی مشہور تھا اور کس نے قتل کیا۔ اسی نے قتل کیا جس کے تھیلے سے یہ چھرا نکلا تھا۔ یہ کہہ کر وہ سر جھٹک کر دوسری طرف چل دیا۔

یہ الفاظ سن کر اور سیمانو وچ کا رویہ دیکھ کر جانے کیوں ایوانو وچ کو یقین ہو گیا کہ یا تو سیمانو وچ نے خود اس تاجر کو قتل کیا ہے یا وہ اسے جانتا ہے جس نے یہ قتل کیا ہے۔ وہ رات اس پر بہت بھاری گذری۔ بہت عرصے بعد آج وہ بہت دکھی ہوا، سارا ماضی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی کی تصویر جب وہ آخری دفعہ اس سے ملنے آئی تھی، پھر وہ صبح جب وہ تجارتی نمائش کے لئے خوش خوش گھر سے نکلا تھا۔ پھر اسکے بچے جنہوں نے اسکی روانگی کے وقت اپ نے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے الوداع کیا تھا، پھر اسکا شیر خوار بچہ جو ایک گرم کمبل میں لپٹا اپنی ماں کی چھاتی سے چسر چسر دودھ پی رہا تھا۔ وہ خود بھی اس وقت جوان تھا اور اب۔۔اب؟؟ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچ سکا مگر پھر بھی قید خانے کا وہ کمرہ جہاں رسیوں سے باندھ کر اسے کوڑے مارے گئے تھے، یا سرائے کے برآمدے کی وہ سیڑھیاں جہاں بیٹھ کر اس نے ابھی اپنا گٹار چھیڑا ہی تھا کہ پولس نے اسے گرفتار کیا تھا اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

یہ سب یاد آ کر اسکی کیفیت کچھ ایسی ہو گئی کہ اس کا دل چاہا کہ وہ یا تو خود کو ختم کر لے یا سیمانو وچ کی جان لے لے۔ اسکا غصہ اور انتقامی جذبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ کپکپانے لگا، مگر اس نے خود پر قابو کیا اور اور اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ خدائے ذوالجلال کے سامنے جھک جائے، وہ کمرے کے سخت فرش پر سجدے میں گر گیا۔ پھر بھی اس کے دل میں سیمانو وچ کے لئے اس قدر غصہ تھا کہ وہ اسکے سامنے نہیں پڑتا تھا اور کترا کر نکل جاتا تھا۔

ایک دن وہ قیدیوں کی بیرک کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ اس نے نوٹ کیا کہ قیدیوں کے کمروں کے پاس کچھ کچی تازہ کھدی ہوئی مٹی پڑی ہے ابھی وہ اس پر غور کر رہا تھا کہ ایک کاٹ کے نیچے سے سیمانو وچ نکلا، اسکے ہاتھوں اور کپڑوں پر ریت تھی۔ وہ اس سے کہنے لگا دادا میاں بس زبان بند رکھنا، اگر ہم کامیاب ہوئے تو تمہیں بھی رہائی مل جائیگی اگر تم نے مجھے پکڑوا دیا تو مجھے تو کوڑے مار مار کر میری کھال اُدھیڑ دی جائیگی لیکن اس سے پہلے میں تمہارا گلا گھونٹ دونگا۔ اپنے دشمن کو سامنے دیکھ کر ایک بار پھر ایوانو وچ غصے سے تھر تھرانے لگا مگر اس نے کہا ''مجھے یہاں سے فرار ہونے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اور تمہیں مجھے قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ تم مجھے سالوں پہلے قتل کر چکے ہو۔ جہاں تک تمہارے بارے میں بتانے کا تعلق ہے تو میں اس کا فیصلہ خدا پر چھوڑتا ہوں، وہی مجھے ہدایت دیگا کہ میں کیا کروں''

لیکن دوسرے دن گشت پر سپاہیوں نے بھی اس سرنگ کا پتہ لگا لیا۔ مگر سخت پوچھ گچھ کے باوجود کسی قیدی نے یہ نہیں بتایا کہ کون اسکا ذمہ دار ہے۔ قید خانے کے کمانڈانٹ نے آخر کار ایوانو وچ سے کہا'' بڑے میاں، تم سچے اور ایماندار ہو، ہمیں یقین ہے تم سچ بولو گے، تم ہی بتاؤ یہ کس کا کام ہے؟'' سیمانو وچ ایک کونے میں کھڑا تھا جیسے اسکا اس تمام معاملے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ایوانو وچ نے ایک نظر اس پر ڈالی ایک بار پھر اس میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے سوچا مجھے اسے بچانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی، اب مجھے اسکا حق ہے کہ میں اس سے اسکی قیمت وصول کروں، میں بھی اسکی زندگی برباد کر دوں، پھر اسے خیال آیا کہ اگر میں نے بتا دیا تو اسے کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جائیگا۔۔اور، اور اگر میرا شبہ اس پر بے بنیاد اور غلط ہے تو پھر یہ ایک بہت بڑا گناہ ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا میرا گذرا وقت واپس تو نہیں آ جائیگا۔ کمانڈانٹ نے پھر پوچھا بڑے میاں کیا خیال ہے، جلدی بتاؤ۔ اس نے سیمانو وچ کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور کہا'' جناب اعلیٰ میں نہیں بتا سکتا، یہ خدا کی مرضی نہیں کہ میں کسی کی چغلی کھاؤں، چاہے آپ مجھے کوئی بھی سزا دیں، میں معذور ہوں''

اس رات جب ایوانو وچ نیند کی آغوش میں جانے ہی والا تھا، اندھیرے میں کوئی اس کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا اور آ کر اسکے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں، یہ سیمانو وچ تھا'' اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، چلے جاؤ، دور ہو جاؤ ورنہ میں پہرے دار کو بلا لوں گا۔'' ''ڈیمیتری ایوانو وچ۔۔۔ مجھے معاف کر دو'' ''مگر کس لئے؟؟''

''ایوانو وچ۔۔ یہ میں تھا جس نے تاجر کو قتل کیا تھا، میں تو تمہیں بھی قتل کرنا چاہتا تھا مگر ایک کھٹکا ہوا اور میں جلدی میں تمہارے تھیلے میں چھرا چھپا کر فرار ہو گیا'' یہ کہہ کر سیمانو وچ فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پھر کہنے لگا'' ایوانو وچ، خدا کی راہ میں مجھے معاف کر دو۔ میں کل صبح کمانڈنٹ کے پاس جا کر اس قتل کا اعتراف کر لونگا، تمہیں رہائی مل جائے گی اور تم گھر جا سکو گے، اپنی اسی بیتی زندگی میں، اپنے بیوی بچوں کے پاس'' ایوانو وچ نے اسکی طرف دیکھا اور بھرائی آواز میں کہا'' یہ کہنا تمہارے لئے آسان ہے۔ میں نے چھبیس سال اس دوزخ میں گزارے، مگر اب میں کہاں جاؤں گا، میری بیوی مر چکی ہوگی اور میرے بچوں کو میں یاد بھی نہیں، وہ مجھے پہنچانے گے بھی نہیں۔ اب میرے پاس جانے کے لئے کوئی جگہ نہیں'' سیمانو وچ زمین سے نہیں اٹھا، وہ پلنگ کی پٹی پر اپنا سر مار مار کر کہتا رہا، ایوانو وچ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ مجھے جب کوڑے مارے گئے تھے تو مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی مجھے تمہارا حال دیکھ کر ہو رہی ہے۔ میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی اور اس پر بھی تم نے مجھ پر رحم کھایا۔ میں کتنا کمینہ ہوں۔ میں خود کو معاف نہیں کر سکتا مگر ایوانو وچ تم مجھے معاف کر دو، یسوع مسیح کے صدقے

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (نیویارک)

قسط......۴

جینا سے ہولے سے کہا۔

From today on, you and me are bonded with each other through Kali.

یہ کہتے ہوئے جینا نے کالی کو اپنی گردن سے آزاد کر کے میری گردن میں ڈال دیا۔ کالی جھول تو میری گردن میں رہی تھی لیکن اس کا منہ جینا کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا وہ جینا کے پاس پھر سے جانا چاہتی ہو۔ یہ لوگ ہوا میں ہاتھ ہلاتے ہوئے ہولے ہولے جھونپڑی سے نکل کر ڈھلوان کو اپنی جیپ کی طرف چل پڑے۔ جینا اور ٹام مڑ مڑ کر ہمیں اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ ڈھلان میں گم نہیں ہوئے۔ باپو آنے والے مریض کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور میں کالی کو گردن میں ڈالے خالی الذہن خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ کالی بھی اپنا منہ اٹھائے میری طرح جھونپڑی کے دروازے سے باہر نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ ایک دو دفعہ تو اس نے ان کے پیچھے جانے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

جیپ سٹارٹ ہونے کی آواز آئی، اس کے بعد جیپ کے چلنے کی آواز آئی، پھر یہ آواز کافی مدہم ہوتے ہوتے میرے کانوں کی پہنچ سے دور ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا جہاں جینا مجھ سے جدا ہوئی تھی۔ میں نے اپنے بکھرے ہوئے حواس جمع کئے اور خالی الذہن آہستہ سے چلتا ہوا اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ کالی ابھی تک میری گردن میں جھول رہی تھی۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے اپنا منہ میرے گال پر رکھ دیا۔ کن سوچوں میں گم ہو؟ باپو آنے والے مریض کو فارغ کر کے میرے پاس بستر پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ مجھے باپو کی آواز نے جیسے گہری نیند سے جگا دیا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہوا ہے باپو، میرا ذہن اس وقت بالکل خالی سا ہے، میں نے جواب دیا۔ باپو بولے، پھر تم اتنے اداس کیوں نظر آ رہے ہو؟ میں نے تمہیں اتنا متفکر پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے جواب دیا، شاید مجھے ابھی سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ باپو بولے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سیاحوں کے اس طرح سے جانے کا ردِّعمل ہو۔ میرا خیال ہے ایسی ہی کچھ بات ہے، میں نے کہا۔ لڑکی کے بارے میں تمہاری سوچ کیا ہے؟ باپو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے باپو تو مجھے ایسے لگتا ہے اس لڑکی سے میری ہی نہیں کالی کی بھی پچھلے کسی جنم سے شناسائی ہے۔ میں نے کالی کو اپنے علاوہ کبھی کسی اور سے اس انداز سے ملتے نہیں دیکھا، میں نے بے خیالی میں باپو کو جواب دیا۔

ابھی شاید ہم کچھ اور باتیں کرتے لیکن جھونپڑی سے باہر اچانک سائیکل کی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ چاچو کی آواز آئی، شان جی، رامو بیٹا، تم لوگ کہاں ہو؟ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے زوردار ہانک لگائی، ہم یہاں اندر ہیں چاچو، آپ اندر آ جائیں۔ چاچو اکیلے نہیں تھے امی بھی ان کے ساتھ اندر آئیں، امی نے مٹھائی کا ڈبہ اور ایک اخبار پکڑا تھا۔ چاچو کے ہاتھوں میں موتیے کے ہار تھے۔ انہوں نے ہار میرے گلے میں ڈالتے ہوئے مجھے دسویں کے امتحان میں بورڈ میں تیسرے نمبر میں پاس ہونے اور اپنے سکول میں سب سے پہلے نمبر میں پاس ہونے کی مبارک باد دی۔ امی نے ڈبے سے ایک لڈو نکال کر میرے منہ میں ڈالتے ہوئے مجھے گلے سے لگایا اور ڈبہ باپو کے حوالے کر دیا۔ پھر مجھے نتیجے والا اخبار پکڑا دیا۔ ہم نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ چاچو بیٹھتے ہی باپو سے پوچھنے لگے۔ شان جی، رامو کو آگے پڑھانے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ باپو نے جواب دیا، ماسٹر جی یہ فیصلہ تو رامو کو کرنا ہے مجھے نہیں۔ چند دن پہلے ہم اس سلسلے میں باتیں کر رہے تھے تو میں نے رامو سے یہی کہا تھا۔ اسے اپنی زندگی یا اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کرنا ہے۔ میں اسے راہ پر ڈال تو سکتا ہوں کسی راستے پر انگلی پکڑ کر چلا نہیں سکتا۔ اس لیے آپ اس سوال کا جواب رامو سے پوچھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، چاچو مجھ سے مخاطب ہو کر بولے، رامو بیٹے، کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میری چند باتیں پوری توجہ سے سن لو۔ میں نے پہلے ہی دن تمہیں دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ تم کسی بڑے مقصد کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ جس چھوٹی سی عمر میں تم نے میرے کامران کا علاج کیا تھا، یا تم نے بلبیر کو سانپ کے چنگل سے چھڑایا تھا، یا ان گنت مریضوں کا علاج کیا تھا۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ نے تمہیں کئی خداداد صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ تعلیم ہی ایک ایسا زیور ہے جو انسان کے اندر کی تمام خوبیوں کو نہ صرف اجاگر کرتا ہے بلکہ چار چاند لگا دیتا ہے۔ اگر تم آگے نہیں پڑھو گے تو تمہاری تمام خوبیاں ادھوری رہ جائیں گی۔ ہمارے سکول کی پندرہ سالہ تاریخ میں تم سے پہلے کسی نے بورڈ میں کوئی پوزیشن نہیں لی۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ تم آگے پڑھو۔ اگر تمہارا نتیجہ اتنا اچھا نہ نکلتا تو میں تمہیں کہہ دیتا کہ تم کالج کا امتحان پرائیویٹ طالبعلم کی حیثیت سے دے دینا اور میں روزانہ تمہیں یہاں پڑھانے آ جایا کروں گا۔ اب میں چاہوں گا کہ تم باقاعدہ کالج میں داخلہ لے لو۔ تمہیں اخراجات کی فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ایک تو اچھے نمبر لینے پر تمہیں سرکار سے وظیفہ ملے گا اور باقی تمام اخراجات کی ذمہ داری میری ہو گی۔ تم اگر چاہو تو پاہیرالہ میں آمنہ کے میکے رہ جاؤ یا پھر سکول کے ہاسٹل میں۔ دونوں جگہوں پر تمہارا قیام اور دیکھ بھال بھی میرے ذمے ہو گا۔ میں تمہاری تعلیم کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ تم مجھے ناامید نہ کرنا میرے بچے۔

باپو، چاچو، اور امی میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میرے پاس ان کو دینے کے لیے ابھی تک کوئی سوچا سمجھا جواب نہیں تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے میں یہ سب کچھ سوچتا رہا تھا لیکن ابھی تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ مجھے مستقبل میں کیا کرنا ہے۔ دراصل وقت بجلی کی رفتار سے گزرا تھا۔ میں نے سوچا کہ وقت تو گزرنے کے لیے ہی آتا ہے۔ اگر آج میں نے وقت کی ڈور اپنے ہاتھوں میں نہ تھامی تو یہ میرے ہاتھوں سے ویسے ہی نکل جائے گا جیسے امتحان کے بعد سے اب تک کے پچاس دن نکل گئے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور تینوں سے مخاطب ہو کر فیصلہ کن لہجے میں کہا، میں آگے بھی پڑھوں گا اور ماموں کے گھر بھی رہوں گا۔ میرا جواب سن کر تینوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ پھر تو ہمیں آج پاہیرالہ جانا ہوگا کیونکہ داخلے کل سے شروع ہونے ہیں۔ امی نے جذباتی انداز میں کہا۔ نہیں اب خاصی دیر ہوگئی ہے۔ ہمیں تیاری کرتے اور بس کے اڈے تک جاتے جاتے آخری بس نکل جائے گی۔ کل اگر صبح تڑکے نکل جائیں تو میرے خیال میں بہتر ہوگا، چاچو بولے۔ ہم پھر راموکو آج اپنے ساتھ ہی لیتے جائیں۔ کل یہاں آ کر راموکو لے جانے میں کافی وقت ضائع ہو جائے گا، امی نے کہا۔ باپو کچھ سوچ کر بولے، تم لوگ راموکو کل تو کالج میں داخل ہی کرواؤ گے نا؟ میں نے باپو کی آواز میں اپنے لیے فکر مندی محسوس کی۔ جی ہاں۔ ہم کل داخل کروا کر پرسوں واپس آ جائیں گے۔ نئی کلاسیں شروع ہونے میں ابھی دس پندرہ روز پڑے ہیں، چاچو نے جواب دیا۔ چاچو کے جواب نے باپو کو خاصا مطمئن کر دیا تھا۔ مجھے تیاری کرنے میں بھلا کتنی دیر لگنی تھی۔ میں نے ایک کپڑے کی گٹھری میں اپنے دو جوڑے باندھے، کالی کے پاس جا کر پرسوں آنے کا وعدہ کیا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ باپو نے مٹھائی کا ڈبہ امی کو واپس کرتے ہوئے کہا، بہن جی یہاں پر مٹھائی کون کھائے گا؟ یہ ہماری طرف سے مسجد کے دروازے پر بانٹ دیجئے گا۔ اگر یہ مٹھائی کوئی ہندو لایا ہوتا تو باپو کہتے، بہن جی اس مٹھائی کی ہماری طرف سے مندر میں پرشاد چڑھا دیجئے گا۔ وہ لوگوں سے ہمیشہ ان کے مذہب کا احترام کرتے ہوئے بات کرتے تھے۔ اس کے بعد مجھے کہنے لگے، اپنا خیال رکھنا بچے۔ ماسٹر جی نے اپنی سائیکل اٹھائی، مجھے آگے ڈنڈے پر بٹھایا، پھر خود بیٹھے، اور اس کے بعد امی کو بستر بند پر بٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

گھر پہنچتے پہنچتے سورج تقریباً ڈھل چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر امی نے غسلخانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، تم نہا کر تازہ ہو جاؤ۔ غسل خانے کے نلکے کے نیچے بالٹی رکھی تھی۔ میں نے پہلے نلکا چلا کر بالٹی بھری اور پھر بالٹی میں رکھے ہوئے ڈبے سے پانی نکال نکال کر نہایا۔ نلکے پر نہانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ نلکے کا پانی جھرنے کی نسبت گرم تھا۔ نہا کر تولیے سے بدن سکھایا، باہر آیا تو امی کھانا گرم کر رہی تھیں اور چاچو تندور سے روٹیاں لگوانے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس پڑی ہوئی چوکی پر بٹھا دیا۔ میں انہیں سالن گرم کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کہنے لگیں کچھ باتیں کرو، تم بہت کم بولتے ہو۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ پچھلے سترہ سال سے میرے آس پاس یا سانپ تھے یا باپو۔ سانپ بولتے نہیں اور باپو بہت ہی کم بولا کرتے تھے۔ اس لیے بس جواب میں مسکرا کر رہ گیا۔ یہ عادت ایک لحاظ سے اچھی بھی ہے کم بولنے والے کو زیادہ سنا جاتا ہے۔ انہوں نے میری طرف سے برقرار خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ کیا تم آگے سائنس پڑھنا چاہتے ہو؟ میرا کامران انجینئر بنے گا۔ میں نے ابھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ چاچو جو مضامین مناسب سمجھیں گے مجھے لے کر دیں گے، میں نے جواب دیا۔ پھر بولیں، تم میرے گھر والوں سے تو پہلے کئی بار ملے ہو۔ میرے بھیا اور بھابھی ہمیشہ سے تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ ہمارے کامران والے واقعے کے بعد سے میری امی تو تمہارے لیے ہر نماز میں دعا کرتی ہیں۔ وہ تمہاری کم گوئی کو بھی پسند کرتی ہیں۔ اتنے میں چاچو روٹیاں لگوا کر واپس آ گئے تو ہم نے گرم گرم تندوری روٹیوں سے کھانا کھایا۔ امی نے آج کریلے پکائے تھے۔ امی کے پکائے ہوئے کریلے مجھے ہمیشہ اچھے لگتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد خاصا اندھیرا چھا چکا تھا۔ جھونپڑیوں میں رہنے والے ہمیشہ جلدی سونے کے عادی ہوتے ہیں اس لیے مجھے جمائیاں لیتے دیکھ کر انہوں نے مجھے کامران کے بستر پر سُلا دیا۔ چارپائی کے بستر پر سونے اور کسی کے ہاں سونے کا بھی یہ میرا پہلا موقع تھا۔ بستر پر سر رکھتے ہی میرے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

ابھی صبح پوری طرح نہیں نکلی تھی کہ چاچو نے مجھے جگا دیا۔ میں نے نلکے پر ہاتھ منہ دھویا، کُلی کر کے آیا تو امی نے رات والی بچی ہوئی آدھی روٹی توے پر گرم کر کے اس پر مکھن لگا کر مجھے ناشتے کے لیے دی۔ باسی روٹی اور مکھن کا یہ ناشتہ مجھے بہت بھایا۔ ناشتہ کر کے ہم سائیکل پر سوار ہو کر بس کے اڈے پر پہنچے۔ بس والے شاید چاچو کو جانتے تھے۔ چاچو کے ساتھ انہوں نے مجھے بھی پہچان لیا۔ بلبیر والے واقعے نے مجھے اپنے علاقے میں خاصا معروف کر دیا تھا۔ چند لوگ میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کسی معمول کی طرح کھڑے ہونے لگے۔ ڈرائیور کے پیچھے والی تین سیٹیں ہمارے لیے خالی کروا کر بس کے کنڈیکٹر نے ہمیں بس میں بیٹھنے کو کہا تو میری مشکل حل ہو گئی۔ بس کی چھت پر سائیکل رکھوا کر چاچو نے بس والوں کو کرایہ دینے کی کوشش کی تو کنڈیکٹر نے کہا، ماسٹر جی ہمارے بھاگوں آپ بھگوان کو ہماری بس میں لے کر جا رہے ہیں۔ اس سے بڑا کرایہ اور کیا ہوگا۔

تھوڑی دیر میں بس روانہ ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ کئی مسافروں کی آنکھیں مجھ پر لگی تھیں۔ میں نے اپنی نظریں جھکا دیں۔ چاچو نے بھی شاید اس بات کو محسوس کر لیا تھا اس لیے انہوں نے مجھ سے راستے بھر کوئی بات نہیں کی۔ بس چلتی اور رکتی رہی اور میں اپنی آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا۔

پاہیرالہ پہنچ کر ڈرائیور نے ہمیں بڑے احترام سے اتارا، بس کی چھت سے چاچو کی سائیکل اتروائی، میرے چرن چھوئے اور ہمیں جانے کی آگیا دے دی۔ ہم تینوں ایک بار پھر سائیکل پر سوار ہو کر امی کے میکے پہنچے۔ گھر پر صرف

ممانی اور بڑی امی تھیں، ماموں کام پر گئے تھے۔ میں امی کی ماں کو بڑی امی، ان کے بھائی کو ماموں اور ان کی بھابھی کو ممانی کہنے لگا تھا۔ انہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں کالج کے دوران ان کے گھر رہوں گا۔ چاچو نے کہا، میں پہلے رامو کے داخلے کا بندوبست کرآتا ہوں واپسی پر تفصیلی باتیں کریں گے۔ ہم امی کو گھر میں اتار کر سائیکل پر کالج کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت تقریباً دن کے دس بجے ہوں گے۔ ان کے گھر سے کالج پہنچنے میں ہمیں کوئی دس منٹ لگے ہوں گے۔ کالج کے گیٹ پر میں نے ایک جیپ رکی ہوئی دیکھی مجھے ایسا لگا جیسے یہ جیپ میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ اس سے پہلے میں اپنی یادداشت پر زور دیتا، میں نے جیپ میں بیٹھے ہوئے ٹام کو پہچان لیا۔ اس نے بھی ہمیں آتا دیکھ لیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر سائیکل کی راہ میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے جیپ کے دوسرے دروازے سے جینا اور ڈانا کو اترتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔

چاچو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سائیکل روک لی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ٹام نے اپنا ہاتھ چاچو سے مصافحے کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ میرا نام ٹام ہے اور میں رامو کے سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی سائیکل کالج میں کھڑی کر کے ہمارے ساتھ جیپ میں کچھ دیر کے لیے آجائیں۔ چاچو نے ٹام سے ہاتھ ملایا اور میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ تم ان لوگوں کو کیسے اور کب سے جانتے ہو؟ میرے چہرے پر ان کے لیے شناسائی کے آثار دیکھ کر چاچو نے کہا، جی بالکل، اور سائیکل لے کر کالج کے گیٹ میں داخل ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد ٹام مجھے اپنی بغل میں دباتے ہوئے کہنے لگا۔ ہم لوگ تم سے اور کالی سے تصاویر اتروانے آج صبح تمہارے گھر گئے تھے۔ وہاں پر شان جی سے ہمیں تمہارے دسویں جماعت پاس ہونے کی خوشخبری ملی۔ انہوں نے ہی ہمیں بتایا تھا کہ تم ہمیں کہاں پر مل سکو گے۔ اس کے ساتھ ڈانا نے میرے گال پر پیار سے ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا، شاندار کامیابی پر مبارک ہو۔ پھر جینا نے اپنی دونوں بانہیں میری گردن میں بالکل ایسے ڈالیں جیسے کل کالی کو ڈالا تھا اور کہا۔

I am so proud of your exceptional success۔

جینا نے چاچو کو سائیکل رکھ کر آتے دیکھا تو مجھے اپنی بانہوں کے دائرے سے آزاد کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ چاچو نے اسے یہ سب کچھ کرتے دیکھا ہوگا۔ ٹام نے عورتوں کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور مجھے اگلی سیٹ پر کھڑکی کے پاس۔ اس نے چاچو کو اپنے پاس بٹھایا اور گاڑی چلاتے ہوئے چاچو سے بولے، مجھے شان جی نے آپ کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ آپ کی وجہ سے رامو سکول میں داخل ہوا تھا۔ پچھلے دس سالوں میں آپ نے اس کے سکول کے تمام اخراجات برداشت کیے، اور آپ ہی کے کہنے پر اس نے آگے پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب میں آپ کو بتاتا چلوں کہ میں رامو کو کیسے جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے آپ کو کل کے واقعے کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ چاچو نے کچھ کہنے کی بجائے جواباً نفی میں گردن ہلائی تو ٹام نے کہا، کل رامو نے میری جان بچائی ہے۔ اگر یہ میرا بروقت علاج نہ کرتا تو میں ہسپتال جانے سے پہلے ہی مر چکا ہوتا۔ ساتھ ہی ٹام نے جیپ ایک بڑی سی عمارت میں، جس پر سرکٹ ہاؤس کا ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا، داخل کر کے عمارت کے قریب جا کر گاڑی روک دی۔

سب لوگ جیپ سے اتر کر ٹام کی قیادت میں عمارت کے اندر داخل ہوئے اور ایک برآمدے سے ہوتے ہوئے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوگئے جہاں قرینے سے کرسیاں اور صوفے رکھے تھے۔ ٹام نے چاچو کو اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جینا اور ڈانا ہمارے دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ٹام نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے چاچو سے کہا، مجھے یقین ہے کہ آپ کا تعارف بھی رامو سے ایسے ہی حالات میں ہوا ہوگا جن حالات میں اس سے میرا تعارف ہوا تھا؟ چاچو نے کہا، جی ہاں، رامو نے چھ سال کی عمر میں میرے بیٹے کا علاج کیا تھا۔ چاچو کی بات پر تینوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ ٹام نے کچھ زیادہ ہی جذباتی لہجے میں اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، اگر آپ نے اس ہیرے کو بچپن ہی سے پہچان کر تراشا نہ ہوا تا تو یہ اب تک مٹی میں مل کر فنا ہو چکا ہوتا۔ اس کے لیے میں آپ کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہوگا۔ کل میں نے اس کا ہنر دیکھا تھا اور آج اس کا علم دیکھا ہے کہ کسی جھونپڑی میں پروان چڑھنے والا لڑکا پورے بورڈ میں تیسرے نمبر پر آیا ہے۔ مجھے یقین ہے اس سے زیادہ نمبر لینے والے بچے اس سے کئی گنا بہتر ماحول میں پلے بڑھے ہونگے۔ ایسے لوگ جن میں علم و ہنر یکجا ہوں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں، رامو میں یہ دونوں باتیں ہیں۔

ٹام سانس لینے کے لیے کچھ دیر کے لیے رکا پھر اپنی بات شروع کرتے ہوئے بولا، میری آپ سے ایک درخواست ہے اور اسی لیے میں آپ کو یہاں لایا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ رامو کی اگلے دو سالوں کی پڑھائی کے اخراجات کی ذمہ داری آپ میرے سپرد کر دیں۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھا صاب، چاچو نے حیرت سے کہا۔ میں اس کو یا ہیرالہ کے کانونٹ کالج میں داخل کروانا چاہتا ہوں، ٹام نے پُر وقار لہجے میں کہا۔ چاچو حیرت سے اُچھلتے ہوئے بولے، کانونٹ کالج؟ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ وہاں تو بڑے بڑے مالدار لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں؟ اور وہاں پڑھنے والے ایک بچے کی ماہانہ فیس میری ایک سال کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے صاب۔

آپ کو اس کے اخراجات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ماسٹر جی، ٹام نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ آپ صرف مجھے رامو کو آگے بڑھانے کی آگیا دے دیں، باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔ وہاں میرے رامو کا کون خیال رکھے گا، اور اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا کیا ہوگا صاب؟ چاچو نے پوچھا۔ ٹام نے کچھ دیر کے لیے سوچا پھر چاچو سے پوچھا، آپ کی تعلیم کتنی ہے ماسٹر جی؟ چاچو نے نہ سمجھتے ہوئے کہا، میں نے پرائیویٹ طور پر ایم اے ہندی اور

ایم اے اردو کیا ہوا ہے۔ ٹام کچھ سوچ کر مسکرایا اور کہا، اگر آپ کو بھی اس کالج میں پڑھانے کا کام مل جائے اور آپ کی تنخواہ پہلے سے دُگنی ہو جائے اس کے ساتھ ہی جہاں آپ اپنے رامو پر نظر بھی رکھ سکیں تو کیسا رہے گا؟ چاچو کی آواز جیسے حلق میں ہی دب گئی۔ بڑی مشکل سے آواز نکال کر کہنے لگے، صاب اس کالج میں کلرک بھرتی کرانے کے لیے بڑے بڑے وزیروں اور مشیروں کی سفارش آتی ہے۔ مجھے وہاں کس نے پوچھنا ہے؟ ٹام نے کہا، ماسٹر جی اس کی فکر کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ کل آپ اپنے تمام کاغذات کے ساتھ کالج کے پرنسپل کے دفتر میں آ جائیں اور پرنسپل کے سیکرٹری کو بتائیں کہ آپ نے مسٹر سمتھ سے ملاقات کا وقت لیا ہے۔ باقی کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی صاب۔ چاچو جذبات میں اُٹھ کر کہنے لگے، صاب میں پچھلے کئی سالوں سے پاہیرالہ میں اپنے تبادلے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہمارے ملک میں تبادلے رشوت یا سفارش کے بغیر نہیں ہوتے۔ نہ میرے پاس دینے کو رشوت کے پیسے ہیں اور نہ سفارش کرانے کے ذرائع۔ صاب اگر ایسا ہو جائے تو میں آپ کو اور آپ کے بچوں کو تمام عمر دعا دیا کروں گا۔ اللہ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کی جھولیاں خوشیوں سے بھرے، چاچو نے اپنی جھولی اُٹھا کے ان سب کے لیے دعا کی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں میرا خیال آیا اور انہوں نے میری طرف دیکھا تو ٹام نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا، ماسٹر جی آپ رامو کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ میں اس کا داخلہ کروانے کے بعد اس کو گھر پہنچا دوں گا اور ہاں جانے سے پہلے رامو کے داخلے کے تمام کاغذات مجھے دیں جائیں۔ چاچو نے اپنی واسکٹ کی اگلی جیب سے کاغذات کا ایک پیکٹ نکال کر ٹام کے حوالے کیا اور دروازے کی جانب بڑھے تو ٹام نے پیچھے سے آواز دے کر انہیں کہا، ڈرائیور باہر کھڑا ہے اس سے کہیں آپ کو کالج تک چھوڑ آئے۔ وہاں سے آپ اپنی سائیکل لے کر گھر چلے جائیں اور ہاں کل کی ملاقات کے بارے میں نہ بھولیں۔ نہیں سرکار، میں کل حاضر ہو جاؤں گا، یہ کہتے ہوئے چاچو کمرے سے باہر چلے گئے۔ چاچو کے جاتے ہی جینا اپنے صوفے سے اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرے بازو میں بازو ڈال کر کہا، اب میں تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔

ٹام نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، واپس جانے سے پہلے جینا تمہارے اور کالی کے ساتھ کچھ تصویریں اتروانا چاہتی تھی۔ اس لیے ہم آج صبح تمہارے گھر گئے تو شمان جی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی زبانی ہمیں سب کچھ معلوم ہوا۔ پھر وہاں پر ماسٹر جی کا لایا ہوا اخبار پڑھا اور تمہارا نام بورڈ کے پہلے تین لڑکوں میں دیکھ کر ہمیں حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ پھر جب ہمیں شمان جی نے تمہارے پاہیرالہ جانے کی وجہ بتائی تو میں نے سوچا کہ اتنے اچھے طالبعلم کو ایک عام کالج میں نہیں پڑھنا چاہیے۔ تمہارے اندر کی چھپی ہوئی تمام خوبیاں ایک اعلیٰ کالج میں پڑھنے سے زیادہ اجاگر ہوں گی۔ شمان جی نے تمہیں فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار دیا ہے۔ تمہارا جواب سننے سے پہلے میں تم پر ایک بات واضح کر دوں کہ میں تمہارے لیے یہ سب کچھ اپنی زندگی بچانے کے عوض نہیں کر رہا۔ زندگی کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ اگر میں چاہوں بھی تو یہ قرض کبھی ادا نہ کر پاؤں گا۔ اگر تم بورڈ کے امتحان میں ہزاروں طلباء کی طرح پاس ہوتے تو میں یہ سب کچھ نہ سوچتا اور نہ کرتا۔ تمہارا اور ہمارا تعلق صرف ایک جانکار کا سا ہوتا اور بس۔ سکول کے بورڈ کے امتحان میں تمہاری امتیازی کامیابی نے مجھے تمہارے لیے یہ سب کچھ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟ تینوں میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سادہ سے الفاظ میں کہا؟ اگر آگے پڑھنا ہے تو پھر کالج کا چناؤ میرے لیے غیر ضروری ہے۔ میری بلا سے آپ میرا داخلہ کسی بھی کالج میں کرا دیں۔ میرے جواب سے تینوں خوش ہو گئے۔ ٹام نے خوشی سے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

That's a boy. Lets go to get you admitted right away.

But Dad, the jeep went to drop off Master Jee.

جینا باپ کو صوفے سے اٹھتے دیکھ کر بولی۔

اوہ ہاں، تم نے سچ کہا بے بی، ٹام نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ اچھا جیپ آنے تک میں ذرا اپنی ٹانگیں سیدھی کر لوں، وہ صوفے پر لیٹتا ہوا بولا۔

جینا نے مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے کہا، میرے ساتھ آؤ۔ میں اس کے ساتھ اٹھا تو اس کی ماں نے صوفے پر ٹانگیں پھیلا دیں۔ جینا مجھے لے کر برآمدے میں آئی اور کہنے لگی، مجھے کچھ پیاس لگی ہے۔ میرے کمرے میں جانے سے پہلے کچن سے کچھ کھانے پینے کے لیے لے لیتے ہیں۔ کچن میں جا کر اس نے ایک الماری کا دروازہ کھولا تو اس سے ٹھنڈی ہوا نکلی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ الماری نہیں فریج تھا۔ فریج میں کئی مشروب رکھے تھے۔ اس نے ایک مشروب مجھے کھول کر دیا اور ایک اپنے لیے کھولا۔ میری عادت بن گئی تھی کہ نئی چیز دیکھ کر اس پر حیرت کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی لاعلمی کا ڈھنڈورا پیٹ کر ان کی توجہ اپنی سمت مبذول کرانے کی بجائے خاموشی سے اس نئے تجربے کو سمجھنے اور سمجھ کر جذب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے جینا کو مشروب کھولتے ہوئے اور پیتے ہوئے دیکھا تو اس کی نقل میں پینے لگا۔ اس میٹھے اور جھاگ والے مشروب کا نام پیپسی تھا۔ پھر جینا مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔

وہ اپنے بستر پر نیم دراز ہو کر لیٹ گئی اور میں اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اس کی دیکھا دیکھی پیپسی پینے لگا۔ وہ میری طرف دکھ کر کہنے لگی، تم مجھے اس لیے بھی اچھے لگتے ہو کہ تم بہت کم بولتے ہو، مجھے زیادہ بولنے والے لڑکے بالکل پسند نہیں۔ لیٹے لیٹے وہ کروٹ بدل کر میرے سامنے کچھ ایسے لیٹی تھی جیسے کلوپیٹرہ فلم میں الزبتھ ٹیلر لیٹی ہو۔ پھر بولی، آج صبح بڑا مزہ آیا، ہم تمہارے گھر گئے، تم تو وہاں نہیں تھے لیکن کالی نے مجھے پہچان کر ایک لمبی زقند لگائی اور میری گردن سے لٹک گئی۔ ڈیڈی اور تمہارے باپو آپس میں باتیں کرتے رہے اور ممی

کالی کے ساتھ میری تصویریں لیتی رہیں۔ ہم نے پوری ایک ریل ختم کی۔ میں لنڈن جا کر یہ تصویریں بنوا کر تمہیں بھیجوں گی۔ پھر جب ہم وہاں سے جانے لگے تو کالی مجھے جیسے جانے سے روک رہی تھی۔ بڑی مشکل سے تمہارے باپو نے اسے مجھ سے جدا کیا۔ مجھے کالی سے محبت ہوگئی ہے۔ ہاں! کالی کی محبت تو مجھے بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ باپو اور کالی کے علاوہ اس بھرے سنسار میں میرا کوئی اپنا نہیں ہے، میں نے جواب دیا۔ اب میں جو ہوں، اس نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔

اچھا یہ بتاؤ اگر میں تمہیں لندن سے خط لکھوں تو تم مجھے جواب دو گے؟ اس نے اپنی کالی کالی آنکھوں سے میری آنکھوں میں تقریباً جھانکتے ہوئے پوچھا۔ کیوں نہیں، میں نے آج پہلی بار اس کے سراپے کا جائزہ لیا تھا۔ اس کی کالی کالی آنکھوں پر لمبا بے داغ دمکتا اور بھرپور جوانی کا اعلان کرتا ہوا گلابی چہرہ، اس کے پتلے اور چھوٹے جسم پر بھلا لگتا تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑی ہوگی لیکن اس کا قد مجھ سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس کی انگلیاں چھوٹی اور ہاتھ پاؤں پتلے پتلے تھے۔ لمبے کالے بالوں کے علاوہ اس کے نقش کچھ کچھ ہندوستانی بھی لگ رہے تھے۔ گورے لوگ آخر دو سو سال تک ہمارے آقا رہے ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ ٹام یا ڈانا کے بڑوں کا سلسلہ کہیں سے ہندوستانی خون کے ساتھ جا کر ملتا ہو اور وہ خون جینا میں اپنا رنگ رکھا رہا ہو۔

اس نے مجھے اپنے سراپے کا یوں جائزہ لیتے ہوئے دیکھا تو اچانک سوال کیا، کیا دیکھ رہے ہو؟ اگرچہ اس نے میری چوری پکڑ لی تھی اس کے باوجود میں مطمئن تھا کہ میری نگاہوں میں ہوس نہیں تھی۔ قدرت کی اچھی تخلیق کو دیکھنا قدرت کو دیکھنا ہے، میں نے اس کے سراپے سے نظریں ہٹا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا، میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ اب تو مجھے بتاؤ کیا میں بھی تمہیں اچھی لگتی ہوں؟ میں جواب دینے سے پہلے سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے جواب کے لیے مناسب الفاظ چنتے ہوئے کہا، تم کس کو اچھی نہیں لگتی ہوگی؟ تم میں ایک اچھا دوست بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور کوئی بھی انسان تم جیسی ہستی سے دوستی پر فخر کرسکتا ہے۔ اور مجھے بھی تمہیں اپنا دوست کہنے پر ناز ہوگا۔ وہ میرے جواب سے ایک دم بستر سے ایسے اچھلی جیسے بستر کے سپرنگ نے اسے اچھال کر میرے سامنے پٹخ دیا ہو۔ پھر وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی، خدا کا شکر ہے کہ تم نے مجھے اپنی محبت کا یقین نہیں دلایا۔ تم پہلے لڑکے ہو جس نے مجھ سے کوئی غلط امید باندھنے کی بجائے مجھے صرف دوست کہا ہے۔ مغرب اور مشرق کے لڑکوں میں شاید یہی فرق ہے، میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ارے تم مسکراتے بھی ہو؟ میں تو سمجھتی تھی کہ تم ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہو۔ میں نے آج پہلی بار تمہارے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی ہے اور تم مسکراتے ہوئے زیادہ اچھے لگتے ہو اس لیے زیادہ مسکرانے کی مشق کیا کرو، اس نے مجھے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ دوستوں کی خوشی میں شریک ہونا ہی دوستی کی سب سے پہلی شرط ہے۔ میں تمہیں خوش دیکھ کر مسکرا رہا ہوں، میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ باہر قدموں کی چاپ سن کر وہ واپس اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گئی اور نائٹ سٹینڈ پر رکھی ہوئی پیپسی کی بوتل سے مشروب پینے لگی۔ میرے ہاتھوں میں بھی ابھی تک بوتل تھی۔ آنے والا ٹام تھا۔ جینا باپ سے چمٹ کر بولی:

Dad, Ramo and I made a friendship pact today. He promised to write me too.

That's great baby, I am glad to see you happy. You looked so miserable in the early part of our vacations.

جینا نے فوراً جواب دیا:

You grownups were doing the things of your interest. Thats why!

ٹام نے خوش ہو کر کہا۔

I am glad that you finally found someone with a mutual interest.

پھر ٹام مجھ سے بولا **Thanks for entertaining Gina**۔ میرا جواب سنے بغیر اس نے جینا سے کہا، تمہاری ماں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہے۔ جیپ آگئی ہے اور میں رامو کو لے کر کالج جا رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو اپنی ماں کے ساتھ ٹھہر جاؤ۔ نہیں میں آپ کے ساتھ جاؤں گی، اس نے جواب دیا اور ہمارے ساتھ چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

تو چلو، ٹام یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ہم تینوں برآمدے سے نکل کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ ٹام گاڑی چلا رہا تھا، میں ٹام اور جینا کے درمیان جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جیپ پاہیرالہ شہر سے نکل کر جنوب کی جانب مڑی۔ دور سے ہی کالج کی چار منزلہ عالی شان سنگِ مرمر کی عمارت نظر آنے لگی۔ کالج کی عمارت ہی میرے جیسے عام لوگوں کی آنکھیں خیرہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ کالج کی عمارت شروع ہونے سے پہلے ایک بڑا سا بورڈ تھا جس پر جلی حروف میں **Convent College of Pahirala** لکھا تھا۔ جہاں سے ایک خوبصورت دو طرفہ سڑک شروع ہو کر کالج کی عمارت تک جاتی تھی۔ سڑک کے درمیان کی کیاریوں میں موسم کے مطابق پھول لگائے گئے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف اخروٹ، پیپل، ٹاہلی اور کئی دوسرے گھنے گھنے درخت سڑک پر سایہ فگن تھے۔ اس لیے یہ سڑک ٹھنڈی سڑک بھی کہلاتی تھی۔ درختوں کے باہر دونوں طرف کھیل کے میدانوں کا سلسلہ تھا۔ یہ سڑک عمارت کے مین گیٹ پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ مین گیٹ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ گیٹ سے پہلے ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔ اس کیبن میں دن کے وقت دو باوردی سیکورٹی گارڈز اور رات کے وقت ایک گارڈ

ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ ہر آنے والی گاڑی کو روک کر آنے کا کام قصد پوچھا جاتا۔ ایک رجسٹر میں گاڑی کا نمبر، گاڑی میں سوار لوگوں کے نام، کالج میں آنے کا وقت اور آنے کا مقصد درج کر کے گیٹ کھول کر گاڑی کو اندر جانے دیا جاتا اور پھر واپسی پر گاڑی کے اخراج کا وقت درج کیا جاتا تھا۔ ہماری جیپ ابھی گیٹ سے دور ہی تھی کہ ایک گارڈ نے شاید جیپ کو پہچان کر گیٹ کھول دیا تھا۔ گیٹ کے اندر گاڑیوں کے لیے ایک بڑا سا پارکنگ لاٹ تھا۔ ٹام نے ایک جگہ جیپ کھڑی کی۔ ہم اتر کر شیشے کے ایک بڑے دروازے کی طرف بڑھے۔ یہ دروازہ عمارت کے مشرق کی طرف کھلتا تھا۔ اس دروازے پر بھی ایک باوردی گارڈ متعین تھا۔ اس نے ٹام کو دیکھ کر زوردار انداز میں سیلوٹ کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔

دروازہ دوسری طرف ایک ہال نما کمرے میں کھلتا تھا جس کا فرش سنگِ مرمر کی کالی اور سفید اینٹوں سے کسی شطرنج کے میدان کی طرح بنایا گیا تھا۔ ہال کے درمیان ایک چوکور کی صورت میں چند صوفے بچھے تھے جن پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ہال کے تین اطراف برآمدے تھے۔ ہال سے ہم دائیں برآمدے سے ہوتے ہوئے، برآمدے کے اختتام پر جس کمرے میں داخل ہوئے اس پر ایک بورڈ لگا تھا جس پر لکھا ہوا تھا Richard Smith: Principal ۔ پرنسپل کے کمرے سے پہلے سیکرٹری کا کمرہ تھا۔ سیکرٹری کی میز پر گھنگریالے بالوں والی درمیانہ عمر کی ایک دیسی عورت بیٹھی تھی۔ اس نے ہمیں اندر آتے دیکھا تو کھڑی ہوگئی جیسے وہ بھی ٹام کو اچھی طرح سے پہچانتی ہو۔

پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے بہت غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم اس سے بات کیے بغیر پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ ٹام کا بھائی رچرڈ پرنسپل کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھا اور بڑی خندہ پیشانی سے مجھ سے ہاتھ ملاتا ہوا بولا:

Hello. Hello young snake chamer, nice to see you agian.

پھر اس نے ہمیں بیٹھنے کو کہا، ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ سیکرٹری اندر داخل ہوئی اس کی آنکھیں اب بھی مجھ پر جمی تھیں، وہ میرے قریب آئی اور ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو کر کہنے لگی، پربھو آج دوسری بار آپ کے درشن کر کے میری آتما کو بڑی شانتی ملی ہے۔ ٹام، رچرڈ اور جینا نے بڑی حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ پھر رچرڈ نے اس سے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا، سیتا، کیا تم راموکو جانتی ہو؟ ہاں سر میں نے ان کا کرشمہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کون سا کرشمہ سیتا؟ ٹام نے حیرت سے سیتا سے پوچھا۔ سیتا نے مرچ مسالے لگا کر جھیل کنارے بلبیر سنگھ کا واقعہ کچھ اتنی تفصیل سے اور مجھ سے بہتر انداز میں بیان کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ اس نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔ شاید اسے درمیان میں ٹوکے جانے کا خدشہ تھا۔ اس نے آخر میں بتایا کہ وہ بھی ان بھاگیوان لوگوں میں تھی جنہیں اس رات جھونپڑی میں میرے چرن چھونے کا مان حاصل ہوا تھا۔ ٹام اور رچرڈ کے چہروں پر حیرت کے ساتھ بے یقینی کے آثار تھے جبکہ جینا مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے میری دوستی پر فخر ہو۔ اس دوران میں اپنی نظریں زمین میں بوس کیئے رہا۔ مجھے الجھن اس بات کی تھی کہ اگر سیتا اس واقعے کا ذکر نہ کرتی تو کیا فرق پڑتا تھا۔ یہ کب کی بات ہے؟ ٹام نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ دو برس کی بات ہے سر، پھر ٹام نے مجھ سے پوچھا، کیا یہ سچ ہے؟ جی ہاں، میں نے نظریں زمین سے اٹھائے بغیر کہا۔ سر، کیا میں آپ کے پینے کے لیے کچھ منگواؤں؟ سیتا نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ ہاں ٹھنڈا پانی بھجوادو، ٹام نے جواب دیا۔ سیتا مڑ کر مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی ٹام نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا، میں ہر روز پہلے سے زیادہ تم سے متاثر ہوتا ہوں۔ معلوم نہیں ابھی تمہاری اور کتنی خوبیاں سامنے آئیں گی۔ میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا بس نظریں زمین پر گاڑے بیٹھا رہا۔ جینا سے میری یہ حالت نہ دیکھی گئی تو اس نے باپ سے کہا:

Daddy, Juststop it now. Don't embarrass him anymore.

Don't you see he is feeling so shy?

ٹام کو بھی شاید اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولا، I am sorry boy۔ رچرڈ نے کسی سے فون پر کہا، تم میرے دفتر آ کر ایک نئے طالبعلم کو لے جا کر اس کے داخلے کے تمام انتظامات مکمل کرانے کے بعد اسے پورا کیمپس دکھا کر واپس یہاں لے آؤ۔ کچھ دیر بعد ایک دیسی نوجوان لڑکا کمرے میں آیا تو رچرڈ نے مجھے اس کے ساتھ جانے کو کہا۔ کیا میں بھی ساتھ جاؤں ڈیڈی؟ جینا نے میرے ساتھ ہی کرسی سے اٹھتے ہوئے باپ سے پوچھا۔ کیوں نہیں، ٹام نے جواب دیا اور ہم دونوں اس نوجوان کے ساتھ پرنسپل کے کمرے سے باہر آ گئے۔

باہر آتے ہی میں نے جینا سے کہا، میری مدد کرنے کا شکریہ۔ اگر آج تم نہ ہوتیں تو نہ جانے بات کب اور کہاں ختم ہوتی؟ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے جواب دیا، What a friend is for پھر وہ کہنے لگی، واقعی تم میں حیران کن صلاحیتیں موجود ہیں۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ تم نے پندرہ سال کی عمر میں اتنے بڑے ناگ سے لڑائی کی تھی۔ Now you are embarrassing me، میں نے اسے کہا۔ وہ جواباً بولی، مجھے تمہاری اور اچھی عادات میں سے ایک عادت یہ بھی بھاتی ہے کہ تم اپنے بارے میں کسرِ نفسی سے کام لیتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی ہم ہال سے ہوتے ہوئے، سامنے کے برآمدے میں داخل ہو چکے تھے۔ اس برآمدے کے اطراف کمرے تھے ہر کمرے کے باہر تختی لگی تھی۔ ہم سب سے پہلے درزی کے کمرے میں گئے جس نے مرا مکمل ناپ لیا۔ ہم وہاں سے نکل کر تصویر کھنچوانے کے لیے رکنے والے تھے کہ جینا نے مجھے وہاں سے نکالتے ہوئے کہا، چلو پہلے تمہارے بال کٹواتے ہیں پھر تم اپنی تصویر کھنچوانا۔

ابتدا میں باپو میرے سر پر کبھی کبھار استرا پھیرا کرتے تھے۔ بعد میں امی میرے بال کاٹا کرتی تھیں۔ پچھلے دو مہینوں سے کسی نے میرے بال نہیں تراشے تھے اس لیے میرے بال اب کافی لمبے ہو چکے تھے۔ آج پہلی بار میں کسی ہنر مند نائی سے بال کٹوا رہا تھا۔ نائی نے میرے بال فوجی انداز میں بڑے سلیقے سے تراشے۔ بال کٹوانے کے بعد ہم فوٹو گرافر کے پاس گئے۔ فوٹو گرافر نے میرے ہاتھ پر ایک فارم رکھتے ہوئے اسے بھرنے کو کہا، میں فارم بھرنے بیٹھا تو جینا وہاں سے نکلی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ہینگر تھا جس پر کپڑے ٹنگے تھے۔ وہ کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے بولی، اگر فوٹو کھنچوانا ہے تو یہ کپڑے پہن لو اور ہاں باتھ روم جا کر چہرہ بھی اچھی طرح صاف کر لو، کیونکہ یہ فوٹو تمہارے لیے اگلے دو سال تک ID badge کے طور پر استعمال ہوگا۔ میں باتھ روم گیا تو میری زندگی کا ایک اور تجربہ تھا۔ میں نے اپنی حیرت کو پس پشت ڈال کر کپڑے پہننے کی کوشش کی یا کوشش کرنے لگا۔ پتلون کوٹ اور ٹائی پہننے کا یہ میرا پہلا موقع تھا، باقی تو سب کچھ کسی نہ کسی طرح پہن لیا لیکن ٹائی باندھنا میرے بس سے باہر تھا۔ ٹائی ہاتھوں میں پکڑے باہر آیا تو جینا نے میری مجبوری سمجھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھوں سے ٹائی پکڑی اور اسے میرے گلے سے باندھنے کے بعد اس نے ٹائی کی گرہ درست کی، پھر ڈریسر سے ایک کنگھی اٹھا کر میرے بال سنوارے، اور میری طرف دیکھ کر بولی، اب تم تصویر کھنچوانے کے لیے تیار ہو۔ کیمرہ مین نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا ابھی اس نے مجھے تیار ہونے کو کہا ہی تھا کہ جینا نے سامنے سے آواز لگائی، تم ایسے بیٹھے ہو جیسے کسی نے یہاں مار کر بٹھایا ہو۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ ٹھیک اسی وقت کیمرے نے میری تصویر اتار دی۔

فوٹو اتروانے کے بعد جینا نے مجھے ٹائی کی گرہ لگانا سکھایا، جب اس نے محسوس کیا کہ مجھے ٹائی کی گرہ لگانا آ گیا ہے تو اس نے مجھے باتھ روم جا کر کپڑے بدلنے اور فوٹو والے کپڑے واپس ہینگر پر ٹانگنے کو کہا۔ میں نے کپڑے بدلے اور انہیں باہر لا کر جینا سے پوچھا، یہ کپڑے تم نے کہاں سے لئے تھے؟ یونیفارم ہاؤس سے، وہ بولی، ان کے پاس ہر ناپ کے کپڑے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ آگے جانے سے پہلے ہم نے کپڑوں والا ہینگر یونیفارم ہاؤس والوں کو واپس کر دیا۔ اس کے بعد ہم لائبریری اور تقریباً پندرہ سولہ جگہوں پر رکے اور ہر جگہ ایک ایک فارم پُر کیا۔ پھر ہم نے اپنے گائیڈ کی معیت میں کالج کیمپس دیکھا۔

کالج ایک مربعے کی شکل میں تھا۔ عمارت میں داخلہ مشرقی دروازے سے ہوتا تھا جو ایک بڑے ہال میں کھلتا تھا جس کے بائیں برآمدے میں کالج کے تمام دفاتر تھے۔ اکاؤنٹینٹ کے کمرے کا دروازہ بھی اسی برآمدے میں کھلتا تھا۔ کالج کے دو نائب پرنسپلز کے دفاتر بھی اسی جگہ تھے۔ ان میں ایک لڑکیوں کا نائب پرنسپل اور دوسرا لڑکوں کا تھا۔ اسی برآمدے میں سب سے آخر میں پرنسپل کا دفتر تھا۔

ہال کے دائیں جانب والے برآمدے کو بازار کہتے تھے کیونکہ اس میں Snack shop, dry cleaners exercise hall, laundryshop, photo ID branch, library, books store, drug store, departmental store, general store, barbershop, cantina, cafeteria, fresh produce store کے علاوہ بھی کئی اقسام کی دکانیں تھیں۔

Dry cleaners, exercise hall, laundryshop, photo ID brnach, library, bookstore, barbershop پہلی منزل پر یہ تمام سہولیات طلباء وطالبات کے لیے مفت تھیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ مراعات طلباء وطالبات کی فیس میں شامل تھیں۔ جبکہ دوسری منزل پر Snack shop, departmental store, general store, cantina, cafeteria, fresh produce store, stationery shop سے طلباء اور طالبات نقد یا ادھار خرید سکتے تھے۔ یہ دکانیں ہفتے کے چھ دن رات کو آٹھ بجے تک کھلی رہتی تھیں۔ جبکہ اتوار کے دن چار بجے بند ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہاں ملک کے تین بڑے بڑے بنکوں کی برانچز کے علاوہ ایک ڈاک خانہ بھی تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا کلینک تھا جس میں ایک نرس ہر وقت موجود رہتی تھی جبکہ ڈاکٹر دن میں چند گھنٹوں کے لیے باقاعدہ آتا تھا، باقی اوقات میں ڈاکٹر کو بوقتِ ضرورت بلایا جاتا تھا۔ اسی بلاک کی تیسری منزل پر meditation hall تھا جس میں ایک چھوٹی سی مسجد، ایک مندر، ایک گردوارہ، ایک گرجا اور چند کمرے دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے طور پر مختص تھے۔ ہر عبادت گاہ میں ایک مذہبی عالم بھی موجود ہوتا تھا۔ چوتھی منزل پر ایک بڑا سا ہال تھا جو اتوار والے دن سینما ہال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں طلباء کو ہفتے کے روز اور طالبات کو اتوار کے دن مفت فلم دکھائی جاتی تھی۔ فلم کے تین شو چلتے تھے اور کسی طالبعلم کو ایک بار سے زیادہ فلم دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ہال ہفتے کے باقی دنوں میں ڈرامہ ہال کہلاتا تھا۔

مین لابی کے ہال کے پیچھے کا دروازہ مغرب کی سمت کالج کے اندرونی باغیچے میں کھلتا تھا۔ باغیچے کے درمیان ایک بہت بڑا سیمنٹ کا ہیلی پیڈ تھا جس پر ہیلی کاپٹر اترتے تھے۔ یہ ہیلی پیڈ اتنا بڑا تھا کہ اس میں بیک وقت تین چار ہیلی کاپٹر آسانی سے اتر جاتے تھے۔ دائرے کے اطراف پانچ چھ فٹ چوڑی سرخ اینٹوں کی گزرگاہیں تھی۔ جو ایک تو باغیچے کو چار برابر حصوں میں تقسیم کرتی تھیں اور دوسرے کالج کے چاروں بلاکوں کو آپس میں ملاتی تھیں۔ باغیچے کے چار میں سے ایک حصے میں بیڈمنٹن کے دو میدان تھے، دوسرے میں ایک نہانے کا بہت بڑا سا تالاب تھا۔ جس کا پانی ایک طرف سے دو فٹ کی گہرائی سے شروع ہو کر دوسری طرف دس فٹ تک گہرا تھا۔ تالاب سے باہر نہانے کے لیے باتھ روم تھے۔ تالاب کے پاس ایک میز پر صاف تولیوں کا انبار لگا رہتا تھا اور اس کے ساتھ ایک ڈرم میں استعمال شدہ تولیے رکھے جاتے تھے۔ تالاب کے اطراف

پلاسٹک کی کرسیاں رکھی رہتی تھیں۔ باقی دو باغیچے بڑی بڑی خوبصورت کیاریوں، پھولوں، فواروں اور قمقموں سے سجے ہوئے تھے۔ رات کے وقت یہ قمقمے روشن ہو کر ایک عجیب سا سماں پیدا کرتے تھے۔ ہر باغیچے میں بیٹھنے کے لیے کئی کرسیاں اور بینچ بھی رکھے تھے۔

شمالی بلاک جس کا نام گرلز ایجوکیشن بلاک تھا جونویں سے بارھویں تک کی لڑکیوں کے لیے تھا۔ شمالی بلاک کی پہلی دو منزلوں میں کلاسیں ہوتی تھیں۔ تیسری منزل پر ان کا کچن اور ڈائننگ ہال تھا۔ جہاں انہیں تین وقت کا کھانا ملتا تھا۔ چوتھی منزل پر ان کے کمرے تھے۔ ہر کمرے میں دو، دو طالبات رہتی تھیں۔ اگرچہ لڑکیوں کی کلاسیں اور کمرے لڑکوں سے جدا تھیں اس کے باوجود کالج کے باقی تمام علاقے دونوں کے لیے مشترک تھے۔ کھیل کے میدان، لائبریری، کلینک، سٹورز، کیفے ٹیریا میں دونوں اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ جنوبی بلاک کو بوائز ایجوکیشن بلاک کہتے تھے۔ یہ بلاک نویں سے بارھویں جماعت کے طلباء کی درس گاہ تھی۔ اس بلاک کی پہلی منزل اور دوسری منزل کے آدھے حصے میں آرٹس کے لیے طلباء کے کلاس رومز تھے۔ دوسری منزل کے باقی آدھے حصے میں کالج کے تمام اساتذہ کے دفاتر تھے۔ تیسری منزل میں سائنس کے طلباء کی کلاسیں لگتی تھیں جبکہ آخری منزل سائنس کی پریکٹیکل کے لیے لیبارٹریاں تھیں۔

عمارت کے مغربی بلاک کی پہلی منزل کے چوتھائی حصے میں کالج کا بہت بڑا باورچی خانہ تھا۔ اس باورچی خانے میں سکول کے پانچ سو طلباء اور طالبات کے لیے تین وقت کا کھانا پکتا تھا اور اس میں تقریباً تیس ملازمین ہر وقت مصروفِ کار رہتے تھے۔ اس منزل کا باقی تین چوتھائی حصہ ایک بہت بڑے ڈائننگ ہال پر مشتمل تھا جس میں صبح سات سے نو بجے تک ناشتہ، دوپہر بارہ سے دو بجے تک ظہرانہ اور شام چھ سے آٹھ بجے تک شام کا کھانا کھلایا جاتا تھا۔ باقی تین منزلوں پر طلباء کے کمرے تھے۔ ہر کمرے میں ایک طالبعلم رہتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد ہم واپس پرنسپل کے دفتر آئے تو رچرڈ نے مجھے دیکھ کر کہا:

Congratulations boy. Now you are an official student of this college.

ہمارے پہنچنے پر ٹام نے اٹھتے ہوئے کہا، بہت وقت ہو گیا ہے۔ اب ہمیں سرکٹ ہاؤس واپس جانا چاہیے۔ ہم چلنے لگے تو پیچھے سے رچرڈ کی آواز آئی، تم سے دو ہفتوں بعد ملاقات ہوگی سپیرے۔ پندرہ تاریخ کو دوپہر کے وقت تمہیں لینے کے لیے جیپ بھجوا دوں گا۔ تیار رہنا۔ جی ضرور، میں نے دروازے سے مڑ کر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ہم تینوں دفتر سے باہر نکل کر جیپ کے قریب آئے تو جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کا باوردی آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جینا اور ٹام پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں ڈرائیور کے پاس اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ ٹام نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، اب تم ہمارے ساتھ سرکٹ ہاؤس میں ظہرانہ کھاؤ گے۔ اس کے بعد یہ ڈرائیور تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔ ہم لوگوں نے آج شام کلکتہ واپس جانا ہے، دو دن بعد ہم واپس انگلینڈ جائیں گے۔ یہ ڈرائیور تمہیں پندرہ تاریخ کو دوپہر کے وقت واپس کالج لے آئے گا۔ تم سکول کے ہاسٹل میں رہو گے۔ اس کے بعد ہر ہفتے والے دن تمہیں یہ جیپ کالج سے گھر چھوڑ کر اتوار کے روز گھر سے واپس کالج لینے آیا کرے گی۔ اگر کبھی کوئی بات ہو تو تم رچرڈ سے کہہ دیا کرنا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا، اور یہ میرا کارڈ ہے۔ جب بھی تمہیں ضرورت ہو مجھے یاد کر لینا۔ جینا تمہیں سکول کے پتے پر خط لکھے گی، اس نے جینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جواب میں جینا نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ پھر وہ میری طرف دیکھتا ہوا بولا، ہاں میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ میں نے تمہارا رجحان جانوروں کی طرف دیکھتے ہوئے گیارھویں جماعت میں تمہارے لیے حیاتیاتی سائنس کے مضامین منتخب کیے ہیں۔

میں نے ٹام سے کہا، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ جس محبت سے میرے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں یہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ ٹام بولا، شکریہ تو میں تمہارا ادا کروں کہ تم نے میری بیٹی کو ہندوستان آنے کی وجہ دی ہے۔ یہ اب تک دس بار یہاں آ چکی ہے اور ہر بار نہ آنے کے حیلے کرتی رہتی تھی۔ کل ہی یہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اب ہم کب ہندوستان واپس آئیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کو تمہاری وجہ سے ہندوستان بھایا ہے۔ میں نے ٹام اور جینا دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میری سترہ سالہ زندگی میں کالی کے علاوہ میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ جینا پہلی ہستی ہے جس نے مجھے دوست کہا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح کالی کی دوست ہوں، جینا نے درمیان میں کہا۔ ہاں مجھے واقعی اس بات پر حیرت ہے۔ کالی نے اب سے پہلے میرے علاوہ کبھی کسی اور سے اس انداز میں دوستی نہیں کی۔ لگتا ہے وہ تمہیں بھی میری طرح ہی چاہتی ہے، میں نے اپنا بایاں ہاتھ ان کی طرف اٹھا کر جواب دیا۔ جینا نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میرا اُٹھا ہوا ہاتھ پکڑا اور اپنے بائیں ہاتھ سے جوڑ کر بولی:

How interesting! Look at the birthmark on his life palm Daddy.

It looks exactly like the birthmark on my left Plam.

Not only that it looks the same, it is at the exact location.

میں نے تجسس کے عالم میں دیکھا کہ جینا اور میری بائیں ہتھیلی کے عین بیچ مٹر کے دانے جتنا سرخ رنگ کا حیرت انگیز مماثلت کا حامل ایک تل تھا۔ میری طرح ٹام نے بھی بڑی دلچسپی سے ہم دونوں کی ہتھیلیاں پکڑ کر بڑے غور سے دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا،

Is this just a coincident?

چندسپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ ساؤتھ امریکہ)

پروین شیر (نیویارک)

قسط......۳

دنیا سے پرے دنیا

کشتی اب سیاحوں کو گود میں لیے ہوئے Taquile جزیرے کی طرف رواں ہوگئی تھی۔ یہ تین گھنٹوں کا سفر تھا۔ دور ہوتے ہوئے تیرتے ہوئے نرسل کے جزیروں سے آئی مارا زبان میں عورتوں کے گیتوں کی آوازیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ دور سے یہ ننھے منے رنگین جزیرے پانی پہ بکھرے ہوئے پھولوں جیسے نظر آ رہے تھے۔ لیس مانی بول رہا تھا۔۔۔''ٹکیل جزیرے کے باشندے کیچوا زبان بولتے ہیں۔ یہاں بھی Pre Inca تہذیب زندہ ہے اب بھی صدیوں پرانی۔''

ٹکیل جزیرے پر کشتی آ کر رک گئی تھی۔ پہاڑوں کے اوپر ناہموار اور بہت تنگ راستوں سے اوپر جانا ایک چیلنج تھا۔ یہاں عورتیں جھیل کے کنارے گھیرے سرخ گھیر دار اسکرٹ اور سروں پر سیاہ شال اوڑھے اپنے کام میں مصروف دور سے نظر آ رہی تھیں اس طرح جیسے ساحل پر سرخ پھول کھلے ہوئے ہوں۔ سب سیّاح پہاڑوں کے اوپر جانے لگے تھے۔ کیرولینا اور لیس مانی رہبری کر رہے تھے۔ پروین کی نظریں قدرتی حسن کے موتی چن رہی تھیں۔ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے نیلی ٹی ٹی کا کا جھیل دور ہو رہی تھی۔ چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زمیں نے اپنی اوک میں نیلا سیال بھر لیا ہو یا وہ جھیل زمین کی نیلی چمک دار آنکھ ہو۔ دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر سینکڑوں گھروں میں آج بھی انکاز کے ڈائرکٹ Decendent رہتے ہیں۔ پہاڑوں پر Hiking کرتے ہوئے ٹکیل جزیرے پر سیّاحوں کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ تنگ، پتھریلے ناہموار اوپر جاتے ہوئے راستے تھے۔ کبھی کبھی تو پنجوں کے بل بھی اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ کچھ سیّاحوں نے ہار مان لی تھی اور وہ نیچے ہی بیٹھ گئے تھے لیکن پروین نے ہار نہیں مانی تھی۔ رک رک کر اپنی بے ترتیب سانسوں کے ساتھ اوپر چڑھتی جا رہی تھی۔ پتھریلے راستوں کے دونوں طرف جھاڑیاں اور خودرو پودے تھے۔ کہیں کہیں پتھروں کے سینے پر خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے۔ نرم و نازک رنگین اور حسین۔ جنھیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن وہ سبھوں کو چھپ کر دیکھ رہے تھے۔۔۔ مسکرا رہے تھے۔ اس نے ان نظر انداز کیے جانے والے جواہرات کا عکس کیمرے میں چرا کر رکھ لیا تھا۔ سانسیں اور زیادہ بے ترتیب ہو رہی تھیں تو لیس مانی نے اسے اور بقیہ سیّاحوں کو خودرو پودوں سے پتیاں توڑ کر دی تھیں اور انہیں مسل کر سونگھنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے کہا تھا اس پودے کا نام ''مونیا'' ہے۔ اس کی پتیاں ہی ٹکیل جزیرے کے باشندوں کی زندگی ہے۔ اس کی خوشبو اکھڑی ہوئی سانسوں کو ہموار کر دیتی ہے۔ جب اس نے ان پتیوں کو آزمایا تھا تو وہ حیرت زدہ ہوگئی تھی۔ فوراً سانسوں کی بے ترتیبی جیسے ترتیب میں آ گئی ہو۔ قدرت کا یہ کرشمہ ناقابل یقین تھا۔ پورا کٹھن پتھریلا راستہ نرم و نازک ہری پتیوں نے آسان کر دیا تھا۔ اپنی جان دے کر، وہ پتیاں جیسے ممتا سے بھرپور تھیں۔ خود کو پامال کر کے، پس کر انسانوں کو سانسیں مہیا کر رہی تھیں۔ ٹکیل جزیرہ ٹی ٹی کا کا جھیل سے مزید پندرہ سو فٹ اونچائی پر ہے۔ لیس مانی کے مطابق کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی کسی کو یہاں تک پہنچنے میں ہارٹ اٹیک تک ہو چکا تھا۔۔۔ (550) پانچ سو پچاس خطرناک اونچی سیڑھیاں سر کرنا آسان تو نہیں۔ پروین کو یونان کی یاد آ گئی تھی۔ وہاں بھی وہ اسی صورت حال سے گزری تھی لیکن وہاں پونی (خچّر) کی سواری جیسی سہولت بھی تھی اس لیے آرام تھا۔ وہاں سیّاحوں کے سامان بھی گھوڑے پہاڑوں پر ہوٹل تک لے جاتے ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے تک پہاڑ کے Winding Path پر ہائی کنگ کر کے اوپر ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچ کر جان میں جان آ گئی تھی۔ یہاں ایک بہت بڑا Main Square ہے۔ ایک چرچ اور چاروں طرف دوکانیں ہیں۔ دور Terraces نظر آ رہے تھے جن پر کاشت ہوتی ہے۔ یہاں بھی ان کے لباس بڑے شہروں سے مختلف اور قدیم روایتوں کے مطابق ہیں۔ لیما جیسے شہر میں زیادہ تر امریکن پوشاک ہے۔ ہر قصبے کی اپنی پہچان ہے جو ہیٹ (Hat) کے مختلف رنگ اور بناوٹ پر منحصر ہے۔ ٹوپیوں اور ہیٹ کے مختلف ڈیزائن اور رنگ اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ کون شادی شدہ ہے اور کس کی شادی ہونے والی ہے۔ لباس اور ٹوپی یا ہیٹ کے مختلف رنگ معاشرتی درجے کی بھی پہچان ہیں۔ ایک لیڈر کی ٹوپی کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور شادی شدہ جوڑوں کا سرخ۔ غیر شادی شدہ کا سفید۔

پروین دیکھ رہی تھی دور پہاڑی کے پاس کوئی اِنکا عورت اکیلی بیٹھی ہوئی ہے اور جھیل کی وسعت میں کھوئی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی کچھ بُن رہی ہے۔ یہاں کے مرد اپنے ہاتھوں کے بنے ہوئے سیاہ پینٹ اور سفید قمیض میں ملبوس تھے۔ کمر پر چوڑا بلٹ جس پر کیلنڈر کے نشانات تھے۔ عورتیں گھیر دار سرخ اسکرٹ میں تھیں جسے وہ لوگ Polleras کہتے ہیں۔ سیاہ شال سر پر بھی اوڑھے تھیں کہ پہاڑ پر سورج کی تیز شعاعوں سے بچ سکیں۔

اس جزیرے میں کچھ تنگ گلیاں ہیں۔ لیس مانی سب سیّاحوں کو ایک ساتھ رہنے کی ہدایت کر کے جزیرے کی سیر کروا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بولتا جا رہا تھا کہ ''اس جزیرے میں بائیس سو افراد رہتے ہیں۔ یہاں ہر سال چالیس ہزار سیّاح آتے ہیں۔ یہ جزیرہ انکاز سلطنت کا حصہ تھا۔ اسپین نے جب قبضہ کیا تو وہ اس جزیرے کو جیل کی طرح استعمال کیا کرتے تھے۔ یہاں دو اسکول ہیں جہاں کیچوا

اور اسپینی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسرا اسکول ہینڈی کرافٹ سکھاتا ہے جوان کی روایت کو برقرار رکھتا ہے۔''

وہ لیس مانی کی معلوماتی باتیں بھی سن رہی تھی اور اس چھوٹے سے جزیرے کے لوگوں کے چہروں پر برستی ہوئی سادگی بھی دیکھ رہی تھی۔ حیرت یہ تھی کہ یہاں کوئی بھی Transportation نہیں ہے۔ ایک سائیکل بھی نہیں ہے۔ لوگ قدموں ہی کے سہارے پہاڑ سے نیچے جاتے اور اوپر آتے ہیں۔ مرد اور عورتیں اپنے قدیم لباسوں میں سودا سلف پیٹھ پر لاد کر اوپر لا رہے تھے۔ مونیا کے پتوں کے سہارے اپنی سانس کو قابو میں رکھتے ہوئے۔

لیس مانی کہہ رہا تھا کہ ٹکیل جزیرے کے باشندے بے حد شرمیلے ہوتے ہیں۔ بیس سال قبل تو یہ حال تھا کہ اجنبیوں کو دیکھتے ہی چھپ جایا کرتے تھے۔ اس گاؤں سے غربت ٹپک رہی تھی اور لوگ بے حد انکسار اور خوش مزاج۔

وہ اس جزیرے پر کھڑی ہوئی محسوس کر رہی تھی جیسے وقت کی کتاب کے سینکڑوں صفحات ہوا نے پیچھے کی طرف الٹ دیے ہوں اور وہ صدیوں پرانی دنیا میں پہنچ گئی ہو۔۔۔ اُس کی ملاقات ایک جوڑے سے ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی ہنس مکھ اور اخلاق مند تھے۔ وہ دونوں اس سے اپنی زبان کیچوا میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی تو لیس مانی نے مدد کی تھی۔ شوہر اپنے بلٹ کی طرف اشارہ کر کے فخر سے بتا رہا تھا یہ اس کی بیوی کی زلفوں سے بنا ہوا ہے۔ یہی دستور ہے کہ شادی شدہ مرد اپنی بیوی کی زلفوں سے بنا ہوا بلٹ پہنتے ہیں۔ شوہر اپنی بیوی کا اسکرٹ بُنتا ہے اور بیوی شوہر کا بلٹ۔ شادی سے قبل باپ اپنی بیٹی کا اسکرٹ بُنتا ہے۔

ایک معصوم بچہ اپنی خوبصورت حیران آنکھوں سے سب سیاحوں کو تک رہا تھا۔ وہ اپنے پرس سے اُس بچے کو چاکلیٹ نکال کر دینے لگی تو لیس مانی نے روک دیا تھا۔ کیونکہ اس جزیرے پر بچوں کو کچھ دینا منع ہے۔ خاص کر مٹھائیاں۔ کیونکہ وہاں دانت کے علاج کی کوئی سہولت نہیں ہے۔ کسی بچے کو اور کچھ بھی اس لیے نہیں دیا جاتا کہ انہیں بھیک کی عادت نہ پڑ جائے۔ صرف تصویریں اُتارنے پر ایک Sole دینا ضروری تھا۔ یہ آمدنی کا ذریعہ تھا۔ ان لوگوں کے لیے ان کا خاندان سب سے اہم ہے۔ خاندان میں ان کا پورا گاؤں، جانور اور کھیت شامل ہیں۔ کیونکہ یہ سب ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے۔ یہ سب ایک دوسرے کی وجہ سے زندہ ہیں۔

اب اُس کے ٹور گروپ کو پانچ سو پچاس اونچی سیڑھیوں کو طے کر کے نیچے کشتی تک جانا تھا۔ ٹی ٹی کا کا جھیل اب نزدیک آ رہی تھی۔ کشتی دور کنارے پر سبھی کو اپنی بانہوں میں لینے کے لیے منتظر کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ لیکن ہر طرف حسین نظارے اپنے حسن کی رشوت دے کر اس کے قدم روک رہے تھے۔

دوسرے سیاح اور گائڈ آگے بڑھتے جا رہے تھے اور وہ وہیں کھڑی تھی۔ ڈھلوانوں پر سرخ، نیلے، پیلے اور سفید چھتوں والے مکانات رنگین پھولوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ ہوا کی چوری پکڑی گئی تھی کہ وہ ٹی ٹی کا کا جھیل کے رخسار چوم کر آئی تھی۔ اس کی نمی مساموں میں سما رہی تھی۔ سکون پذیر نشہ سا پیدا کر رہی تھی۔۔۔ زمین دور تھی اور ٹی ٹی کا کا جھیل اُس زمین کی ڈبڈبائی ہوئی نیلی آنکھ جیسی نظر آ رہی تھی۔۔۔

پہاڑوں سے نیچے جاتے ہوئے اُس نے دیکھا تھا پتھروں کے درمیان ایک اکیلا سرخ پھول اُسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ وہیں رک کر اس پھول کو دیکھ کر سوچ میں ڈوب گئی تھی کہ سختی کی گود میں یہ تنہا نرمی کسی طرح کھل گئی تھی؟ کتنے اعتماد کے ساتھ وہ پھول سنگلاخ ماحول میں سانس لے رہا تھا۔۔۔ لیکن وہ خود ایسا کیوں نہیں کر پاتی؟ وہ کیوں پاش پاش ہو جاتی ہے، سوچ کے سمندر سے اُبھری تو دیکھا سیاح اور گائڈ اتنی دور جا چکے تھے کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وہ تیز رفتاری سے ڈھلوان سے اُترتی ہوئی اُن کے قریب آ گئی تھی اور اپنی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر نادم تھی کیونکہ گائڈ کی ہدایت تھی کہ سب سیاح اس گروپ کے ساتھ ساتھ رہیں۔

سورج کے بیٹے کی سرزمین (کوسکو Cusco)

پرائیویٹ ٹور بس پونو (Puno) سے کوسکو (Cuscu) کی طرف دوڑ رہی تھی جو تین ہزار، تین سو اسی میٹر سمندری سطح سے اونچائی پر تھا۔ یہ سفر سات گھنٹوں کا تھا۔ ڈرائیور۔۔۔ جس کا نام برائیلو تھا۔۔۔ مشینی انداز میں اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ کوسکو قریب آتا جا رہا تھا اور قدرتی مناظر اپنی دولت کچھ اور زیادہ سخاوت سے لٹا رہے تھے۔ برائیلو اپنے ملک کے متعلق بتائے جا رہا تھا کہ ''کوسکو 13 ویں صدی میں انکاز کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں زندگی کی بھاگ دوڑ بہت کم ہے۔ بڑے شہروں کے مقابلے میں یہاں دھیمی رفتار سے زندگی چلتی ہے۔ یہ شہر 9 صدیوں تک قائم رہا تھا۔ اسپین نے جب آ کر قبضہ کیا تو سب کچھ لوٹ کر اپنے چرچ بنائے، محلات بنائے۔۔۔ شہر کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ کوسکو لیٹن امریکہ کا سب سے پرانا شہر ہے۔ یہاں بھی صدیوں پرانی قدریں محفوظ ہیں۔'' برائیلو کی باتوں میں وقت اڑتا جا رہا تھا۔ پونو پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے اُس کے قریب۔ راستے میں ایک چھوٹے سے قصبے میں برائیلو نے بس روک دی تھی جس کا نام پوکا پوکارا Puka Pukara ہے۔ یہ فوجیوں کا ہیڈ کوارٹر تھا اور غلہ رکھنے کا مقام بھی۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا۔

بس سے اُتر کر اس چھوٹے سے قصبے میں وہ اسی Nostalgic محسوسات سے دوچار تھی۔ کیونکہ یہ جگہ وطن کے کسی چھوٹے شہر جیسی تھی۔ ماسوا سرخ مٹی اور پتھروں کے۔ ایسا سرخ شہر اُس نے صرف سڈونا (Sedona) میں دیکھا تھا جو امریکہ۔۔۔ ایری زونا میں ہے۔ جو دنیا میں سب سے منفرد نظر آیا تھا۔

سیاحوں کے گروپ کو لے کر کیرولینا تنگ گلیوں سے چلتے ہوئے ایک خوبصورت ریستوران میں آ گئی تھی۔ یہاں بھی سبھی کوکا پیتاں چبا رہے تھے کیونکہ آکسیجن یہاں بھی 30 فی صدی کم ہوتا ہے۔ اونچائی کی وجہ سے۔ کوکا پیتاں

بھوک بھی مٹاتی ہیں اور پیاس بھی۔ کیرولینا نے کہا تھا ان پتیوں میں دودھ سے زیادہ کیلشیئم ہے اور یہ متعدد امراض کے لیے بے حد مفید ہے۔ کوسکو کے باشندے اسے تمباکو کی طرح چباتے ہیں۔

ریستوران میں داخل ہوتے ہی سیّاحوں کے لیے کوکا چائے منتظر تھی۔ وہاں بیٹھ کر سب لوگ گرم گرم چائے، کیرولینا کی مسکراہٹ، اسپینی لہجے میں اس کا انگریزی میں باتیں کرنا اور اپنے ملک کی بابت آگاہ کرنا۔۔۔ ان سب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔۔۔ پوکا پکارا کیچوا لفظ ہے جس کے معنی ہیں Red Fortress اور کوسکو کے معنی ہیں زمین کی ناف۔ کیونکہ زمین ماں ہے۔۔۔ یہ جگہ بھی کتنی پُرسکون تھی۔ چرواہے بھیڑوں کے ساتھ گنگنا رہے تھے۔ کچھ لوگ چھوٹے چھوٹے گدھوں کی پیٹھ پر سامان رکھ کر پگ ڈنڈیوں پر دور جا رہے تھے۔ جگہ جگہ بچوں کو کھیل میں مصروف دیکھ کر کیتھی نے پوچھا تھا کہ اسکول کیوں نہیں گئے۔ کیرولینا نے بتایا وہاں کے اسکول جنوری فروری میں بند ہو جاتے ہیں۔ پروین ان بچوں کی معصومیت دیکھ رہی تھی، سوچ رہی تھی۔۔۔ بچے بھی تو موسیقی ہیں۔۔۔ ہوا کے لہروں پہ آزاد، بے فکر، بہتے ہوئے۔ آبشار کی طرح اپنی دھن میں گنگناتے ہوئے۔۔۔ ان خودرو پھولوں کی طرح جو پتھروں کے درمیان بھی کھل جاتے ہیں۔ بادلوں کی طرح آزاد ساری کائنات ان کا ملک ہوتا ہے۔

پروین کا اس طرح رک کر محو ہو جانا سیّاحوں کے گروپ ٹور کے قانون کو توڑنا تھا۔ وقت کی پابندیوں کے قانون۔ کیرولینا کے پیچھے پیچھے سب سیّاح آگے بڑھ جاتے تھے اور وہ پیچھے چھوٹ جاتی تھی۔ اُن تک پہنچنے کے لیے اسے دوگنی رفتار سے دوڑنا پڑتا تھا۔ کچھ خوف کے ساتھ۔۔۔ کہ اس انجانی زبان کی دنیا میں تنہا رہ جانا محفوظ نہ تھا۔۔۔ جب وہ قریب پہنچ جاتی تو جان میں جان آتی تھی۔

پوکا پکارا کی سڑکوں پر سب سیّاح کیرولینا کی باتوں میں محو ہو کر چل رہے تھے اور وہ کوسکو شہر کے متعلق سبھی کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی ''کوسکو سورج کے بیٹے کی زمین کہتے ہیں کیونکہ وہ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے یہ شہر بے حد اہم ہے۔ کوسکو انکا (Inca) سلطنت کا سیاسی، مذہبی اور اقتصادی مرکز تھا۔ یہاں آج بھی مضبوط پتھروں کی دیواریں جو انکاز نے بنائی تھیں موجود ہیں۔ انکاز اتنے ذہین تھے کہ ان کی کاریگری کو اسپین والوں نے بھی اپنا لیا تھا جب وہ 1533 میں یہاں حملہ آور ہوئے تھے۔ اسپینش یہاں کے باشندوں کو غلام بنا کر کانوں میں کام کرواتے تھے۔ عوض میں صرف کھانا دیتے تھے انہیں۔ اس غلامی سے انہیں نجات 1821 میں آزادی کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ آج کوسکو میں نصف ملین لوگوں کی آبادی ہے۔''

کیرولینا حیرت انگیز باتیں کر رہی تھی انکا تہذیب کے متعلق وہ کہہ رہی تھی ''سورج کے بیٹوں کو موت کے بعد بھی یوں رکھا جاتا تھا جیسے وہ زندہ ہوں۔۔۔ تخت پر بٹھا کر۔۔۔ خادم اور بیویاں ان سے باتیں کیا کرتے تھے۔ انکاز سورج کے علاوہ بجلی، چاند، ستارے، دھنک اور دھرتی کی بھی عبادت کرتے تھے۔ لیکن یہ سب چھوٹے خدا تھے۔ چھوٹے خداؤں میں پانی اور اونچے پہاڑ بھی شامل تھے۔ یہ لوگ دھنک سے خوف زدہ ہو جاتے تھے اور دیکھ کر منہ بند کر لیا کرتے تھے کہ Cavities ہو جائے گی۔ حاملہ عورتیں خوف زدہ ہوتی تھیں کہ ان کے بچے ہونٹوں پر لمبے بالوں کے ساتھ پیدا ہوں گے دھنک کی بری نظر کی وجہ سے۔'' کیرولینا کی یہ باتیں سبھوں کو حد درجہ حیران کر رہی تھیں کیونکہ یہ عقیدے آج بھی برقرار ہیں۔ قدرت کی ہر طاقت کی آج بھی عبادت کی جاتی ہے۔۔۔ کوسکو قریب آ رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹا شہر Urcos ملا تھا، جو کچھ کھنڈرات، جھیل اور کوہسار اپنی بانہوں میں لیے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر بھاگتے، کھیلتے ہوئے بچے، گلیوں میں دوڑتے ہوئے کتے، گاڑیوں کے مستقل ہارن بجتے ہوئے۔۔۔ گرد وغبار۔۔۔ مکانات کے اُڑے ہوئے رنگ۔۔۔ پروین کے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئی تھیں۔ اس ماحول سے اُسے ایک اُنس سا محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دوسرے شہر سیکونائی (Sicunai) میں بس رکی تھی۔ یہ شہر بھی Urcos سے مماثلت رکھتا ہے۔ مقامی صنعت کاری کے نمونے بازاروں میں سجے ہوئے تھے۔ مقامی مصوری کی فنکاری کے جادو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے جن میں پیرو کے رنگ بھرے ہوئے تھے۔ پروین نے خوبصورت پینٹنگ دیکھی اور آگے بڑھ گئی۔ مصور اشاروں میں باتیں کر رہا تھا۔ قیمت لکھ کر بتائی تھی جو زیادہ نہ تھی، جو اس نے خرید لی تھی۔ اس پینٹنگ میں جذبوں کے رنگ تھے۔ ایک پیروین ماں اپنے بچے کو بانہوں میں سمیٹے ہوئے تھی۔ ٹور بس اب کوسکو کی طرف رواں تھی۔ سیّاحوں کے چہروں پر تھکن چھا رہی تھی۔ کچھ اپنی سیٹوں پر اونگھنے لگے تھے۔ خاموشی طاری تھی۔ کیرولینا بھی بول بول کر تھک چکی تھی۔

اور پھر۔۔۔ منزل سامنے تھی۔ کوسکو کے ہوٹل Taypikala تک تھی جو اپنے تھکے ہوئے سیّاحوں کو لا کر رک گئی تھی جو سات گھنٹوں تک چلتی رہی تھی۔ اونچے بل کھاتے ہوئے پہاڑوں پر۔۔۔ ہوٹل والوں نے گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ کوکا چائے سیّاحوں کی تھکن دور کرنے کو بے قرار تھی۔

کوسکو کا دل

صبح سویرے وہ ہوٹل سے باہر چہل قدمی کر رہی تھی۔ اُس کے قدم اُس شہر کی سرزمین پر چل رہے تھے جو 9 صدیوں سے وہی پرانی تہذیب اور قدریں تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں انکاز (Incas) کے خدا، سورج کے بچے Manco Capac اور اُس کی بہن Mama Oclo بھیجے گئے تھے ملک کی بہبودی کے لیے۔ جو جھیل ٹی ٹی کا کا سے نمودار ہوئے تھے۔

کوسکو کی پتھریلی گلیوں میں اِنکا کے پرانے مکانات پتھروں کے بنے ہوئے کھڑے تھے۔ مضبوط پتھریلی دیواریں اُن کی ذہانت کی گواہی دے رہی تھیں۔ بغیر کسی اوزار۔۔۔ بغیر کسی سیمنٹ کے 100 ٹن وزنی پتھر اٹھا کر اپنے سورج خدا کی عبادت گاہیں بنانے والے کتنے ذہین تھے۔ پتھروں کو کاٹ کر صرف

ایک دوسرے کے ساتھ فٹ کر کے جو دیواریں انہوں نے صدیوں پہلے بنائی تھیں آج بھی کوسکو کی گلیوں میں ایستادہ ہیں۔ انہیں دیکھ کر عقل کام نہیں کرتی۔ یہ وہ تہذیب تھی جہاں کوئی رسم تحریر نہ تھی۔ وہ ان گلیوں میں تھی جہاں قدیم اِنکا دیواریں (Inca Walls) اور دروازے اپنی کہانیاں سنا رہے تھے۔ جنہیں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اسپینش محلوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ڈھلوانوں پر اونچی نیچی پتھریلی گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ گاڑیوں سے زیادہ تیز رفتار پیدل چلنے والے تھے۔ سڑکوں کے زیادہ تر نام اسپینی زبان میں درج ہیں اور کچھ کیچوا میں بھی۔ دنیا کے کئی ممالک اور ان کے شہروں کو دیکھنے کے بعد کوسکو سب سے زیادہ رنگوں سے بھرا شہر نظر آ رہا تھا۔ عورتیں، لڑکیاں اور بچے گلیوں میں چل رہے تھے اپنے قدیم روایتی لباسوں میں جو گہرے سرخ، نیلے، پیلے اور ہرے تھے۔ کچھ لوگ اپنے ملک کے خاص جانور لاما (Llama) کو پیار سے تھپک رہے تھے۔ پروین کوسکو کے رنگ اپنے کیمرے میں بھر رہی تھی۔ وہ ایک اِنکا عورت کی تصویر لینا چاہتی تھی۔ اُس عورت نے خوشی سے اجازت دی تھی دو Soles لے کر۔ یہ اُس کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔

وہ چلتے چلتے کوسکو کے مشہور پلازہ دی آرمس (Plaza de Arms) پہنچ گئی تھی جسے کوسکو کا دل کہتے ہیں یا اس شہر کی شہ رگ۔ یہاں صبح ہی سے خوب چہل پہل تھی۔ اس پلازہ میں خاص خاص موقعوں پر جشن منائے جاتے ہیں اور پریڈ ہوا کرتی ہے۔ قدم قدم پر جوتے پالش کرنے والے اور فوٹو گرافر پر امید نظروں سے سیاحوں کو دیکھ رہے تھے۔ وسیع پارک گھاس کی نرم ہری چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ ہر طرف بنچ لگے ہوئے تھے جنہوں نے لوگوں کو اپنی گود میں سمیٹ رکھا تھا۔ وہیں بیٹھے ہوئے لوگ دنیا بھر کی چیزیں خرید رہے تھے۔ پلازہ کے درمیان بہت بڑے فوارے کے اردگرد سنہرے بت تھے جن کی پرچھائیاں پانی میں لرزاں تھیں۔ لوگ کہتے ہیں یہ پلازہ دی آرمس اِنکا سلطنت کا خاص مرکز تھا اور آج سیاحوں کے لیے کوسکو میں سب سے اہم مقام ہے۔

وہ ہوٹل جانے کو واپس مڑ گئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ ٹور بس سیاحوں کو کوسکو کے مزید اہم مقامات تک لے جانے کو تیار کھڑی ہوگی۔ پتھریلی گلیاں ڈھلوان کی طرف سیڑھیوں کی صورت ہیں جن پر چلنا ایک چیلنج ہے۔

وقت کے غار میں

ٹور بس کوسکو کے مشہور سیک سے وامن (Saq Saywamen) کھنڈر کی طرف سیاحوں کو لے آئی تھی۔ پہاڑوں کی بانہوں میں اِنکا دیواریں۔۔۔ کچھ نیم ایستادہ کچھ پوری۔۔۔ اپنے خوبصورت ماضی کا اعلان کر رہی تھیں۔ کیرولینا کے مطابق تیس ٹن وزنی پتھر تقریباً ایک سو پچاس افراد رسی سے کھینچ کر اِدھر اُدھر لے جاتے تھے۔ اس جگہ کو بنانے میں ہزاروں لوگ شامل تھے۔

'سیک سے وامن' ایک عالی شان محل جیسا تھا۔ Residential area اور عبادت گاہیں بھی تھیں۔ پلازہ تھے۔۔۔ یہ ایک پورا شہر تھا۔ دیواروں پر پتھروں کو تراش کر Puma کی شکل دی گئی تھی۔۔ کیونکہ پیوما (Puma) سانپ کو وہ انسانی دل کی طاقت مانتے تھے۔ اس لیے اس کے مجسمے ہر جگہ نظر آ رہے تھے جو برائے فروخت تھے۔ کہیں دیواروں پر آڑی ترچھی لکیریں بنائی گئی تھیں پتھروں کو تراش کر جوان کے خدا صاعقہ (Illapa(Thunder کی نشاندہی کر رہے تھے۔

Q'enqo ''کین کو'' ایک عجیب و غریب دنیا ہے۔ ''سیک سے وامن'' سے ایک میل کے فاصلے پر پتھروں کے غار میں۔۔۔ پتھروں کے تہہ خانے پتھر کاٹ کر بنائے گئے تھے جن میں طاق اور کھڑکیاں ہیں۔ بہت تنگ اندھیرے راستے کہ ایک وقت میں ایک ہی شخص کے اندر جانے کی گنجائش ہے۔ اس غار میں مذہبی تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ پتھروں کو تراش کر کرسیاں، سیڑھیاں اور راستے بنائے گئے تھے۔

Tambo machay کھنڈر اِنکاز کی آرام گاہ تھی۔ یہاں دیواریں، کھڑکیاں، سیڑھیاں اور طاق ہیں۔ چھت کہیں نہیں۔۔۔ اُس نے کیرولینا سے اس کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ سب چھتیں پھول کی ہوا کرتی تھیں جو اُڑ گئیں۔ اس کھنڈر میں چار اونچی اونچی دیواریں ہیں۔ دو دیواریں بڑے پتھروں سے بنائی گئی تھیں اور دو چھوٹے پتھروں سے۔ یہ ان لوگوں کی پاک جگہ تھی جہاں شادی کی رسمیں ہوا کرتی تھیں اور Pacha mama (دھرتی ماں) کی عبادت بھی ہوتی تھی۔

- بقیہ -

عید کا فرشتہ

بشرٹ قبول کر لیجیے تو مجھے لگے گا کہ اللہ تعالیٰ نے میری زکوٰۃ کو قبول کر لیا ہے!!'' یہ سنتے ہی احمد نے ارشد خان کے ہاتھ سے بشرٹ لپک لی۔۔۔!!

''سچ انکل۔۔!!؟؟''

''ہاں بیٹا اب یہ بشرٹ تمہاری ہے۔!!''

''شکریہ انکل۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔۔!!''

''میں تمہارا شکر گزار ہوں بیٹا۔۔۔ کہ تم نے اسے قبول کر لیا ہے۔!!''

ارشد خان احمد کو بشرٹ دے کر خوشی خوشی لوٹ گئے۔ احمد کی امی اپنے دروازے سے خدا کے فرشتے کو لوٹتا دیکھ کر سوچ رہی تھی۔۔۔ اللہ کتنا مہربان و رحیم ہے سب کی خبر رکھتا ہے دل کی مرادیں پوری کرتا ہے اگر دعائیں دل کی گہرائیوں سے مانگی جائیں۔ وہ بجلی کی سی تیز رفتار سے مڑی اور بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوگئی۔ انہیں لگا اُن کے گھر تو آج ہی عید ہے۔ عید کا فرشتہ جو اُن کے گھر آ کر اُن کے بیٹے کو عید کی خوشیاں دے کر گیا ہے۔۔۔!!!

''جبینیں تمتماتی ہیں''

ملٹن پونڈ پر کچھ نظمیں

محمود شام
(کراچی)

دھوپ

ہرے پتوں سے چھن کر دھوپ
رہگیروں سے جب ملنے اترتی ہے
سمے میں رنگ بھرتی ہے
نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں
جبینیں تمتماتی ہیں

پگڈنڈی

درختوں میں گھری
بل کھاتی پگڈنڈی مری انگلی پکڑتی ہے
مجھے چلنا سکھاتی ہے
گلہری رہ دکھاتی ہے

جھیل

کناروں سے لپٹ کر جھیل
تصویریں بناتی ہے
جوانی اونگھتے بنچوں پہ اپنے
خواب کی تعبیر پاتی ہے۔ بزرگی حسرتوں کو چھانٹتی ہے
اپنے دکھ سکھ بانٹتی ہے
بزرگی حسرتوں کو چھانٹتی ہے۔ اپنے دکھ سکھ بانٹتی ہے

ریل گاڑی

زمیں کروٹ بدلتی ہے
رگوں میں خوں کی گردش تیز ہوتی ہے

منجدھار میں کشتی

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

میں کمسن سا اِک بچہ تھا　　اور فہم و عقل سے عاری تھا
جب ابّو ہم سے روٹھ گئے　　منجدھار میں کشتی چھوڑ گئے

وہ ساتھ ہمارا چھوڑ گئے　　یوں مان ہمارے توڑ گئے
پھر باقی بھی منہ موڑ گئے　　سب سپنے ہمارے توڑ گئے

وہ وقت ہمارا بھاری تھا　　جو سب کنُبے پہ طاری تھا
یکساں نہیں رہتا وقت سدا　　آتی ہے فلک سے یہی صدا

گو وقت بدلتا رہتا ہے　　پر رازق ایک ہی رہتا ہے
یہ وقت بھی یونہی بیت گیا　　کوئی ہارا اور کوئی جیت گیا

اس فلک نے انساں دیکھے ہیں　　جو رنگ بدلتے رہتے ہیں
ہم سب پہ رہا اللہ کا کرم　　رکھا اُس نے ہم سب کا بھرم

جب رات ڈھلی اور رُت بدلی　　تب پھول کھلے اور صبح ہوئی
امّاں نے نبھایا قول اپنا　　ابّو کا کیا پورا سپنا

یہ ساری عطا ہے اُس رب کی　　جو خالق ہے اور رازق بھی
اِک ذات وہی رہ جائیگی　　جو اوّل ہے اور آخر بھی

○

حرفِ تمنا کی ایجاد

ڈاکٹر جواز جعفری
(لاہور)

میری روح کو
تنہائی کا سامنا ہے
تنہائی
جو روحوں کا مقدر ہے
جسے شکست دینے کے لیے
میں نے حرفِ تمنا ایجاد کیا!
میری تلاش صرف میری تلاش نہیں
اس راستے پر
کچھ خمیدہ کمر مسافروں کے
چپٹے قدموں کے نشان ہیں
ہوا جنہیں مٹانے پر تلی ہوئی ہے!
میری پلکوں پر چمکتا آنسو
میری نوع کا ہم عُمر ہے
جو بے شمار آنکھوں سے ہوتا ہوا
مجھ تک پہنچا ہے
میرا غم
نسلوں کا ورثہ ہے
جسے میں آنے والی نسلوں کے سپرد کرنے کے لیے زندہ ہوں!
وقت کی ریت کے دامن پر
میرے نقش کو
فنا کا سامنا ہے
فنا جسے میرے نصیب کی لوح پر لکھ دیا گیا ہے
میری نوع کا نقش
ازل سے
ہوا کی زد پر ہے!

ہمارا کیا ہے

کرامت بخاری
(لاہور)

ہمارا کیا ہے،
ہماری عادت سی ہو چکی ہے
شفق کی بے خواب وادیوں میں بھٹکتے رہنا
گئی بہاروں کو یاد کرنا
خریت خوردہ ساعتوں کے فسوں میں رہنا
افق میں تحلیل ہوتے رنگوں کو رتجگوں میں تلاش کرنا
تمام اجڑے ہوئے دیاروں میں خاک ہوتے ہوئے
مزاروں پہ جا نکلنا
اور اپنے گزرے ہوئے دنوں کو حساب کر کے کتاب کر کے
ملول ہونا ملول کرنا
ہمارا کیا ہے،
ہماری عادت سی ہو چکی ہے
حروف و قرطاس سے اُلجھنا الجھتے رہنا
خیال کی بے پناہ وسعت میں گرد ہوتی ہوئی مسافت کی
چاپ سُنتا
کہیں کہیں پہ خود اپنے سائے کی صف بنا کر، قیام کرنا کلام
کرنا
خلا کی نیلی ردا پہ جو کچھ رقم ہوا ہے اُسے سمجھنا
سمجھ کے دنیا میں عام کرنا
اور آنے والی تمام نسلوں کے نام کرنا
ہمارا کیا ہے۔

○

پاکستانی دوستوں کے نام

یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

وہ کام جو کرتا گیا، ہر سال،
عادتاً انجانے میں،
اتنے برسوں بعد، آج روک لیا ہے خود کو
بہت مشکل تھا، مگر نے دل تھام کے
کر ہی ڈالا، بے پناہ جبر کیا ہے خود پر،
کہ!
ایک ایک لمحہ میرا، تیرے بغیر،
زہر میں بجھے نشتر کی صورت،
میرے لہو میں اُتر تا رہا ہے برسوں برسوں
لرزہ بر اندام رہا ہے اس جسم و جاں کا
ریشہ ریشہ، اور میں سہتا رہا، سہتا رہا،
کہ اس روز، ہمارا وطن، نذرِ سیاست
ہوا تھا، دولخت ہوا تھا!!
میں تمہیں کیسے مبارک دیتا
ایسے جمہور کی، ایسی تقسیم کی،
جب جب آتا ہے مجھے
تجھ سے ملنے کا خیال،
پی کر رہ جاتا ہوں لہو کے آنسو
کہ ہمارا ایک
دوجے سے ملنا
نہ سہی، غیر ممکن، مگر ممکن بھی تو نہیں
کہ راہ میں حائل ہیں
سینہ تانے کھڑے ہیں سرحد پہ
جاں لیوا سوال!!!

بچپن

وِشال کھُلر
(لدھیانہ، بھارت)

کبھی تو
پکڑتا ہے انگلی مری
اور کبھی بھاگتا ہے
وہ آگے مرے
دیکھتا بھی ہے مُڑ کر
کہ میں پیچھے ہوں (یا نہیں)
اور پھر بھاگتا ہے
یہ شیطان بچّہ
یہ ننھی کلی سی
یہ دُنیا، یہ جنّت مری
دیکھتا ہوں میں مُڑ کر
اسی میں ہی خود کو
میں خود سے بہت تیز چل کے
بڑھا جا رہا تھا
مگر اب میں پیچھے بھی
تکنے لگا ہوں
مرا سارا بچپن
مرے آگے چلنے لگا ہے
○

آئی کنفیس

(بدن منتھن کے گرداب میں)

فیاض احمد وجیہہ

(پٹنہ، بھارت)

پورے جسم کا اُپنیاس ۔۔۔شاید ابھی تخیل کی اُجلی ساعتوں سے محروم ہے۔

تخیل کی دھوپ میں جسم کی کائی اترتی ہے۔۔۔اور بدن منتھن کے گرداب میں روشنی پھوٹتی ہے۔لیکن اُپنیاس کے۔۔۔بڑے بڑے دیدوں۔۔۔کواپنی بے آبی کا احساس بھی نہیں۔حالاں کہ پانی ہست و بود کا اولین استعارہ ہے۔میری پریشانی یہ ہے کہ میں بے آب آنکھوں کا قائل نہیں ہوں۔مجھے آبدیدہ آنکھیں ان ساعتوں میں اور مسحور کرتی ہیں جب کوئی ناول اپنے ہونٹ اور پستانوں کے تغزل میں ہمارے اوپر سایہ کرلے اور جسم کے اُن جزیروں میں لے جائے جہاں بدن غائب ہوجاتا ہے۔

لیکن کیا کیجیے کہ ہمارے ہاں ناول کے بے ہنگم بدن کا شور ہے۔ان کی آنکھیں سلامت ہیں نہ ہونٹوں کی مرصع سازی ہی ۔۔۔اُپنیاس سمراٹ کے تخیل کی نظم بنتی ہے۔پستان کی اُٹھتی بیٹھتی اور رینگتی ترنگوں میں سرعت انزال کی شرمندہ سیاہی کا ورنن ۔۔۔پورے جسم کی کتھا کی تمثیل تو نہیں ہوسکتی ۔پُرش کے اس اُمنک ڈھمک میں ناول اور کہانی بے وقت کی انڈیائی ہوئی کتھا سے زیادہ کچھ نہیں ۔جی چاہے تو یوں کہہ لیجیے کہ ہمارے ہاں کچھ پُرش صورت لوگ ہیں جن کے تخیل کو آنچل آیا ہوا ہے۔۔۔یہ اور بات ہے کہ اس شور کے انوکرن میں ہمیں کتھا کی تخلیقی روح کے آزار کا مطلق احساس نہیں۔

سو تخیل کو آنچل آنے کی صورت میں پورے جسم کے اُپنیاس کی کلپنا مُحال ہے ۔دراصل تخلیقی وصال کے امر کنڈ میں عورت کے بدن کی مقدس گولائیوں کو۔۔۔ چھونے والے۔۔۔ ہی جانتے ہیں کہ کہانی کیا ہوتی ہے(؟)ان کہانیوں کا احساس بھی ہمیں زندہ رکھنے کے لیے بہت ہے۔لیکن احساس کی کتاب لکھنا کوئی آسان کام تھوڑے ہی ہے۔ہمارے زمانے میں شموئل احمد ہیں جن کے ہاں کہانیوں کا یہ احساس زندہ ہے ۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے پورے جسم کی کتھا لکھی ہے(؟) ہاں انہوں نے پورے جسم کے احساس میں ہمیں بے آب ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ان کا ناول ۔۔۔گرداب۔۔۔اسی انوبھوتی کی وبھوتی ہے۔اس میں عورت کی محبت کا مہابیانیہ پورے جسم کی کتھا تو نہیں، لیکن یہ بے وقت کی انڈیائی ہوئی داستان بھی نہیں ۔یوں بھی ہمارے ہاں محبت کی کہانیاں کہاں لکھی گئی ہیں۔شموئل نے محبت کی کئی یادگار کہانیاں لکھی ہیں اور اپنی آبدیدہ آنکھوں میں بہتی کہانیوں کو بہت حد تک ان کے تخلیقی رتبہ کے ساتھ نظم کیا ہے۔

اس اُپنیاس کی بہتی ہوئی آنکھوں میں بھی سوندریہ شاستر کے کئی ادھیائے ہیں، جو اس کو پورے جسم کے احساس میں بہت دور تک لے کر جاتے ہیں۔شموئل نے اس احساس کی شعلگی میں ہی بیانیہ کے اس تفریدی جزیرہ تک رسائی حاصل کی ہے:

۔۔۔تم چاہتے ہو مرجاؤں تو مرجاؤں گی۔۔۔

اس جزیرہ میں بہت کچھ بریکٹ ہوگیا ہے اور پُرش کے آئی کنفیس کا یہ بیانیہ شونیہ کے احساس میں کہانی کے نئے اسطور کا مہابیانیہ بھی بن گیا ہے۔اس مہابیانیہ کو لکھنے کے لیے تہذیب و معاشرت سے زیادہ اپنے جسم کی کائی سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ آسان کام نہیں ہے۔محولہ کلمہ محبت کا مقدس کلمہ ہے، لیکن پُرش کے سوارتھ نے اس کی تشکیل میں سورج دیو کے کریہہ اسطور کو ابدیت عطا کردی ہے۔ اس لیے مجھے ساجی کی موت پر یاسمین اور اس کے راتوں کی اسطوریت کسی اور جہان میں لے جاتی ہے:

۔۔۔’’ایک بات کہوں؟‘‘

’’کہو۔‘‘

’’وہ آپ سے محبت کرتی تھی۔‘‘

’’کیا بکواس ہے؟‘‘میں زور سے چیخا۔

لیکن نصیب پرسکون تھی۔سکون بھرے لہجے میں بولی

’’مجھ سے شیئر کیجیے...میں آپ سے محبت کرتی ہوں.آپ میرے محبوب ہیں‘‘

’’کیا محبت خودکشی کے لیے مجبور کرتی ہے؟‘‘

’’وہ جانتی تھی آپ کی نہیں ہوسکتی۔‘‘

’’یہ تو محبت نہیں ہوئی۔یہ تو قبضہ ہوا۔ قبضہ نہیں کرسکی تو ناکامی میں جان دے دی۔‘‘

’’سچ سچ بتائیے۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’آپ کے دل میں اس کے لیے کوئی ہمدردی؟‘‘

’’ہمدردی تو تمہارے دل میں بھی ہے۔سب کے دل میں ہے۔‘‘

’’مجھے اگر پتا ہوتا کہ وہ آپ پر جان چھڑکتی ہے تو اسے اس طرح مرنے نہیں دیتی۔۔۔

اس جہان معنی کے طلسم میں عورت کی ورن مالا آنسوؤں کی کتاب لکھتی ہے۔۔۔اس کے تیاگ اور چرتر کا ورنن کرتی ہے یا کچھ اور۔۔۔ان باتوں کی تجمیل اور تحمیل سے ذرا پہلے عرض کردوں کہ محولہ استانزہ شموئل کے ناول گرداب کا یادرہ جانے والا مہابیانیہ ہے۔ یہاں میرا موضوع بھی یہی ناول ہے۔لیکن میں

عورت کی کہانی میں اسٹوری سے زیادہ اینٹی اسٹوری کی اُوڈیسی میں نکل پڑتا ہوں۔اس انت ہین یاترا میں کچھ بھی الم نشرح نہیں ہے۔اس لیے آپ کو یقین نہیں دلاسکتا کہ شموئل کے گرداب پر میرا یہ کلامیہ کس نوع کا ہوگا، ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اینٹی اسٹوری کی ساخت میں اسی ناول کا تحرک شامل ہے جو اپنے غیر تنقیدی صیغہ میں اس ناول کا بنیادی رمز بھی ہے۔

اس ناول میں ساجی کی موت دنیا بھر کے مہابیانیہ کا سمندر منتھن ہے۔شموئل نے اپنے اس کلامیہ میں مجھ سے کئی بار پوچھا کہ تم ساجی کی موت کا اسطورہ دریافت کیوں نہیں کرتے۔ہاں شموئل کے تخلیقی ارادھنا میں ساجی کی موتMetaphorical بیانیہ ہے اور اس سے کہیں زیادہ اُس پُرش کا مونولاگ اورMetonymy ہے جو بدن منتھن کے نئے اتہاس اور نئے یگ میں پیدا ہوا ہے۔یہی پُرش مجھ سے پوچھتا ہے ساجی کیوں مرگئی(؟) لیکن اُس کی موت کا اسطورہ شاید میں دریافت نہیں کرسکتا کہ اب یہ آنکھیں روتی ہیں نہ ہنستی ہیں۔سوآئی کنفیس کہتے ہوئے اس گرداب سے نکلنا چاہتا ہوں۔لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے کہ مٹی آدم کی کوکھ جائی ہے۔

تو شموئل کے گرداب کی اینٹی اسٹوری یہ ہے کہ

۔۔۔مٹی سے بنی رات

رات سے بنی عورت

اور

رات کی آنکھیں نوچ لی گئیں

ہاں یہ سطریں شکستہ ہیں مبہم نہیں

کہ

عورت زمین کی بیٹی تھی!!!

لیکن دانا مردوں کی گواہی میں آسمانی کتابیں موجود ہیں۔پھر جانے کیوں زمین نے اپنی بے بسی کی کوکھ سے عظیم اشاروں کو جنم دیا تھا۔زمین کا معجزہ بھی کوئی عورت کی رسالت کا باب ہے—جو اُس پر ایمان لایا جائے۔ودھا تا کی بات ودھا تا ہی جانے میں تو بندہ عاجز ہوں' اس لیے دیر وحرم سے ایسی کوئی نسبت بھی نہیں۔اب کفر بھی بکوں تو کیا(؟) سنگسار بھی کردیا جاؤں تو کیا(؟)۔۔۔اس بندہ عاجز کا سوال یہ ہے کہ آخر کیوں حضرت آدم نے زمین کے تخلیقی اعجاز اور گورو کو قبول نہیں کیا(؟) کیا سیتا زمین کی صبح نہیں تھی؟ کیا صبح رات کی اُمید کا نام نہیں؟ پھر رات اور صبح کے درمیان تفاہم کیوں نظر نہیں آتا؟ کیا آسمان کے فرزندوں نے اس عظیم اشارے کو جھٹلا دیا ہے اور اپنی راتیں پیدا کر لی ہیں؟ شاید اس لیے زمین آج بھی روتی ہے۔زمین کی بے بسی عجیب ہے۔۔۔اور دکھ اس سے بھی عجیب کہ وہ اپنے آنسو نہیں روسکتی' اس لیے میگھ بن کر اپنے ہی اُوپر برس، برس جاتی ہے۔

کیا یہاں یہ کہہ کر ان باتوں کو جھٹلایا جاسکتا ہے کہ ساجی کی محبت ہماری معاشرت کی شریعت کے خلاف ہے۔اگر یہ معاشرت کی شریعت ہے تو پھر ساجی کو ساجی بھی اسی معاشرت نے بنایا ہوگا۔اس لیے میں ذاتی طور پر ساجی کی محبت سے محبت کرتا ہوں اور اس کی موت کو اپنی۔۔۔معاشرت۔۔۔کی موت کا استعارہ تصور کرتا ہوں۔

اس معاشرت کی گودوں پالی دنیا میں چلتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں کہ شاید رات کی تشکیل مردوں نے کی ہوگی اور اپنے پُرش ہونے کے اعجاز کو جس قلم سے لکھا ہوگا اس کی روشنائی بھی سیاہ رہی ہوگی۔رات کی یہی سیاہی عورت کا۔۔۔نوشتہ تقدیر۔۔۔ہے۔اس لیے عورت کی تنویر اور توقیر کا بیانیہ دنیا کی کسی ثقافت میں نہیں ملتا۔

کیوں مردوں کی دنیا میں ان گنت راتیں مل جاتی ہیں' لیکن عورت کی صبحیں طلوع نہیں ہوتیں(؟) اس استفہام کے آگے عورت کی کہانی حزنیہ ہے اور۔۔۔عورت اس رات کی اُپما ہے جو اس سے چھین لی گئی۔۔۔شاید اس لیے میں شدت پسندی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پُرش عورت کی محبت کے لائق ہی نہیں ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ رات کے جن نایک اپنی اس ہوشیاری کو جانتے ہیں۔اس لیے اُن کی محبت بھی اُن کی ہے۔اس محبت میں سب کچھ ہے بس محبت نہیں ہے۔ہاں محبت پُرش کی تشکیل کردہ راتوں کا فریب ہے۔اس فریب کا بیانیہ بھی فراڈ ہے۔ہر زمانے میں اس فراڈ کی بدلتی سچائیوں کے ساتھ بھی عورت کی تقدیر نہیں بدلی۔سو ادب انگلشیہ کی ایک معروف نظم کی پڑھنت سے بھی مردوں کی دانائی اور ان کی دنیا کے سچ کو سمجھا جاسکتا ہے:

Had we but world enough, and time,/This coyness, Lady, were no crime./We would sit down and think which way/To walk and pass our long love's day./Thou by the Indian Ganges' side/Shouldst rubies find: I by the tide/Of Humber would complain. I would/Love you ten years before the Flood/And you should, if you please, refuse/Till the conversion of the Jews/.My vegetable love should grow/Vaster than empires, and more slow;/An hundred years should go to praise/Thine eyes and on thy forehead gaze;/Two hundred to adore each breast;/But thirty thousand to the rest;/An age at least to every part,/And the last age should show your heart;/For, Lady, you deserve this state,/Nor would I love at lower rate./But at my

back I always hear/Time's wingèd chariot hurrying near;/And yonder all before us lie/Deserts of vast eternity./Thy beauty shall no more be found,/Nor, in thy marble vault, shall sound/My echoing song: then worms shall try/That long preserved virginity,/And your quaint honour turn to dust,/And into ashes all my lust:/The grave's a fine and private place,/But none, I think, do there embrace./Now therefore, while the youthful hue/Sits on thy skin like morning dew,/And while thy willing soul transpires/At every pore with instant fires,/Now let us sport us while we may,/And now, like amorous birds of prey,/Rather at once our time devour/Than languish in his slow-chapt power./Let us roll all our strength and all/Our sweetness up into one ball,/And tear our pleasures with rough strife/Thorough the iron gates of life:/Thus, though we cannot make our sun/Stand still, yet we will make him run.

نظم ذرا طویل ہے لیکن اس میں بہت کچھ ہے کہ عرصہ سے محفوظ کنوارے پن اور باکرہ عورت کو۔۔۔فانی دنیا کی حقیقت اور موت کے تصور میں۔۔۔قبر کے کیڑے کا خوف دکھایا گیا ہے۔اس نوع کا مہابیانیہ آسمان سے اتری ہوئی کتابوں میں بھی موجود ہے۔لیکن یہاں خوف دکھانا پُرش کی اپنی فطرت اور رات کی مکروہ تمثیل ہے۔عورت کو اس کی ذات کا عرفان اس نظم کی طرح ہمیشہ مردوں کے منتر جاپ سے ہوا ہے۔اس لیے عورت پیدا ہی نہیں ہوئی اور اگر ہوئی تو اس کو جینے نہیں دیا گیا۔ان باتوں کا مدعا یہ ہے کہ عورت مردوں کے بنائے ہوئے مرگھٹ میں دفنائی جاتی ہے /جل جاتی ہے ۔لیکن عورت پیدا نہیں ہوتی۔ہاں ہماری عورتیں انڈیائی ہوئی ہیں اور پُرش اُمک کے ڈھمک ہیں۔

مردوں کے Obsession میں عورت کا جسم ہی سب کچھ ہے۔

لوک کلچر اور صدیوں کے محاورات میں ہی دیکھ لیجیے عورت کیسے بنائی جاتی ہے۔ شادی کے تقدس کو تھوپ کر ان کو باقاعدہ دھندہ کرنا سکھایا جاتا ہے۔ہمارا معاشرہ صدیوں سے رنڈی کا کوٹھا ہے۔ میں جانے انجانے اس کوٹھے کا دلال بن گیا ہوں۔شاید اس لیے مجھے اپنے آپ سے گھن آتی ہے۔تانیثیت کے فراڈ نے مجھے اور بھی خوف زدہ کر دیا ہے کہ میں نے اپنی بیٹیوں کو کس معاشرہ میں جنم دیا ہے۔ مجھے اس کی ماں کا اندازہ نہیں لیکن میں کفن کی بدھیا کے دریوزہ میں رو رہا ہوں۔ میں ایسے معاشرہ کا کیا کروں جہاں میری بیٹیوں کی رسالت ممکن نہیں۔یہ دنیا میری ہے نہ میری بیٹیوں کی۔مجھے اپنے پُرش ہونے اور خارش زدہ کتے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ میں بھی اپنے عضو مخصوص کو چاٹتا رہتا ہوں۔حالاں کہ عورتوں کے Obsession میں رات اور پُرش کچھ اور بھی ہیں۔اس کچھ اور کی طلب سے مردوں کو پریشانی ہے۔رہی بات بدن کی تو۔۔۔محبت میں بدن ضروری ہے، لیکن بدن۔۔۔یاسمین۔۔۔کا ہو، اور یاسمین رات کی تشکیل کرنے والے مردوں کا مقدر نہیں، یاسمین رات گئے مہکتی ہے۔۔۔اور رات کے لیے سورج کا ڈوبنا شرط نہیں۔۔۔

یہ پرولاگ بدن کلامیہ کا اسطورہ ہے۔اس اسطورہ کا مہابیانیہ شموئل احمد کے گرداب کی اینٹی اسٹوری سے لے کر محبت کی اُن کہانیوں تک میں پھیلا ہوا ہے جن میں مجنوں کا بدن خاک ہے اور لیلیٰ کا بدن بھی خاک۔لیکن خاک بدن کے احساس میں پریم پیالا کی ابدیت قائم ہے۔اس لیے زمینوں پر ریت صحرا کی کہانی لکھی گئی تھی۔اب اس کہانی میں فقط دیہہ یاترا ہے۔شاید اس لیے محبت کی بھولی بسری کہانی جب بھی جنم لیتی ہے۔۔۔پُرش اور پُرش فطرت ناری، بدن کی دنیا میں اس محبت کا ابارشن کر دیتے ہیں۔تو کیا محبت کے ابارشن میں کہانی مر گئی ہے۔شاید نہیں کہ آج بھی کوئی ساجی یا سمین کی صورت کہیں مہک جاتی ہے اور کوئی ہے جو آسمان کی فرزندی کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔لیکن یہ سب کہاں ہوتا ہے۔لوگ عشق میں لودھی گارڈین ہو جاتے ہیں، کسی عالیشان ہوٹل کا مخصوص کمرہ بن جاتے ہیں۔ یہ کمرہ کبھی 505 کی صورت میں یاد رہتا ہے تو کبھی یاد ہی نہیں رہتا۔ دراصل پُرش کی خوش گفتار آنکھوں میں اتنے کمرہ اُگ آئے ہیں کہ بدن کی تلاوت بھی فاتحہ خوانی کی رسم بن کر رہ گئی ہے۔۔۔اور بقول خدائے سخن میرؔ کہ ہوس پیر جلی بلی کی طرح ہمیں مضطرب رکھتی ہے۔

گناہ کی کتھا بھی عجیب ہے کہ یہ عورتوں کی گودوں پالی ہے۔پُرش تو مریادا پُرش اُتم ہے۔جانے کیوں کمرہ کی باہری دنیا میں اکثر کچھ نہیں بچتا۔کبھی خودکشی تو کبھی سانس لیتی ہوئی مردہ عورت۔اسی مردہ عورت کی کہانی لکھی ہے شموئل نے۔لیکن یہ مردہ عورت جینے کی خواہش میں مر جاتی ہے۔موت کے تحیر میں کیسی صبح طلوع ہوتی ہے(؟) کہیں یہ صبح کاذب تو نہیں(؟) صبح کی اس کتھا کے ورژن میں شموئل کا گرداب زندگی کی لہروں کو اُچھال کر اپنے کئی رنگوں کو پیش کرتا ہے۔گویا مردہ عورتوں کی کہانی لکھنا پُرش کے سوارتھ کا تیاگ ہو نہ ہو اس کا کنفیشن ضرور ہے۔ایسے میں ذرا سی حیرت ہوتی ہے کہ شموئل کے پُرش کو اپنے گناہوں کا احساس ہے۔اس احساس کی عزت کرتے ہوئے مجھے کہنا ہے کہ کاش ساجی کے کمار صاحب کا پنر جنم ہو جائے اور وہ اپنی ساجی کو نصیب کے سامنے کھڑا کر کے یہ کہنے کی ہمت کرے کہ یہ ہے میری محبت لیکن میں تمہارا گنہگار نہیں ہوں اور نصیب

کہے کہ ہاں مجھے تمہاری محبت قبول ہے۔لیکن ساجی کے کمار صاحب تو روایتی پُرش تھے اور اس سے کہیں زیادہ سورج دیو کے فرزند جو اپنی معاشرت کے خوف میں پورے جسم کے ساتھ پیدا ہی نہیں ہوئے۔ہاں یہ روایتی پُرش دماغ والا انسان ہے جو اپنی معاشرت کی پدریت اور معاشرتی بندھن کی اخلاقیات میں محبت کے معنی کو بستر پر پڑھتا رہتا ہے:

۔۔۔وہ تھی۔۔۔شراب تھی۔۔۔رات تھی۔۔۔اور گناہ کا حوصلہ تھا۔۔۔
شراب کے کچھ اور قطرے۔۔۔
میں نے موم بتی گل کر دی۔۔۔
رات گناہوں کو چھپا لیتی ہے۔۔۔

یہ وہی کردار ہے جو ہماری معاشرت کا مہذب شہری ہے۔اس پُرش کے بند کمرہ کی سچائیاں الگ ہیں۔شموئل نے ان سچائیوں کو کمرہ کے باہر لکھنے کی جرأت کی ہے، اور پُرش کی محبت کے ڈھونگ کو اس کے کنفیشن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شموئل نے کنفیشن کی اس کہانی میں جانے کتنی کہانیوں کو قرأت کی منطق عطا کر دی ہے۔قرأت کی اس منطق میں پہلا کلامیہ آئی کنفیس ہے اور اس کلامیہ کو دنیا کی ہر کہانی میں جگہ ملنی چاہیے۔ہاں یہ کہانی ساجی کی ہے لیکن اس میں شادی شدہ پُرش اور شادی شدہ عورت بدن کے مفرد کلمہ کی تمثیل ہیں۔ہاں عورت کا بدن خاک ہے ،لیکن پُرش کا بدن شاید وہ چاک نہیں جس کے رقص پر عورت بننا چاہتی ہے۔چاک پر ہر بار ایک ہی عورت بنائی جاتی ہے اور بنانے سے زیادہ زندہ رکھی جاتی ہے۔ عورت کو زندہ رکھنے کی خواہش میں شموئل کے کردار کی طرح پُرش ہر بار پُرش ہی رہتا ہے۔شموئل کے ہاں بھی پُرش، پُرش ہی ہے۔لیکن اس کے کنفیشن میں عورت ساجی ہے اور نصیب بھی۔عورت کا ساجی ہونا اور نصیب ہونا، شاید پھر سے مردوں کے لیے ایک عظیم اشارہ ہے کہ کیا سیتا زمین کی صبح نہیں ہے(؟) زمین کی اس صبح پر مجھے بات کرنی ہے اور یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا کی تمام کہانیاں عورتوں کے آنسوؤں سے بنی ہیں۔لیکن لکھی نہیں گئیں۔اُن میں عورت موجود نہیں۔یہ وہ آنسو ہیں جو اس نے خود نہیں روئے۔اگر یہ آنسو پُرش نے بھی بہائے ہوتے تو ساجی کیوں کہتی۔۔۔تم چاہتے ہو مر جاؤں تو مر جاؤں گی۔۔۔یا اس بیانیہ کی تو تمی ساخت میں یہ کیوں کہا جاتا کہ۔۔۔پیڑ کی پوجا ہوتی تھی۔یہی وجہ تھی کہ تیزی سے بڑھتے ہوئے اس شہر میں پیڑ ابھی بھی سلامت تھا۔۔۔اگر اس عبادت / سمرپن / تیاگ میں پدری معاشرت کی ورن مالا بھی موجود ہے تو اس ناول میں تو تم کی تخلیقی منطق، عورت کو زمین کی امانت کے طور پر پیش کرنے میں صد گونہ کامیاب ہے۔

میں نے یہاں اپنے پرولاگ میں یاسمین کی بات کیوں کہی تو عرض کر دوں کہ یہ خالص ہندی متھ ہے۔اس متھ کی کتھا یہ ہے کہ ایک دفعہ کوئی شہزادی سورج دیو کی محبت میں پڑ گئی۔لیکن دیوتا نے اس کی ہتک کی اور اس کے دل کو توڑ دیا۔جی چاہے تو یہاں آگ اور مٹی کی جبلت کے اس بیانیہ کو بھی پڑھ لیجیے۔جس میں مٹی کے حضور آگ نے سجدہ نہیں کیا تھا۔مٹی کی عظمت کو قبول نہیں کرنے کی روایت پُرانی ہے اور یہ وہ کہانی ہے جو آسمانوں میں لکھی گئی تھی۔کہیں ایسا تو نہیں سورج دیو ہی اس کہانی کے جن نایک ہوں۔شاید اس لیے اس کے بیٹے آج بھی محبت کی توہین کو اعجاز سمجھتے ہیں۔اُس وقت بھی یاسمین اس قدر مایوس ہوئی تھی کہ اس نے خودکشی کر لی تھی۔کہتے ہیں اس کے بدن کی راکھ کو زمینوں میں پھیلا دیا گیا تھا۔اُسی راکھ سے یاسمین کے خوبصورت پھولوں نے جنم لیا۔چوں کہ سورج دیو نے اس کی توہین کی تھی اور وہی اس کی موت کا ذمہ دار تھا اس لیے یاسمین صرف رات میں کھلتی ہے اور اپنی مہک سے گرد و پیش کو زندہ کر دیتی ہے۔آگ اور پھول کے اس اسطورہ میں رات اور دن کے معنوی افق سے زیادہ عورت مرد کی اسطوریت موجود ہے کہ سورج دیو کی ہتک نے عورت سے اس کی صبحیں چھین لی ہیں۔اب حضرت آدم کی راتیں اُسی دیو کی ہوس کاری کا استعارہ ہیں۔

شاید آپ کو حیرت ہو کہ یہی یاسمین محبت کے اللہ میاں۔۔۔کام دیو۔۔۔کا پھول ہے۔یہی یاسمین دنیا کی بعض ثقافتوں میں ممتا کے تخلیقی اور مقدس احساس کی علامت بھی ہے اور یہی یاسمین بعض اساطیر میں خدا کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تحفہ کس کو دیا گیا تھا(؟) کیا اُس پُرش کو جس نے رات کی تشکیل کی؟ اگر ہاں تو کیا عورت اپنے ہی بدن کی راکھ ہے۔۔۔عورت اپنی ہی موت کی خوشبو ہے۔۔۔محبت کی توہین ہے۔۔۔ان سب میں عورت کی رسالت کا اثبات کہاں ہوتا ہے(؟) کیا عورت کا اثبات ضروری ہے(؟) کیا عورت کا اثبات معاشرتی بندھن ہے جس پر مذہب کی مہر ثبت کی جاتی ہے(؟) اگر یہ سب اثبات نہیں تو کیا عورت کی آوارگی اور پُرش کی عیاشی اثبات ہے(؟) اگر یہ بھی نہیں تو عورت کی دنیا کون سی ہے(؟) کیا عورت تحفہ ہے اور اگر ہے تو کس بات کا تحفہ؟ سوال انت ہین ہیں اور عورت......؟ حضرت آدم کی راتوں کی قیدی یہ رات اتنی طویل کیوں ہے(؟) یہ رات عورت کی رات کیوں نہیں(؟) کیوں عورت کی راتوں میں صرف سجدہ ہے۔عورت داسی ہے دیوی ہے عورت کیوں نہیں(؟)

کیوں مجھے اپنی دنیا میں عورت نظر نہیں آتی(؟) ہاں استن دھاری عورتیں اپنی اپنی یُونی کی برہنہ ساعتوں میں جی رہی ہیں اور استن سے بے پروا لڑکیوں کو آنچل کے احساس میں ہی دودھ اُتر آیا ہے۔کیا یہ جبر رات کا ہے۔ عورت جانے انجانے میں اپنی گمشدگی کا ماتم کر رہی ہے۔ان روتی ہوئی عورتوں کی بولڈ مہا نگری بھی عورت جننے کی اہل نہیں۔عورت اپنے استن اور یُونی کی برہنہ ساعتوں کا بن باس کاٹ رہی ہے حالاں کہ چودہ برس بیت گئے۔رام کے آگے سیتا تھی جس کے پوتر قدموں نے کانٹے چن لیے تھے۔لیکن سیتا کے آگے کوئی رام نہیں ہے اس لیے اس کے بدن کا اپ ہرن ایک بڑی سچائی ہے۔

اس رام کتھا میں دو باتیں کھٹکتی ہیں کہ کیوں سیتا کے لیے سرکچھا ورت بنانے کی نوبت آئی اور کیوں اس کو اپنی پوترتا ثابت کرنے کے لیے اگنی پرکشا بھی دینی پڑی۔اگر وہ اپنی پوترتا ثابت نہیں کر پاتی تو کیا ہوتا اور کیا اس اگنی پرکشا کے پس پردہ پُرش کی راتیں موجود نہیں ہیں(؟) رام کتھا میں بھی سیتا زمین کی بیٹی ہی

تھی ،لیکن سورج دیو کی توہین اس کے حصہ میں آئی ۔اگر سیتا راون کے پاس اپنی مرضی سے رہ جاتی تو کیا ہوتا شاید سیتا یاسمین نہیں تھی اس لیے رام کی محبت میں جل گئی ۔لیکن اس کا جلنا عورت کی محبت اور تیاگ کی علامت شاید ہو۔حالاں کہ تیاگ سوارتھ ہین نہیں ہوتا۔اس تیاگ میں پُرش کا سوارتھ محبت کے معنی کو مکروہ اور مجہول بنادیتا ہے۔

عورت شاید اپنے بدن کے اپ ہرن میں نہیں مرتی۔ ہاں وہ اپنے احساس کی جوت میں جل جاتی ہے۔گرداب اسی عورت کا بیانیہ ہے۔اس عورت کے آگے بھی کوئی رام نہیں (؟) پُرش کے اس رامائن میں زمین ایک بار پھر اپنی بیٹی کو لیل گئی اور نصیب کی صورت یاسمین پیدا ہوئی۔دنیا کی تمام کہانیوں میں اتنی مماثلت کیوں ہے (؟) ان کہانیوں کی معاشرت ایک سی کیوں ہے (؟) کہیں ایسا تو نہیں ہماری معاشرت جس ندی کا پانی پیتی آئی ہے۔۔۔اُس میں عورتوں کے آنسوؤں کا کوئی کنڈ ہے اور اس پر سورج کا پہرہ ہے (؟)

اگر اتفاق سے مجھے اپنی دنیا میں کوئی عورت نظر بھی آتی ہے تو وہ میری آنکھوں میں سورج دیو کو دیکھ کر مر جاتی ہے اور اپنی اندام نہانی کھول کر مجھے دودھ پلاتی ہے۔جس دن یہ عورت دودھ پلانا بند کر دے گی اُس دن یہ کائنات بانجھ ہوجائے گی؟اس کائنات کی تمثیل یہ ہے کہ اب عورتوں کو اس طرح دودھ نہیں اترتے۔زمینیں بے آب ہو چکی ہیں اور یہ سب شاید سورج کے لیے نیک فال نہیں ہے۔

پھر کیوں پُرش کی صورت ہم سب بدروح ہیں جو کسی ساجی کے بدن میں ڈیرہ جمانا چاہتے ہیں۔اُس کے احساس میں پیوست کانٹوں کو چُن کر کسی نصیب کی ہتھیلی پر رکھنا کیا واقعی پُرش ہونے کے اعجاز سے دستبردار ہوجانا ہے۔یہ کس طرح کا پُرش ہے جو اتہاس میں تلوار چلاتا ہوا یہاں تک آپہنچا ہے۔کیوں ایسے پُرش نایاب ہیں جو عورت کے احساس میں پیوست کانٹوں کو چُن کر آسمان کی فرزندی کے خلاف کھڑے نظر آتے ہیں۔

کیا گرداب کی ساجی بدچلن تھی (؟) اگر ساجی بدچلن تھی تو اس کے کمار صاحب اور کمار صاحب کا معاشرہ اس بدچلن عورت کے لائق نہیں۔ساجی کی متخیلہ دنیا اس عورت کی دنیا ہے جس میں وہ خود کو محسوس کر سکتی ہے۔پتی کی بنائی ہوئی دنیا میں ساجی کہیں نہیں تھی لیکن اس کو اپنے پتی سے نفرت بھی نہیں تھی۔پتی ورتا کے اس عجیب دکھ میں۔۔۔ممنوعہ محبت۔۔۔۔کے اکھوے کا پھوٹنا بھی ایک اشارہ ہے۔لیکن کمار صاحب کے رہتے سورج دیو کے کریہہ اسطور کی ابدیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔شاید اس لیے ساجی مرگئی ۔مجھے اس کی موت نے بہت رلایا۔اپنی بہتی ہوئی آنکھوں کے سمندر سے لوٹنے کے بعد بھی شموئل کے اس کردار کی الجھن کو سمجھنا میرے لیے آسان نہیں ہے۔ہاں بدچلن کہنا بہت آسان ہے۔اس محبت کی اخلاقیات پر خطبہ دینا اس سے بھی آسان ہے۔ہاں ان کے یہ کردار Prototype نہیں لیکن ان کی زندگی کے آدرش میں ایک بڑا کلامیہ موجود ہے۔

شموئل نے بڑی کامیابی سے محبت کی اسٹوری میں اینٹی اسٹوری کی تدبیر سازی کی ہے۔رہی بات لسانی تشکیلات کی تو اس ادھیائے میں دیومالائی صورت گری،علم نجوم،مقامی زبان اور جغرافیائی حدود کی لسانی بوطیقا ان کے کہانیہ کو اپنے سوندریہ شاستر کا درپن بنانے میں کامیاب ہے ۔ ہاں کہیں کہیں پر Visualisation میں ان کا بیانیہ بھی فکشن کے روایتی مزاج کے محاورات کی تشکیل کرتا ہے۔

ان کے ہاں لسانی صورت حال کو کئی معنوں میں Morphology کے تحت رکھتے ہوئے زبان کو ایک مخصوص پیٹرن کہا جا سکتا ہے کہ اس میں لفظیات کی تدریجی حرکیات موجود ہے۔گویا کہ ان کے ہاں زبان میں حیاتیات کی مارفالوجی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے ہاں عام طور سے جس زبان میں لوگ زندگی بسر کرتے ہیں اس زبان میں لکھتے نہیں۔زبان کی اس صارفیت نے تخلیقی ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔اگر میں اپنی گنوئی بھاشا میں کہوں تو زبان کی کودا کودی نے لفظیات کی تدریجی حرکیات کو مفلوج کردیا ہے ۔اچھی بات یہ ہے کہ زبان کے Visualisation میں شموئل نے کہیں کہیں ادبھت تخلیقی سانچہ کی دریافت کی ہے تو کہیں کہیں زبان میں کرداروں کا فطری پن نظر نہیں آتا۔اس ناول کے لسانی ساختیہ اور تخلیقی رقص کو نشان زد کرنا بھی مقصود ہو تو کئی ایسی باتیں ہیں جو شموئل کے مخصوص لسانی وظائف ہیں۔مثلاً علم نجوم کے زیر اثر اپنے بیانیہ کی تشکیل میں ان کا انداز یہ ہے:

۔۔۔یہ راہو کا اثر تھا۔۔۔

۔۔۔زہرہ۔۔۔زہرہ والی عورتیں اسی طرح ہنستی ہیں۔۔۔

حالاں کہ اس کو بیانیہ میں اضافی لسانی ساختیہ کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے کہ اپنے اس انداز میں وہ کرداروں کے ساتھ Logical ہوتے نظر آتے ہیں۔اس پر مجھے ذرا سا اعتراض ہے کہ کیا اس طرح کسی کردار کے ساتھ منطقی ہونا ٹھیک ہے۔ہاں اگر اس عمل میں بیانیہ کا فطری پن مجروح نہیں ہوتا تو اس کو شموئل کے لسانی ساختیہ کا تخلیقی حصہ مانتے ہوئے ان کو اس کی داد ملنی چاہیے ۔جہاں تک اس ناول کا سوال ہے تو اس میں ابتدائیہ سے ہی راوی کا اپنا مونوٹونس بیانیہ نظر آتا ہے۔اس لیے یہ ناول بہت حد تک سوانحی کلامیہ کے زمرہ میں آجاتا ہے۔لیکن ان کا انداز مونولاگ کی مخصوص گردان سے ذرا سا آزاد بھی ہے کہ روای نے براہ راست قاری کو اپنے کلامیہ میں شریک کیا ہے اور گفتگو کرنے کے انداز میں ناول کے بیانیہ کو تشکیل دیا ہے۔ان کے اس انداز کا ایک بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں کئی کردار نظر انداز ہوگئے ہیں اور وہ محض زیب داستان کے لیے ہیں۔حالاں کہ ساجی کے پتی اور نصیب کی دنیا میں اور بہت کچھ تھا جو اس ناول میں نہیں آپایا۔دراصل یہ اس ناول کے مخصوص تکنیک کی مجبوری بھی ہے،اس لیے

زبان کی سطح پر بھی یہ بیانیہ راوی کا سوانحی کلامیہ بن کر رہ گیا ہے۔اس میں بذات خود کوئی عیب نہیں لیکن واقعات وحوادث اور کرداروں کی دنیا میں بھی راوی کی زبان موجود ہے۔کرداروں کے ٹھیٹھ پن کو راوی نے اپنی زبان میں بیان کر کے ناول کی تخلیقی دنیا کو سوانحی دنیا میں بدل دیا ہے ۔ اس سوانحی اظہار میں شاید کرداروں کا فطری پن بہت زیادہ موجود نہیں۔اس کے باوجود یہ ناول اپنے بہاؤ میں قرأت کی منطق کو مجروح نہیں کرتا۔

ان باتوں کے بعد ایک سوال اور قائم ہوتا ہے کہ ساجی کے کردار میں باغی عورت کیوں نظر نہیں آتی (؟) دراصل ساجی جیسی عورتیں جس زمین پر ننگے پاؤں چلتی ہیں وہاں کانٹے ان کے اپنے بدن میں ہوتے ہیں۔ان کانٹوں کی نمائش کیے بغیر یہ عورتیں زخمی ہوتی رہتی ہیں اور زمینوں کی طرح دکھ اٹھاتی ہیں اور کسی دن چپکے سے اپنے ہی اندر سو جاتی ہیں۔

شموئل کے بیانیہ میں عورت جاگ رہی ہے اور اپنے آنسو خود رو رہی ہے۔یہ وہ آنسو ہیں جو زندگی کے تمام نشیب وفراز میں بہتے ہیں۔لیکن یہ اسلوب زیست تو نہیں ہے۔شاید اس لیے اس ناول کی پڑھنت کے بعد پُرش کو کہنا چاہیے آئی کنفیس آئی کنفیس......ان باتوں کے احساس میں کنفیشن کا مطلب یہ بھی ہے کہ عورت کو اس کے اپنے احساس کے ساتھ جینے کے لیے کسی مہابیانیہ اور مقدس کتاب کی ضرورت نہیں۔

اگر میں ان باتوں کے اظہاریہ میں کسی معاشرت کی شریعت کا منکر نظر آتا ہوں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ۔ مجھے جنت اور جہنم کے معنی یہی سمجھ آتے ہیں کہ عورتوں کو اس کی اپنی دنیا بنانے کے لیے کسی پُرش سے اجازت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں اپنے اس سوارتھ کے اظہار میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ اگر عورت کی کوئی رات ہے صبح ہے تو ان میں پُرش کو بھی جگہ ملے۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ گرداب کا بیانیہ مردوں کے سوانگ کا بیانیہ ہے ۔ بستر پر پڑی عورت کا زندہ ہونا ان کو پسند ہے ۔لیکن اس عورت کا ضرورت سے زیادہ زندہ ہونا ان کو بالکل پسند نہیں۔شموئل احمد نے گرداب میں اسی کہانی کے کچھ ادھیائے لکھے ہیں۔اس کہانی کا اعادہ یہاں غیر ضروری تھا ۔اس لیے میں کہانی کے کنفلکٹ کی روشنی میں اس کا غیر تنقیدی دیباچہ لکھنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی مجھے تنقید سے کراہیت کا احساس ہوتا ہے۔اس غیر تنقیدی دیباچہ کا پہلا لفظ یہ مضمون ہے اور اگر منٹو کے لفظوں میں کہوں تو۔۔۔پیش لفظ یہ ہے کہ عورت خود قصہ آدم کا پیش لفظ ہے۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ قصہ آدم سے اس کا پیش لفظ غائب ہے۔ غائب ان معنوں میں کہ اس کے پورے جسم کی کتھا لکھی نہیں گئی۔اس لیے میں یہاں پورے جسم کے احساس میں لکھے گئے اس ناول کے رچنا کار کے پیش لفظ یعنی ساجی کو اپنے اندر جگہ دینا چاہتا ہوں اور اس دن کے انتظار میں ہوں جب میں اس کو آئی کنفیس نہیں کہوں گا۔کیا یہ دن کبھی طلوع ہوگا(؟)

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

(بجلی والوں کے نام)

بجلی والو! تھکا دیا تم نے
سب کو پاگل بنا دیا تم نے

بجلی آئے بغیر چلتا ہے
کیسا میٹر لگا دیا تم نے

رشوتیں ہیں، کبھی ڈیٹیکشن ہے
زخم کیسا نیا دیا تم نے

بلبلائے گا کیوں نہیں صارف!
بل ہی ایسا تھما دیا تم نے

بجلی آئے گی، بجلی جائے گی
یہ ترانہ سکھا دیا تم نے

بڑھ گئے ہیں ہزار اخراجات
ایسا چکر چلا دیا تم نے

پہلے سوتے تھے سب مزے لے کر
اب تو سونا بھلا دیا تم نے

کاروبار حیات ٹھنڈا ہے
رونقوں کو مٹا دیا تم نے

شہر راتوں کو جاگتے تھے جو
اُن کو بالکل سُلا دیا تم نے

ظلمتوں کا اسیر کر ڈالا
روشنی کو بھلا دیا تم نے

پھر بھی ہنستی ہے قوم کیا کیجیے!
کتنا بے حِس بنا دیا تم نے

کوئی دن زندگانی اور ہے

غالب عرفان
(کراچی)

آج جب میں تشنہ بریلوی صاحب کے متعلق کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو ان سے دوستی کا عرصہ جو تقریباً بارہ سال پر محیط ہے، سمٹ کر ایک لمحۂ ماضی میں مرتکز ہوتا معلوم دیتا ہے۔ مجھے اب بھی یہ محسوس ہورہا ہے کہ ان کا فون آنے والا ہے اور میں ان سے شکایت کرنے کو بیتاب ہوں کہ اتنے دنوں کہاں رہے؟

ان کے ساتھ بتائے ہوئے لمحات اور ان سے طویل گفتگو کی ساعتیں ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے سے گزر رہی ہیں لیکن کیا کیا جائے، موت تو ہر ذی روح کا مقدر ہے:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ان سے رابطے کی ابتداء آج سے تقریباً بارہ سال قبل Sunday Dawn کے اس میگزین کے سبب ہوئی جب اس کے Books & authors کے ایک صفحہ میں شائع شدہ میرا خط Feed back کے طور پر جگہ پا گیا وہ مختصر سا خط انہوں نے دلچسپی سے پڑھا جس میں دو ہفتے قبل کے اسی صفحہ پر ایک صحافی خاتون کی غلطی کی میں نے نشاندہی کی تھی کہ محترمہ نے حیدرآباد دکن کے والیٔ ریاست میر عثمان علی خان کے بڑے بیٹے معظم جاہ (جو شاعر بھی تھے) کے دیوان پر مختصر سا مضمون لکھا تھا مگر معظم جاہ شجیع کو غلطی سے (شاہ جی) لکھ کر دیوانِ شاہ جی کے نام سے اسے شائع کروادیا تھا۔ میری نشاندہی پر اخبار نے میرا مضمون من وعن شائع کردیا۔ اگلے ہفتہ عوامی ادبی انجمن PMA کے دفتر کی ادبی نشست میں مجھے دیکھ کر وہ خود ہی میرے قریب آئے، مجھ سے مصافحہ کیا اور میری ادبی معلومات پر مجھے مبارکباد دی۔

وہ دن اور پھر ان کی موت کا دن، یہ رابطہ رفتہ رفتہ فون کی دوستی اور پھر ذاتی دوستی میں تبدیل ہوگیا۔ جمعہ کے دن ہی ان کا انتقال ہوا تھا اس روز بھی معمول کے مطابق میں نماز کی ادائیگی سے تین بجے تک گھر واپس نہ لوٹا تھا کہ انہوں نے فون کیا۔ بیگم نے میری غیر موجودگی کی اطلاع دے دی تھی پھر میرے گھر پہنچنے پر مجھے بھی مطلع کردیا کہ تشنہ صاحب کا فون آیا تھا۔ مگر میں نے حسبِ معمول کھانے کی میز کا رخ کیا۔ ذہن سے بات بالکل نکل گئی اور میں لیٹ گیا۔ آنکھ لگ گئی اور نہ جانے کب تک سوتا رہا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے بیدار کیا۔ مجی نجیب کا فون تھا جنہوں نے مطلع کیا تھا کہ آغا خان ہسپتال میں ابھی وہ انتقال فرما چکے ہیں دراصل مجھے فون کرنے کے بعد ہی ان کو سانس میں دقت کے سبب گھر والوں نے ہسپتال میں داخل کروادیا تھا۔ وہ Ventilator پر زیادہ دیر تک سانس نہ لے سکے تھے۔ اس طرح پلک جھپکتے ہی ایک خوش مزاج ہنستا بولتا ہوا چہرہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔ اب میں اپنی بھول پر شرمندہ ہوں تو کس کے سامنے کہ انہوں نے موت سے پہلے آخری فون کیوں کیا تھا؟

تشنہ صاحب آپ تو اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اب اس انجمن کی کمی کو کون پُورا کرے گا آپ کی معلومات، آپ کی بذلہ سنجی، آپ کی حاضر جوابی جو صرف ٹیلی فون کی ایک گھنٹی کی محتاج ہوتی تھی اب کہاں سے لاؤں۔ مجھے یاد ہے کہ ٹریفک حادثے کا شکار ہونے سے پہلے میں راستہ کی کٹھنائیوں (ان کے گھر کی طرف جاتی ہوئی سڑک ان دنوں مرمت کے لیے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی) میں موٹر سائیکل سے سفر کرتے ہوئے آپ کی عیادت کو آپ کے فلیٹ پر پہنچا تو مرحومہ بھابی جان نے میرے اس اندازِ عیادت پر کیا کہا تھا۔ کیا یاد کروں؟ کیا بھول جاؤں؟ حالاتِ حاضرہ پر ان سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔ آپ کی کمی اب کون پورے کرے گا۔

بمبئی کی فلمی دنیا کی باتیں (آپ کے وہاں قیام کے دوران) سن کر آپ کی معلومات پر تبصرہ کرسکے گا۔ آپ تو عروض کے ماہر تھے ہی کبھی کبھی میرے کسی مصرعے پر ایک آدھ رکن کی کمی بیشی رہ جاتی تو میں آپ سے ہی رجوع کرلیتا تھا۔ اب میرا ایسا شبہ کون رفع کرے گا۔

یہ اور ایسے کئی سوالات ذہن میں کلبلا رہے ہیں لیکن ان سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ آپ نے میری غزلوں سے متاثر ہو کر مجھ پر دو مضامین لکھے تھے۔ لیکن میرے علم میں لائے بغیر جن میں سے پہلا مضمون انگریزی میں تھا جس کا عنوان Glamour & Glory تقریباً دس سال قبل ہفتہ وار Mag میں پورے صفحہ پر میری رنگین تصویر کے ساتھ شائع ہوا تھا جبکہ اس کے دو سال بعد اردو میں بھی مجھ پر بعنوان ''غالب عرفان کا رنگِ غزل'' لکھ کر ''قرطاس'' گوجرانوالہ کے کئی صفحات پر شائع کروایا تھا۔ چونکہ یہ خطوط اور مضامین آپ کی بے لوث محبت کے مظاہر ہیں لہٰذا میں آپ کے خلوص کا معترف ہوں۔ اب بھی دوپہر کو جب میں لیٹتا ہوں تو لاشعوری طور پر آپ کی ٹیلی فون کال کا منتظر رہتا ہوں۔ گفتگو کے دوران ہمارے درمیان مختلف موضوعات زیرِ بحث آجاتے ہیں جن میں ٹیلیویژن کے مختلف چینلز پر نشر کیے گئے مذاکروں کے علاوہ خصوصی طور پر ڈاکٹر شاہد مسعود کے تبصرے گفتگو کا عنوان بن جاتے پھر بھی کبھی کبھی ایسا موقع آجاتا جب میرے لہجے میں تلخی آجاتی تو کبھی دیر تک سلسلہ منقطع رہتا پھر جلد ہی رابطہ بحال ہوجاتا بلکہ پہل ہمیشہ آپ ہی کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر درمیان کا رابطہ معطل رہا تو ایک شب میٹر وون کے بزم شاعری میں مَیں مہمان تھا اور آنجہانی اندر کمار گجرال کا ذکر اپنی شاعری پر ان کی پسندیدگی کے حوالے سے کررہا تھا۔ وہ اس محفل میں LIVE کال ربن کر آگئے اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر انہوں نے پڑھا:

عرفاؔن کے شیدائی تو ہیں حضرتِ گجرال
قطعہ جو پڑھا آپ کا تھا وجد میں پنڈال
یہ معجزۂ فن یہ ہُنر شیشہ گری کا
ہر شعر میں ہے رقصِ آتشِ سیّال

باقی صفحہ ۱۰۸ پر ملاحظہ کیجیے

متاعِ کوثر و زمزم

کرامت بخاری

(لاہور)

آج دل نے چاہا کہ انبالے کے محمد اختر کو یاد کیا جائے جسے دنیا ساغر صدیقی کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ انبالہ شہر کے محلّہ کنگھی گراں کا یہ خاندان درمیانے درجے کا خوشحال خاندان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ساغر صدیقی کے اپنے خاندان کے لوگوں سے حالات کشیدہ ہو گئے۔ کیونکہ ساغر صدیقی نے تعلیم کی طرف توجہ نہ دی۔ مشاعرے اور سگریٹ نوشی اور آزادروی اپنالی۔ وہ 1928ء میں پیدا ہوئے اور جب پاکستان بنا اگست 1947ء تب ان کی عمر 19 سال تھی۔ شروع شروع میں نعت لکھی اور پڑھی، انتہائی خوش الحان اور خوش گلو تھے۔ اپنے کلام اور ترنم کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ مشاعروں سے اچھا معاوضہ ملنے لگ گیا۔ تنہا پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر پاکستان کا ترانہ لکھا جس کے بول تھے: ''سلام اے قائد اعظم تری عظمت ہے پائندہ'' اسے خود گایا اور اکثر فلموں کے شروع میں یا آخر میں یہ ترانہ چلا کرتا تھا جس سے ان کا نام پاکستان بھر کے ادیبوں شاعروں میں مشہور ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ساغر صدیقی نے فلموں کے گیت لکھے۔ اگرچہ 1944ء کے امرتسر کے طرحی مشاعروں اور دیگر مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے 15 سال کی عمر میں وہ باقاعدہ شاعر بن چکے تھے۔ مگر ان کی شاعری کا عروج 1950ء سے 1960ء کا زمانہ ہے۔ 1955ء اور 1956ء میں انہوں نے بہت اچھی شاعری کی اور فلمی گیت لکھے جن میں زبیدہ خانم کا گایا ہوا گیت بہت مشہور ہوا۔ ''اے چاندان سے جا کر میرا اسلام کہنا میرا اسلام کہنا'' ایک اور گیت جسے زبیدہ خانم نے ہی گایا فلم سرفروش کا گیت جو غالباً احمد شجاع پاشا نے بنائی بہت مشہور ہوا ''میرا نشانہ، دیکھے زمانہ، تیر پہ تیر چلاؤں، ہاتھ کسی کے نہ آؤں۔''

ایک غزل ''چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے'' بہت مشہور ہوئی۔

انہوں نے 1948ء سے 1952ء تک بعض اخبارات اور رسائل میں بھی کام کیا لیکن 1960ء کے بعد وہ ایک درویش اور مجذوب کی شکل میں گوالمنڈی بسا پان والا کے پاس کسی تھڑے پر، کسی فٹ پاتھ پر یا گندی جگہوں پر کالی چادر لپیٹے، چرس، نشے والے انجکشن، دیسی شراب اور سگریٹوں کا دھواں اڑاتے ہوئے موت کے سفر پر چل پڑے۔ کئی لوگوں نے اس سے چار آنے، آٹھ آنے، ایک روپیہ کے عوض غزلیں لکھوائیں۔ فلمسازوں نے گیت لکھوائے مگر ساغر کو سہارا دینے سے گریز کرتے رہے۔ اس کی حساس اور خوددار طبیعت نے گورنمنٹ یا کسی شخص کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہ دی۔ یہ انہی دنوں کے شعر ہیں:

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

یا

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

ساغر صدیقی چونکہ انبالہ سے تھے، اس لیے میں نے کوشش کی کہ ان کے دوستوں اور جاننے والوں سے بھی دریافت کیا جائے۔ لہٰذا حسن عسکری کاظمی، چونکہ انبالہ سے اور ان کے محلّہ سے ہیں اور ملتان میں اقبال ارشد انبالہ سے ہیں اور ان کے دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اس مضمون کے مندرجات میں مدد دی اور کئی نئی باتوں کا پتا چلا۔ ساغر صدیقی اگر اپنے آپ کو سنبھال لیتا تو آج بھی اس کا تھا اور کل بھی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

ساغر آج بھی روحِ سخن کے طور پر ہم سے ہم کلام رہتا ہے۔ اسی لیے میں نے اسے توانا آواز کہا ہے۔ اس وقت کے شاعروں نے اسے درویش شاعر کہا اور یہ بھی لکھا کہ صبر و رضا درویشوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے جس پر ساغر صدیقی نے کہا کہ:

توہین ہے درویش کا اس شہر میں جینا
ہو فاقہ کشی نام جہاں صبر و رضا کا
کچھ سرد سی آہیں ہیں تو کچھ ڈوبتے آنسو
ساغر یہ صلا تجھ کو ملا سوزِ نوا کا

ساغر نے موت کا انتظار شروع کر دیا اور موت کے سائے بڑھتے چلے گئے۔ اگرچہ وہ 30 سال کا جوان رعنا تھا اور یہ وہ عمر ہوتی ہے جو آرزوؤں، اُمنگوں، اُمیدوں، ارمانوں اور خوابوں کے خمار میں گزرتی ہے۔ مگر ساغر صدیقی جوانی میں ہی بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ نحیف، کمزور، گال پچکے ہوئے، آنکھیں خالی خالی اور پریشان بال وہ بھی مٹی اور میل سے بھرے ہوئے۔ انہی دنوں کی شاعری کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں جس میں معاشرے کی بے حسی، زندگی کی تلخیاں اور حالات کی تاریکیاں نظر آتی ہیں:

اتنی دقیق شے کوئی کیسے سمجھ سکے
یزداں کے واقعات سے گھبرا کے پی گیا
تلخیاں بڑھ گئیں جب زیست کے پیمانے میں
گھول کر درد کے ماروں نے پیا عید کا چاند
میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں
تجھ کو ملے ہیں قریۂ مہتاب میں گڑھے
مجھ کو تو پتھروں میں بھی رعنائیاں ملیں

ڈاکٹر بلیغ الدین جاوید نے دیوانِ ساغر کے دیباچہ دوئم میں ساغر کی منگنی یا نسبت ٹوٹنے اور اُس کی ہونے والی بیوی کی کسی اور جگہ یعنی سرگودھا اور پھر حافظ آباد میں شادی کا بھی ذکر کیا ہے۔ محبت میں ناکامی اور پسند کی شادی نہ ہونے کے صدمات بھی یقیناً ایک حساس ذہن و دل رکھنے والے شخص کو متاثر کرتے ہیں۔

وہ چونکہ اوائل عمری اور جوانی کی منزلیں طے کر رہے تھے جہاں جذبات کی حکومت ہوتی ہے۔ اس محرومی نے بھی ساغر کو اُداس اور ویران کر دیا۔

میرا یہ مضمون ہر گز ہر گز تنقیدی تاثر نہیں بلکہ سوانحی سفر اور حقائق نگاری کے ذیل میں آئے گا۔ ساغر صدیقی کے فن تخلیق کے بارے صرف اتنا کہوں گا کہ جن زمینوں، بحروں، ردیفوں اور ہیئت کو ساغر نے اختیار کیا ہے وہ اساتذہ فن کے ہاں مقبول و محبوب ٹھہریں۔ ادق ہونے کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع کے ذیل میں آتی ہیں۔ ساغر صدیقی، قدیم و جدید کا حسین امتزاج بھی ہے اور روایت کا امین بھی۔ ترقی پسندی بلکہ حقیقت پسندی کا مبلغ بھی لیکن الحاد سے دور عقیدت اور تصوف کا شارح بھی ہے۔ وہ باوجود تکلیف دہ زندگی اور تباہ کن حالات کے اُمید اور آس کا نمائندہ بھی ہے۔

شکست بازیِ دوراں سے ایک جرعہ ملے
چلو کہ بازیٔ دوراں کو آج مات کریں

ساغر صدیقی نے قصیدہ، مثنوی یا مرثیہ نہیں لکھا لیکن باقی تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ساغر صدیقی نے نعت، نظم، غزل، ترانے، حمد، منقبت، گیت سب کچھ لکھا۔ مگر اُس کا خاص میدان غزل ہے۔ شگفتگی آئی ہوئی اچھی لگتی ہے لائی ہوئی نہیں۔ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی سطحوں اور تخلیقی کروٹوں کا اندازہ اس کی فکر کی گہرائی اور زبان پر قدرت سے لگایا جاتا ہے۔ زبان ڈھلی ہوئی، رواں، عام فہم اور روزمرہ سے مزین ہو تو تخلیق کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ ساغر صدیقی کے ریزہ ہائے جواہر حالات کی نذر ہو گئے، تلف ہو گئے، بہت سا کلام ضائع ہو گیا یا کسی اور کے نام سے چھپ گیا۔ مگر جتنا موجود ہے وہ اس کی عظمت فن کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔

یہ کناروں پہ کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو
اللہ رے اُس چشم عنایات کا جادو
تا عمر رہا حسن ملاقات کا جادو
ہم ساحر اقلیم سخن بن گئے ساغر
اِس ڈھب سے جگایا ہے خیالات کا جادو

دنیا میں محسود ہونا سرمایہ ناز و فخر رہا ہے۔ مگر حاسد ہونے سے اللہ بچائے۔ ارباب کمال ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہیں۔ ساغر صدیقی کو بھی حاسد ملے جب وہ فلم کی طرف آئے تو سنا ہے کہ قتیل شفائی صاحب سے اختلاف ہوا اور محسود ہوئے۔ دیگر فلمی شاعروں نے بھی اسے شراب، نشہ اور چرس کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جو کہ بالآخر ساغر صدیقی کو موت کی وادیوں میں لے گئی۔ زیادہ واقعات درج کروں تو دفتر ہو جائے گا۔ لہٰذا اختصار سے بیان کرتا جا رہا ہوں۔ ساغر سربستہ رازوں کا ایک بستہ تھا جسے کسی نے نہیں کھولا۔ اُس نے کہا:

آبِ انگور سے وضو کر لو
دوستو! بیعتِ سبو کر لو
گُر سکھا دیں گے بادشاہی کے
ہم فقیروں سے دوستی کر لو

آخر کار جنوری 1974ء میں فالج کا حملہ ہوا اور چند ماہ بیمار رہنے کے بعد 19۔ جولائی 1974ء کو غم و آلام زمانہ سے چھٹکارہ حاصل کیا۔ میانی صاحب لاہور میں دفن ہوئے۔ کل 46 برس زندہ رہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ غزل ہمارے ادب کا طرۂ امتیاز اور اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ اور غزل میں محبت کا مضمون اتنا اہم ہے جتنا کسی انسان کے لیے ''ہوا'' یا پانی ضروری ہے۔ لہٰذا ساغر کو اس بات کا اندازہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

متاعِ کوثر و زمزم کے پیمانے تری آنکھیں
فرشتوں کو بنا دیتی ہیں دیوانے تری آنکھیں
جہانِ رنگ و بو اُلجھا ہوا ہے ان کے ڈوروں میں
لگی ہیں کاکل تقدیر سلجھانے تری آنکھیں

ساغر صدیقی نے غم و آلام کے ہجوم میں بھی جذبوں کی فصل بوئی۔ اپنی شاعری میں آگ اور پانی کو اکٹھا کیا اور چونکہ محبت فتح نہیں مفتوح ہونا پسند کرتی ہے۔ لہٰذا سخن گوئی کی محبت نے اُسے آخری سانس تک اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ وہ غم آئندگاں و رفتگاں ساتھ لے کے چلے اور شعوری سطح پر پوری دیانتداری سے فن کی آبیاری کی۔ جس کی قدر اور اعتراف حسب روایت ان کے مرنے کے بعد ہوا۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہم مرنے والے کی قبر کی مجاوری بہت اچھی کرتے ہیں۔ ان کے کلام چھاپنے اور کتابوں سے بہت لوگوں نے کمایا اور کما رہے ہیں۔ مگر ساغر صدیقی کو زندگی میں (چار) 4 آنے مانگتے رہنے پر مجبور رکھا۔ تفو اے زمانے! آخر میں دعا کہ اے تصویر حسرت و یاس اے شاعر احساس اے دنیا کے ستائے ہوئے درویش! تمہاری قبر منور ہو اور روح آسودہ ہو، میرے یہ حروف سپاس قبول کیجیے۔

- بقیہ -

کوئی دن زندگانی اور ہے

پھر ظاہر ہے کہ ان سے رابطہ بحال ہو جاتا تھا ان کی گفتگو میں ان کا تجربہ، ان کا مشاہدہ اور بالخصوص ان کا بے تکلف لہجہ بولتا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے عمر میں تقریباً دس سال بڑے تھے لیکن ہمیشہ غالب صاحب کے لاحقے سے مجھے مخاطب کرتے رہے۔ میں یہاں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ تنہائی کا شکار تھے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ اکثر کہا کرتے ''غالب صاحب ایسی باتیں اس شہر میں میں اور کس سے کر سکتا ہوں۔'' اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ آمین

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

زندہ مرحومینِ ادب

ڈاکٹر رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

ادب ہی کیا فنونِ لطیفہ کی کسی بھی شاخ کا فن کار صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ اپنے فن سے جڑا رہتا ہے۔ جہاں اس نے اپنے فن کو خیر باد کہہ دیا اسی تاریخ سے وہ بھلا دیا جانے لگتا ہے۔ رقاص کے پاؤں تھرکنے سے معذور ہوں تو اس کے حق میں پردہ گر جاتا ہے۔ مجسمہ ساز اور معمار کے ہاتھوں میں رعشہ آجائے تو تعمیر و تشکیل اس کو ہاتھ جوڑ کر سلام کر بیٹھتی ہے۔ مصور بجائے خود جب تصویر ہو کر رہ جاتا ہے تو اسی کا کینوس اس کو آئینہ دکھانے لگتا ہے اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔ اگر صاحبِ ساز بے سُرا ہو جائے تو موسیقی کی دیوی اس سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ اسی طرح لفظ و معنی سے رشتہ توڑ کر شاعر کہیں کا نہیں رہ جاتا۔ ایسا ہر فن کار جیتے جی مر جاتا ہے۔ البتہ جس کا مطالعہ اور شعر گوئی کی صلاحیت سلامت ہے، وہ کبھی نہیں مر سکتا۔

فی الحال ہم شعر و ادب کے حوالے سے کچھ ایسے قلم کاروں کا احوال بیان کرنے کی جسارت کر رہے ہیں جو بہ ظاہر سانس تو لے رہے ہیں مگر ادبی طور پر زندہ نہیں رہ گئے ہیں۔ احمد فراز خود بھی جیتے جی مر چکے تھے۔ اپنی پرانی غزلوں کو بھناتے encash کرتے ہوئے دن کاٹ رہے تھے۔ افتخار عارف بھی مرکزِ ادب سے دور ’’وظیفہ حسنِ شعریت‘‘ سے علاحدہ ہو کر مؤظف retired زندگی گزار رہے ہیں۔ ساقی فاروقی ’’پیاس کا صحرا‘‘ سے گزر کر ’’زندہ پانی‘‘ کی تلاش میں نکلے تو تھے ان کے ساتھ کتوں، بلیوں، سوروں، مینڈکوں کا قافلہ بھی ہے۔ اب وہ یہ سوچتے ہوئے دن کاٹ رہے ہیں کہ مینڈک میں ’’ن‘‘ لکھا جائے کہ نہ لکھا جائے۔ راولپنڈی سے گلزار جاوید ’’چہارسوٗ‘‘ کے گوشے نکالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ’’اچھا صاحب گوشہ ابھی حیات ہیں‘‘ جیسے ڈاکٹر منیب الرحمٰن، مرتضیٰ برلاس وغیرہ وغیرہ۔ بمبئی کے صابر دت اپنے رسالے ’’فن اور شخصیت‘‘ کے تحت کسی نہ کسی فن کار کا ضخیم نمبر نکالا کرتے تھے اور یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جس کسی کا نمبر نکلا چند ہی دنوں میں وہ پیارا فنکار اللہ کو پیارا ہو جاتا تھا۔ جیسے جاں نثار اختر، کرشن چندر، مہندر ناتھ، وغیرہ۔ وہ جب کسی سے کہتے کہ میں آپ کا ’’فن اور شخصیت نمبر‘‘ نکالنا چاہتا ہوں تو وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گزارش کرتا کہ مجھے تو بخشو اور کچھ دن جی لینے دو۔ قلم کاروں نے یوں حوصلہ شکنی کی تو صابر دت نے بڑا ضخیم ’’غزل نمبر‘‘ شائع کر ڈالا اور غزل کی سخت جانی کی وجہ سے روایت ٹوٹی۔ پھر یوں ہوا کہ غزل تو جی اٹھی مگر صابر دت ہی دنیا سے اٹھ گئے۔

دہلی میں شجاع خاور DIG تھے پھر پتہ نہیں کیا سوجھی کہ پولیس کی اچھی بھلی نوکری کو لات مار کر سیاست میں ہاتھ جوڑنے چلے گئے وہ بھی بی جے پی میں۔ نوکری تو گئی ہی تھی شاعری کے ساتھ عزت سادات بھی گئی۔ کوئی سیاسی فائدہ بھلا میاں بھائی کو کیا حاصل ہو پاتا۔ ذہنی تناؤ کا شکار اور مفلوج ہو کر بستر کے حوالے ہو گئے۔ یوں جیتے جی مر گئے۔ اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لیے دہلی کی محفلوں میں آخری وقتوں میں آنے لگے تھے۔ ایک آدھ انعام سے بھی اردو والوں نے نوازا تاہم جی نہیں سکے۔ آخر کار آسودۂ خاک ہو ہی گئے۔ اب ’’ادب ساز‘‘ کا نمبر نکال کر نصرت ظہیر ادبی نقشے میں خاور شناسی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

کچھ شاعر کڑک ہو چکے ہیں اور جیتے جی منظر نامے سے ہٹ گئے ہیں۔ بعض شاعر کڑک ہونے کے باوجود محض اپنی چالاکی سے اپنی پرانی تخلیقات نئے رسائل میں بار بار چھپواتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے نئی نسل انھیں جانتی نہیں اور قدیم اربابِ ذوق انھیں اچھی طرح پہچانتے ہیں چنانچہ دونوں طرف سے سرد مہری کا اظہار ہوتا ہے۔

حیدرآباد کے ایک ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کے بت پرست باپ کے نام پر اپنا تخلص اختیار کیا۔ وہ پکے دہریے ہیں۔ کوئی انھیں السلام علیکم کہے تو جواباً ’’آداب عرض‘‘ کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم انھیں سلام میں آداب عرض ہی کہا کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کے تقریباً تمام ترقی پسند و غیر ترقی پسند شاعر گزر گئے۔ ہر چند کہ یہ ابھی زندہ ہی شمار ہوتے ہیں مگر ادبی گوشہ نشینی اختیار کی ہوئی ہے۔ کسی جلسہ و مشاعرہ میں شرکت اس شرط پر کرتے ہیں کہ ان کی بار برداری کے لیے کوئی ’’اہل کار‘‘ آگے بڑھنے پر ’’کاربند‘‘ ہو۔ آپ اسے ناز برداری بھی کہہ سکتے ہیں۔ بڑی اونچائی پر رہتے ہیں اور اس بلندی سے دیگر ادیبوں شاعروں کو دیکھتے ہیں تو سب انہیں بونے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑی مشکل سے کسی کو مان کر دیتے ہیں۔ ہمیں ماننے پر اس لیے مجبور ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں بھی قلم ہے اور اس پر زنگ نہیں چڑھا ہے۔ موصوف کے دولت خانے میں باضابطہ ایک ’’بار‘‘ BAR بنا ہوا ہے۔ موصوف لباس سفید اور شراب سرخ پسند فرماتے ہیں، کمیونسٹ جو ٹھہرے۔ اس دور کے اکثر شاعر، ان کے ہاں ’’زیر بار‘‘ ہونے آیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک شاعر جن کا جام و مینا سے کبھی گہرا ربط تھا موصوف کے بار سے بھی کبھی کبھی استفادہ کیا کرتے تھے۔ ہر چند کہ وہ ’’جام سفالی‘‘ ہی یعنی ’’دیسی و خانہ ساز‘‘ میں زیادہ یقین رکھتے تھے جو ان کی اوقات کے مطابق تھا۔ ہم سے ایک بار مذکورہ خوش حال سفید پوش موصوف فون پر کہنے لگے ’’یار اس شاعر نے تو نہ صرف ڈاڑھی چھوڑ دی، شراب بھی چھوڑ دی اب ان سے ملاقات کی کوئی صورت ہی نہیں رہ گئی‘‘۔ ہم نے ان سے کہا ’’شاعر مذکور کو یہ سب چھوڑنے کے علاوہ شاعری چھوڑ دینی چاہیے تھی کیوں کہ وہ جس طرح کی شاعری کبھی کبھی کر لیتے ہیں وہ ان کی ترقیِ معکوس کا نمونہ ہوا کرتی ہے‘‘ ہمارے جواب پر وہ بہت دیر تک قہقہہ لگاتے رہے۔ تائب شاعر کے

بارے اخبار میں خبر آئی تھی کہ انھوں نے اپنی نواسی کی فرمائش پر روزانہ چالیس چالیس غزلیں کہی ہیں اور یہ بھی کہ عشاء کے وضو سے نمازِ فجر ادا کرنے کے دوران چالیس غزلیں آسانی سے کہہ لیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ عشاء سے صبح کاذب تک چالیس دن چلتا رہا۔ ایک ایک رات میں چالیس چالیس غزلیں کہیں گے تو غزلوں پر کیا گزرے گی۔ خود ان پر جو گزری سو گزری۔ سنا ہے اس عرصہء خود فراموشی میں لوگ ان سے ملنے میں احتیاط برت رہے تھے۔ یہ تو خیر سخت جان ثابت ہوئے مگر یہ ''چہل غزلے'' بھی انھیں روشناس خلق کروانے میں ناکام رہے۔ یہ شاعر صاحب بھی خود کو بڑی بلندی hilltop پر شمار کرتے ہیں اور گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ یہاں ہم دروغ بر گردنِ راوی بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ خود ان کا تحریری بیان ہے کہ ساری دنیا میں ان کے ہزاروں شاگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ بقول مضطر مجاز ان کے شاگردوں پر سورج غروب نہیں ہوتا۔ سنا ہے چالیس دن تک روزانہ چالیس چالیس غزلیں جو کہی گئی تھیں وہ کتابی صورت میں آ گئی ہیں مگر ان کی رسم رونمائی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ یہ بھی اخبار میں اطلاع تھی کہ اس کارنامے کا اندراج وہ ورلڈ گنز بک میں چاہتے تھے ان کی یہ آخری خواہش رد ہو گئی۔ ایک دعوتِ ولیمہ میں ایک ہی میز پر ان کے ساتھ ''ہم طعامی'' کا شرف حاصل ہوا۔ ہمیں نہ بی پی ہے نہ شکر۔ ہم میٹھا بڑے شوق سے کھا رہے تھے۔ میٹھے کی طرف ان کو بھی توجہ دلائی۔ کہنے لگے ''میٹھا کھاؤں گا تو تہجد کے لیے اٹھ نہ سکوں گا۔'' اربابِ میز نے میٹھے سے ہاتھ روکے بغیر ہم سے کہا ''یار جانے بھی دو اصرار نہ کرو کیوں کہ ان کو میٹھا کھلانا اپنی عاقبت خراب کر لینا ہے۔ ایسے روگردانِ شیرین و مریضانِ شکر کی عنایت ہی سے ہم جیسے شیریں سخنوں کو میٹھے سے انصاف کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ الحمدللہ''۔ شاعر موصوف اپنی زندگی کا یوں ثبوت دیتے ہیں کہ ہر مرنے والے ادیب و شاعر کے بارے میں تعزیاتی بیان جاری کرتے ہوئے مرحوم کو اپنا دوست یا شاگرد بتاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مرحوم تردیدی بیان دینے سے تو رہا۔ کوئی ناوقف اگر ایک سے دو دفعہ ملتا یا فون کر لیتا ہے تو اسے بھی اپنے شاگردوں میں اس وقت تک شمار کرنے لگتے ہیں تاوقتیکہ وہ غیر پارلیمانی زبان میں تردید نہ کرے۔

ایک اور شاعر ادبی خلش رکھتے ہیں۔ طرحی و غیر طرحی مشاعروں میں اسی وقت شریک ہوتے ہیں جب شریکِ حیات سے اجازت ملتی ہے۔ رات دیر گئے تک انھیں گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لیے جوں توں اپنی غزل نمٹا کر چل پڑتے ہیں۔ دوسروں کی غزلیں سننے میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ گھریلو پابندیاں ان کے اندر کے شاعر کو باہر آنے نہیں دیتیں۔ جب تک وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب میں تھے وہاں شعری ماحول کی برکت سے کچھ کہہ بھی لیا کرتے تھے۔ جب سے صحرائے عرب سے لوٹے ہیں مزاجاً صحرائی ہونے کے باوجود دیوار و در میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے ایک لڑکے نے انھیں ویب سائٹ پر زندہ رکھنے کے جتن کیے ہوئے ہیں۔ تاہم چالیس پچاس سال پہلے کہی ہوئی نظموں غزلوں پر مشتمل ویب سائٹ سے نئی نسل استفادہ کرنے پر آمادہ نہیں لگتی۔ یوں یہ ہم عصروں سے تو برسوں پہلے بچھڑ چکے تھے آج کی نسل اور نئے منظر نامے سے بھی دور ہیں۔ شہر میں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ ایسی دعوت میں دکھائی دیتے ہیں جہاں وہ غالباً مع محل مدعو کیے گئے ہوتے ہیں۔ شاعر موصوف سیکل، موٹر سیکل، کار چلانا نہیں جانتے اسی لیے صرف ردیف کی صورت دکھائی دیتے ہیں۔

ایک اور شاعر جدیدیت میں حد سے تجاوز کر گئے تھے چنانچہ ان کے گردوں پر اتنا بار پڑا کہ وہ ہفتے میں دو بار ڈیلائسس کرواتے ہیں۔ کسی زمانے میں وہ بس کنڈکٹر تھے اب بے بس ہیں۔ بس کنڈکٹری کے دور میں مذکورہ تہجد گزار شاعر کے ہم راہ دیسی خانہ ساز قسم کی گھٹیا شراب کو منہ لگایا کرتے تھے مگر اب ماشاء اللہ توبہ تلہ کر کے مسجد میں چاروقت کی نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ پنجگانہ کا ذکر ہم نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ ادبی طور پر بھی وہ ڈیلائسس پر ہیں۔ لوکل مشاعروں کی صدارت کے لیے کبھی کبھی تبرکاً انھیں مدعو کیا جاتا ہے جس سے ان کی پژمردہ رگیں آسودہ ہو جاتی ہیں۔

روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن سے وابستہ ایک اور شاعر تھے ہماری مراد ہے ہیں جو کبھی شہر میں کسی بھی موڑ پر ہونے والے مشاعرے میں اپنے دیگر شاعر دوستوں کے ساتھ سائیکلوں پر پہنچ جاتے تھے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب سائیکل ہی بہت بڑی عیاشی سمجھی جاتی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہم خود سائیکل پر ہی دفتر جایا کرتے تھے۔ دفتر سے ایوننگ کالج جا کر رات دس گیارہ بجے گھر پہنچا کرتے تھے۔ ایسے سائیکل نواز شاعروں سے مشاعروں میں رونق رہتی تھی۔

رات دیر گئے سائیکلوں پر لوٹنے والے شاعروں پر آوارہ کتے بھونکتے تھے۔ دور دراز مقام پر ایک مشاعرہ پڑھ کر دو شاعر اپنی اپنی سائیکلوں پر نکلے۔ ایک شاعر نے دوسرے سے پوچھا ''آپ کہاں رہتے ہیں؟'' اس نے جواب دیا ''میں چار مینار کے قریب مغل پورہ میں رہتا ہوں'' اور پوچھا ''آپ کا دولت خانہ؟'' دوسرے شاعر نے کہا ''میں آپ سے مزید چار کتے دور یعنے محلّہ شاہ علی بنڈہ میں رہتا ہوں'' ایسے تمام سائکل پسند شاعر گھٹنوں کے درد میں مبتلا گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔

سائیکل گروپ کے ایک اور شاعر بہ ظاہر حیات ہی ہیں۔ کبھی ادبی گگن پر ''پونم'' کا چاند ہوا کرتے تھے۔ اب اماوس کی رات کی طرح شب باشی میں مگن ہیں اور سنا ہے نہ صرف کسی مسجد کے متولی ہو گئے ہیں بلکہ دینی مدرسہ بھی چلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اب اردو دینی مدرسوں کی مرہونِ منت ہو کر رہ گئی ہے۔ شاید وہ اپنی بقا کی خاطر دینی مدرسوں کے بچوں میں اردو کا ادبی ذوق پیدا کر رہے ہیں۔ کبھی حیدر آباد میں بھی نہ ہونے کی طرح ہوتے تھے اب تو حیدر آباد سے کوسوں دور گوشہ نشینی میں اللہ اللہ کر رہے ہیں۔

دل یہ کہتا ہے محبت ہو گی
عقل کہتی ہے کہ دھوکا ہو گا

ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ شاعر و ادیب جب تک عہدے پر ہوتا ہے اس کی جھوٹی تعریفیں کر کر کے اس سے پروگرام وصول کرنے والے اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ جو حسین لکھنے والیوں پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتا ہے۔ وہ جیسے ہی ''وظیفہء حسن خدمت'' سے علاحدہ ہو جاتا ہے خوشامدی منہ پھیر لیتے ہیں۔ یہی حال مدیر کا ہے کہ جب تک اس کا رسالہ نکلتا رہتا ہے سب اس کی تعریفوں کے پل باندھا کرتے ہیں تا کہ ان کی تخلیقات اس کے رسالے میں بار پا سکیں۔ رسالہ بند ہوا تو یہ سلسلہ بھی بند ہو جاتا ہے اور وہ مدیر بھی گوشہ نشین ''عابد'' ہو جاتا ہے یعنی ''کتاب'' بند تو قلم بھی بند اور کتاب خواں بھی بند۔ کچھ ایسے شاعر بھی ہیں جن کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ اب وہ یا تو کوئی پرچہ نکالتے ہیں یا پھر کسی روزنامے کے ادبی صفحے کو مرتب کرتے ہیں۔ یوں ادبی منظر نامے سے وابستگی کا سامان ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی قابلِ ذکر شاعر کی رگِ ظرافت بلکہ رگِ شرارت پھڑکی تو حیدر آباد کے ادیبوں شاعروں کے خلاف ایک طنزیہ مثنوی ''ابرِ شرر بار'' شرر شعلہ پوری کے نام سے لکھ ڈالی، بہ صرفِ زرِ کثیر چھپوائی اور سب اہداف کے گھروں پر ڈاک سے بھیجی۔ اتنی محنت وہ کوئی ادبی کارنامہ انجام دینے میں کرتے تو ادبی طور پر زندگی کا ثبوت دیتے۔ جی نہیں بھرا تو فتنہ فساد آبادی کے نام سے اس مثنوی میں حذف و اضافہ کر کے دوبارہ چھپوایا۔ بدنام بھی ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

ہم سے خواتین کو یہ شکایت ہے کہ ہم اکثر مرد شاعروں کے بارے ہی میں مضامین لکھتے ہیں۔ عورتوں کو منہ نہیں لگاتے۔ /وہ غالباً محاورتاً کہہ رہی ہیں/۔ سو ہم نے سوچا کہ چلو آج ان کی شکایت بھی دور کر دیتے ہیں۔ عقلِ کل کا دعوا کرنے والے ہی جیتے جی مر رہے ہیں تو یہ تو ناقص العقل کہلاتی ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مریں۔ ہم خواتین کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں حسبِ حال ہوا کرتی ہیں۔ البتہ شاعری ان کے بس کا روگ نہیں۔ ہند و پاک میں کہیں کی بھی شاعرہ ہو پروین شاکر کے اثر سے نکل نہیں پاتی ہے۔ کچھ شاعرات کو سنتے ہوئے تو لگتا ہے ''کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں''۔ مشاعروں کی شاعرات کا ذکر تو ہم کرنا ہی نہیں چاہتے۔

نثر لکھنے والی خواتین تحقیق و تنقید کے از کار رفتہ معاملات یا رثائی ادب میں پناہ لے کر زندہ رہیں جب تک وہ درس و تدریس سے وابستہ رہیں۔ وظیفہء حسنِ خدمت پر علاحدہ ہو کر بے نام و نشان ہو گئیں ہر چند کہ یم دوت کی رسائی سے ابھی بچی ہوئی ہیں۔

ایک نو بہارِ ناز کے بارے میں ایک شاعر صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ حقیقتاً انہیں کی آوردہ ہیں اس کے پیچھے وہی کارفرما ہیں۔ جب تک وہ متمول شاعرہ ان صاحب کو پالتی رہی موصوف خاموش رہے۔ ان کا آزوقہ یا دستِ غیب بند ہو گیا تو منہ کھولنے لگے۔ برسوں نمک کھایا تو شاعر موصوف کو اپنی زبان بند ہی رکھنی چاہیے تھی۔

حیدر آباد کے ایک افسانہ نگار بے چارے ابھی حیات ہیں مگر ماہ نامہ شاعر نے ایک شمارے میں مرحوم افسانہ نگاروں کی تصاویر شائع کرتے ہوئے ان کی تصویر بھی لگا دی۔ انہیں پتا چلا تو مدیرِ شاعر کو اپنا صداقت نامہء حیات بھیج دیا جو ہر سال کے اختتام پر پینشن آفس میں داخل کیا جاتا ہے۔ مگر ادبی دنیا کو پھر بھی انھیں زندہ ماننے میں تامل ہے۔

اردو ادب میں بھی وظیفے کی روایت یوں زندہ ہے کہ ایک حنفی شاعر اپنی چالیس پچاس سال پہلے کہی ہوئی غزلیں مختلف رسائل میں بار بار چھپنے کے لیے بھیجا کرتے ہیں۔ گویا اپنے ہی فکر و فن کا وظیفہ وصول کر رہے ہیں۔ انھیں شاید پتا نہیں قاری بھی تو وظیفہ خوار و وظیفہ شناس ہو سکتا ہے۔ اپنے طالب علمانہ دور کی غیر مطبوعہ غزلیں بھی وہ دھڑا دھڑ چھپوانے لگے۔ جب وہ ڈاکٹر ہو کر سکول کی جگہ یونیورسٹی کے چیر پرسن ہو گئے تو مدیرانِ کرام کو ڈگریوں اور عہدوں سے مرعوب کرتے ہوئے خود کو پیش کیا۔ تدریسی دور کی غزلیں ''توظیفی دور'' میں یعنے وظیفہ یابی میں چھپوانے لگے ہیں۔ مدیروں کے ہاں تخلیقات کمپیوٹرائز computrised تھوڑی ہوتی ہیں کہ بٹن دبا کر پتا چلایا جائے کہ ان کی غزل اس سے پہلے کب اور کہاں چھپ چکی ہے۔ یہ کام مدیران کرام اب بھی نہیں کرتے کہ انھیں اپنے رسائل کا پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے سو معروف نام کی وہ پذیرائی کرتے ہیں۔

حیدر آباد کے ایک شاعر ہیں جنہیں ''زلیخائی'' ہونا چاہیے تھا ''اعظمی'' ہو گئے حالانکہ ان کا اعظم گڑھ سے کوئی تعلق نہیں ہے شاید انہیں اعظمیوں سے عقیدت ہے جیسے شبلی۔ شبلی بھی ''سیرۃ النعمان'' لکھنے کے بعد نعمانی ہو گئے تھے۔ شبلی چاہتے تو ایک تابعی سے نسبت کی جگہ ایک ایسے صحابی سے بھی رشتہ جوڑ سکتے تھے جو عشرۂ مبشرہ میں بھی شامل ہے۔ یعنی انہوں نے ''الفاروق'' بھی تو لکھی تھی۔ آسانی سے فاروقی ہو جاتے۔ مگر شاید انہوں نے انکسار سے کام لیا نسبتِ تابعی پر قناعت کر لی۔ مگر یہ حیدر آبادی شاعر کا اعظمی ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ شعر و ادب سے کنارہ کش ہو گئے ہیں مگر اقبالیات سے متعلق کچھ نکتے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو سروں پر سے گزر جاتے ہیں Bouncers ہوتے ہیں۔

فارسی کے مشہور شاعر مولانا عبدالرحمٰن ایک گاؤں ''جام'' کے رہنے والے تھے اسی نسبت سے وہ خود کو جامی لکھا کرتے تھے مگر اردو کے جامیوں نے آخر کیا سوچ کر جامی ہونا پسند فرمایا اگر یہ جام و مینا سے نسبت کی وجہ سے ہے تو پھر توبہ توبہ!!!

اگر کسی ایسے قلم کار کا ذکر اس مضمون میں آنے سے رہ گیا جو زندہ ہوتے ہوئے بھی مرحومانہ زندگی گزار رہا ہو تو کوئی ہمیں اس کے ہونے کی اطلاع دے کر اپنی زندگی کا ثبوت دے تا کہ اس سے بھی انصاف کیا جا سکے۔ آخر ہمارا موضوع ہی یہی ہے۔

رازِ ذوقِ حیات

آپا جمیلہ شبنم
(اسلام آباد)

(۱) **لوگ** ناخوش کیوں رہتے ہیں۔

میرے خیال میں اگر لوگوں کو خوش رہنے کا سلیقہ آجائے تو بہت کم لوگ ارادتاً ناخوش رہنا چاہیں گے۔

(۲) محبت کی پہلی قدر یہ ہے کہ یہ مسرت کا سرچشمہ ہے اگرچہ یہ قدر عظیم ترین نہیں ہے مگر باقی اقدار کے لیے لازم ہے۔

''اے محبت وہ لوگ تمہیں کتنا دکھ دیتے ہیں جو کہتے ہیں کہ تیری شیرینی تلخ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرا ثمر اتنا شیریں کہ دنیا کی کوئی اور شے اتنی شیریں نہیں ہو سکتی۔''

محبت کی دوسری قدر یہ ہے کہ ہماری بہترین مسرتوں کو وسعت بخشتی ہے۔ جیسے موسیقی کا لطف، کوہساروں میں طلوعِ آفتاب کا منظر اور سطحِ سمندر پر ماہِ کامل کی بکھری ہوئی چاندنی کا سماں۔ محبت ہماری انا کے خول کو توڑ دیتی ہے۔

محبت ایک دائمی آگ ہے جو سدا جلتی رہتی ہے، محبت کبھی سرد نہیں ہوتی، محبت کبھی بیمار نہیں پڑتی، محبت کبھی منہ نہیں موڑتی، محبت کبھی نہیں مرتی۔

(۳) مسابقت کو مرکزِ حیات مان لینا اتنا ہیبت ناک، اتنا سخت گیر، اتنا اعصابی تناؤ والا اور اتنا کڑا ارادہ ہوتا ہے کہ اسے ایک یا دو نسلوں سے زیادہ مقصدِ حیات کے طور پر اپنایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ زندگی کے ایک متوازن تصورِ حیات میں ایک معقول اور پُرسکون مسرت کو اس کا ایک حصہ تسلیم کر لیا جائے۔

(۴) اُکتاہٹ اور ہیجان۔۔۔کم و بیش یکسانیت کی زندگی گزارنے کی صلاحیت بچپن میں ہی پیدا کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں آج کل کے والدین قصور وار ہیں۔ وہ بچوں کو کہیں زیادہ مجہول (Passive) تفریحات مہیا کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ بچے کے لیے یکسانیت کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے۔ بچے کی زندگی میں ایسی تفریحات کم ہونی چاہئیں جو ہیجان تو پیدا کر دیتی ہیں لیکن جسمانی عمل کی شمولیت کا موقع نہیں دیتیں۔

بچے کی بہترین نشو و نما یہ ہے کہ اسے ننھے پودے کی طرح اپنی ہی زمین میں آرام سے رہنے دیا جائے تاکہ بڑے ہو کر مفید یکسانیت کو برداشت کر سکیں۔ ایک مسرت بھری زندگی بہت حد تک پُرسکون زندگی ہونی چاہیے۔ کیونکہ پُرسکون ماحول اور خاموش فضا میں ہی سچی خوشی زندہ رہ سکتی ہے۔

(۵) تھکن (Fatigue)

تھکن کی کئی اقسام ہیں۔ اُن میں سے بعض تو مسرت کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوتی ہیں۔ محض جسمانی تھکن اگر ایک حد سے بڑھے تو خوشی کے حصول کا باعث بنتی ہے۔ اس سے خوب بھوک لگتی ہے، گہری نیند آتی ہے اور تعطیلات میں آنے والے ممکنہ مزے بھی دو چند ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ حد سے بڑھے تو گھمبیر برائی بن جاتی ہے۔

آج کی دنیا میں اعصابی تھکن سے بچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ بدنی تھکن کی مانند محض ذہنی تھکن بھی اپنا علاج نیند میں ڈھونڈتی ہے۔ ایک شخص جو بہت زیادہ حساب کتاب یعنی ذہنی کام کرتا ہے جن میں جذبات شامل نہیں ہوتے دن کے اختتام پر دن بھر کی تھکن کو سو کر دُور کر دیتا ہے۔ جذباتی تھکن میں یہ خرابی ہے کہ ہمارے آرام میں مخل ہوتی ہے۔ اعصابی شکستگی جو بظاہر کام کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے حقیقت میں وہ کسی ذہنی اُلجھن کا باعث ہے۔

(۶) حسد

ناخوشی کے قومی اسباب میں پریشانی کے بعد غالباً حسد اہم سبب ہے۔ ایک سال کی عمر سے پہلے ہی بچے میں اسے نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر معلم کو چاہیے کہ وہ لطیف ترین اور نرمی کے احساس کے ساتھ اس سے نمٹے۔ کسی ایک بچے کی قیمت پر دوسرے بچے کے ساتھ حمایت کا ہلکا سا شائبہ بھی نظروں میں آ جائے تو باعثِ رنج بن جاتا ہے۔ جنہیں بچوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے ان کے لیے از حد ضروری ہے کہ وہ سب کے ساتھ بے لاگ، یکساں اور مکمل طور پر انصاف کریں۔

بڑے لوگون کی نسبت بچے حسد کا اظہار کرنے میں زیادہ بے باک ہوتے ہیں۔ عام معزز خواتین میں حسد کا جذبہ غیر معمولی طور پر پایا جاتا ہے۔ مرد حضرات بھی اس صورتِ حال سے مبّرا نہیں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عورتیں باقی تمام عورتوں کو اپنا رقیب سمجھتی ہیں جب کہ مرد صرف ان مردوں کو رقیب جانتے ہیں جو ان کے ہم پیشہ ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے انسانی فطرت میں اس کی تلافی کرنے والا جذبہ بھی موجود ہے۔ یہ تعریف و تحسین کا جذبہ ہے۔ جو کوئی بھی انسانی مسرت میں اضافہ کرنے کا خواہاں ہے اُسے چاہیے کہ وہ حسد کو گھٹائے اور قدر و ستائش بڑھانے کا خواہش مند ہو۔ اس سب کا علاج ذہنی تہذیب (Mental Discipline) ہے یعنی بے تکی باتوں کو ذہن میں نہ لایا جائے۔ آخر کار مسرت سے بڑھ کر قابلِ رشک اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

(۷) احساسِ گناہ۔۔۔(The Sense of Sin)

ارتکاب گناہ کے دو قسم کی تکلیف دہ احساسات میں سے ایک گناہ گار پر غالب آتا ہے۔ ان میں سے ایک ندامت ہے جو بے فائدہ ہے۔ اور دوسرا پچھتاوہ جس سے گناہ دھل جاتا ہے۔ عقل کا کام جذبات کی تخلیق کرنا نہیں ہے البتہ اس کے عمل کا ایک حصہ یہ ضرور ہے کہ وہ ان جذبات کو روکے جو بہتری کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ شدید جذباتی محبت، ولدینی شفقت، خیر خواہی اور علم و فن سے لگن میں کوئی ایسی بات نہیں جیسے عقل ختم کرنا چاہتی ہو۔ ایک معقول شخص جب کوئی ایسا جذبہ یا تمام جذبے محسوس کرتا ہے تو اسے ایسے جذبات سے خوشی ہوتی

ہے۔وہ ایسے جذبات ختم کرنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ جذبات اچھی زندگی کا حصہ ہیں ایسی اچھی زندگی تو اس کی اپنی اور دوسروں کی زندگی میں خوشی پیدا کرتی ہے۔

(۸) خبطِ ایذا رسانی

ہم سب اس قسم کے شخص مرد ہو یا عورت سے واقف ہیں جو بقول اُس کے ہمیشہ ہی دوسروں کی ناشکر گزاری، بے مروّتی، اور زیادتیوں کا شکار رہا ہو۔اس قسم کے لوگ بظاہر غیر معمولی طور پر معقول لگتے ہیں اور ان لوگوں کی ہمدردیاں جیتنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو اُنہیں اچھی طرح نہیں جانتے۔ایسے معاشرے میں بقول اُس شخص کے ہر کوئی اذیت دینے پر تُلا ہوا ہے تو قیاس غالب یہ ہے کہ اس کا سبب خود اس کی اپنی ذات میں موجود ہے۔ جہاں دیدہ لوگ ان کہانیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔اس تکلیف سے نمٹنا فی الواقع بہت مشکل کام ہے کیونکہ ہمدردی یا عدم ہمدردی دونوں صورتوں میں بھڑک اُٹھتی ہے۔خبطِ ایذا کا مارا ہوا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کی بد نصیبی پر یقین کیا جا رہا ہے تو بات کو زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگتا ہے۔اس کے برعکس جب اس کی بات پر یقین نہ کیا جائے تو اسے اپنی طرف دنیا کی سنگدلی کی ایک اور مثال اس کے ہاتھ آ جاتی ہے اس بیماری کا علاج صرف سمجھ بوجھ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔کسی شخص کو بھی خامیوں سے پاک ہونے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔اور نہ ہی اس حقیقت سے غیر ضروری طور پر خود پریشان رہنا چاہیے۔اگر ان چار اُصولوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو خبطِ ایذا رسانی کا بہت حد تک تدارک ہو جاتا ہے۔

اوّل اصول: یاد رکھیے آپ کے مقاصد اتنے انسان دوستی پر مبنی نہیں ہوتے جتنا آپ سمجھتے ہیں:

اصول دوئم: دوسروں سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ آپ کی ذات میں اتنی دلچسپی لیں جتنی کہ آپ خود اپنی ذات میں لیتے ہیں۔

اصول سوئم: اپنی صلاحیتوں کا حقیقت سے زیادہ اندازہ نہ لگائیں۔

اصول چہارم: یہ وہم نہ کریں کہ اکثر لوگ آپ کے متعلق اس حوالے سے سوچتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ کو ایذا پہنچائیں۔

رائے عامہ کا خوف۔ آج لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں یہ گروہ مختلف نظریات، اخلاقیات رکھتے ہیں۔رائے عامہ ہمیشہ ان لوگوں پر زیادہ ظلم کرتی ہے جو اس سے ڈرتی ہے بہ نسبت ان کے جو اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ایک کتا ان لوگوں پر زیادہ بلند آواز سے بھونکے اور کاٹے گا جو اس سے ڈریں گے بہ نسبت ان کے جو اسے حقارت سے دیکھ کر گزر جائیں گے۔انسانی ہجوم کا رویہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔اصولی طور پر رائے عامہ کو اتنی اہمیت دینی چاہیے کہ جس قدر فاقہ کشی یا جیل جانے سے بچنے کی ضرورت ہو اس سے زیادہ اطاعت شعاری غیر ضروری ظلم تسلیم کرنا ہے۔رائے عامہ کا خوف نشو و نما مسخ کر دیتا ہے۔اس قسم کے خوف کی موجودگی میں کسی قسم کی عظمت کا حصول دشوار ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں روح کو وہ آزادی نصیب نہیں ہوتی جس میں سچی مسرت مضمر ہوتی ہے۔ سچی خوشی کے لیے لازم ہے کہ ہمارے جینے کا انداز گھرے جذبوں سے پھوٹے نہ کہ اُن کے حادثاتی ذوق اور خواہشات پر مبنی ہو جو اتفاق سے ہمارے رشتہ دار یا پڑوسی ہیں۔اس برائی کا علاج صرف یہ ہے کہ لوگوں میں رواداری، برداشت اور تحمل کو عام کیا جائے۔

خوشی کے اسباب

(۱) ذوق وشوق(Zest)

(۲) محبت(Affection)

(۳) خاندان(The Family)

(۴) کام(Work)

(۵) غیر ذاتی دلچسپیاں(Impersonal interset)

سچی بات تو یہ ہے کہ مرد اور عورت کی عظمت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں میں وہ فرق جو روایات نے نقش کر دیا ہے باطل ہے۔مرد اور عورت دونوں کی زندگی میں خوشی اور خیر و خوبی کا راز ذوقِ حیات ہے۔

محبت: بہترین قسم کی محبت باہمی حیات افزا ہوتی ہے۔ہر ایک خوشی سے محبت حاصل کرتا ہے اور بے ساختہ محبت دیتا ہے اور ایسی باہمی محبت کے نتیجے میں زندگی زیادہ خوشگوار اور دلچسپ محسوس کرتا ہے۔ سچی خوشی صرف اس محبت سے ملتی ہے جس میں دونوں کی ایک دوسرے میں مخلصانہ دلچسپی ہو۔کوئی بھی دوسرے کو محض اپنی بھلائی کا ذریعہ نہ سمجھے بلکہ دونوں ایک مشترکہ بھلائی کے لیے دل سے خواہاں ہوں۔

- بقیہ -

خدا دیکھتا ہے، مگر دیر سے

مجھے معاف کر دو'' یہ کہہ کر وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔جب ایوانووچ نے اسکی بلند سسکیاں سنیں تو وہ خود بھی رونے لگا اور کہنے لگا'' سیمانووچ، جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا اور خدا بھی تمہیں معاف کرے'' یہ کہتے ہوئے اسے اچانک ایسا لگا جیسے اسکا دل ہلکا ہو گیا ہو، اسکے دل سے غبار صاف ہو گیا۔اس کو ایک اندرونی سکون کا احساس ہوا جیسے عمر بھر کی بے چینی کو قرار آ گیا ہو۔اس کو رہا ہونے کی، اپنے گھر جانے کی، کسی سے بدلہ لینے کی کوئی خواہش نہیں رہی، بس ایک ہی خواہش کہ اسکا انجام بھی پرسکون ہو۔اس کے باوجود کہ اس نے سیمانووچ کو اعتراف جرم سے منع کیا تھا، اس نے حکام کے سامنے اعتراف کیا کہ قتل اس نے کیا تھا۔مگر جب حکام رہائی کا پروانہ لیکر اس کے کمرے میں پہنچے تو ایوانووچ نہ صرف اس قید سے آزاد ہو گیا تھا بلکہ وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا کی قید سے بھی آزاد ہو گیا تھا جہاں اس نے ایک تکلیف دہ زندگی گذاری تھی۔اب اسکے چہرے پر ایک ابدی سکون طاری تھا۔

ایک صدی کا قصّہ
بلراج ساہنی

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

بمبئی کی فلم انڈسٹری کو جتنے بھی بے مثال اداکار ملے ہیں وہ لاہور، پشاور یا راولپنڈی کی زرخیز زمین کی پیداوار رہے ہیں۔ دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند اپنے دور کے تین سپر اسٹار جن کا تعلق پشاور یا راولپنڈی سے تھا۔ ایک اور لاجواب اداکار جو راولپنڈی کی مردم خیز مٹی کی خمیر سے اُٹھا ہے۔ جسکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بطور اداکار وہ جتنا بے مثال اور لاجواب تھے، اُس سے کہیں زیادہ عظیم وہ بحیثیت انسان تھے۔ اس عظیم اور نسطعلیق اداکار کا نام بلراج ساہنی تھا۔

بلراج ساہنی جن کا اصلی نام یدھشٹر ساہنی تھا، یکم مئی 1913 کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اُنہوں نے راولپنڈی میں ہی پوری کی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے لاہور یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور انگریزی لٹریچر میں اپنی ماسٹرس ڈگری پوری کی۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ واپس راولپنڈی چلے آئے جہاں اُنہوں نے اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ اُنہوں نے کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی لکھائی بھی جاری رکھی۔ اُنہوں نے ہندی میں بچلرس ڈگری حاصل کی اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ماسٹرس کیا۔ سن 1930 میں گھر والوں نے اُنکی شادی دم ینتی نام کی ایک لڑکی سے کر دی۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر کلکتہ کے لئے نکل پڑے جہاں وہ رابندر ناتھ ٹیگور کی وشیو بھارتی یونیورسٹی (شانتی نکیتن) میں بطور معلم مقرر ہوئے اور اُنہیں انگریزی اور ہندی پڑھانے کا موقع مل گیا۔ یہ سن 1936 کا دور تھا جب اُنہوں نے پہلی کہانی ''شہزادوں کی ڈرنک'' لکھی جسے خوب سراہا گیا۔ اُنکی دھرم پتنی بھی پڑھائی میں پیچھے رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ بھی اُنکی دیکھ ریکھ میں ہندی میں اپنی بچلرس ڈگری پوری کر رہی تھی۔ اسی بیچ 1938 مالک نے اُنہیں پہلی اولاد سے نوازا۔ اُنکے یہاں پہلا بیٹا ہوا جس کا نام اجے رکھا گیا۔

بلراج ساہنی نے سیمابی طبیعت پائی تھی۔ وہ ایک جگہ ٹھہر نہیں پا رہے تھے۔ یہ سن 1938 کی بات ہے کہ وہ اپنی بیوی بچے کو کلکتہ میں چھوڑ کر مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کرنے کے لئے گجرات پہونچ گئے۔ وہ ایک سال تک باپو کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ایک سال کے بعد اُنہیں بی بی سی لندن کی ہندی سروس میں اناؤنسر کی نوکری مل گئی۔ باپو سے آشیر واد لے کر وہ انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے۔ چار پانچ سال تک اُنہوں نے بی بی سی میں نوکری کر لی۔ 1943 میں وہ واپس وطن لوٹے۔ مارکس ازم کا فلسفہ پوری شدت سے پھیلتا جا رہا تھا۔ بلراج ساہنی بھی اس فلسفے سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے مارکسی نقطہ نظر کو اپنا کر کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ سیاسی دشت خارزار میں پاؤں رکھتے ہی اُنکے راستے تنگ ہونے لگے۔ دو وقت کی روٹی کمانا مشکل ہو گیا۔ گھر کی معاشی حالت کو سنبھالنے کے لئے اُنکی دھرم پتنی کو نوکری کرنی پڑی۔

بلراج ساہنی کو بچپن سے ہی ایکٹنگ کرنے کو شوق تھا۔ اُنکی یہ دیرینہ حسرت تب پوری ہوئی جب وہ کے۔ اے۔ عباس کے رابطے میں آ گئے۔ عباس صاحب (انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسیشن) اپٹا کے سرگرم رکن تھے۔ وہ بھی مارکسی نظریات کے حامل تھے۔ عباس صاحب کے علاوہ پرتھوی راج کپور، چیتن آنند وغیرہ اپٹا کے ساتھ وابستہ تھے۔ بلراج ساہنی ہندی اور انگریزی زبان پر اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اداکاری کے ساتھ ساتھ اپنے قلم کی جولانیاں دکھانی بھی شروع کیں۔ وہ باقاعدہ مضامین اور ڈرامے لکھنے لگے تھے۔ اُنہوں نے اپٹا کے لئے ایک ڈرامہ لکھا جس کا نام ''زبیدہ'' تھا۔ اسی دوراں اُنہیں 1946 کی ایک فلم میں پہلا بریک ملا۔ اس فلم کا نام ''انصاف'' تھا۔ حالانکہ اسمیں اُن کا رول بہت چھوٹا تھا مگر اُنہیں یہ تسکین ضرور ملی تھی کہ وہ فلموں میں بھی کام کر سکتے ہیں۔ وہ اور اُنکی اہلیہ تھیٹر کے ساتھ کئی برسوں تک جڑے رہے۔ بلراج ساہنی سے کہیں زیادہ اُنکی اہلیہ نے ڈراموں کے زریعے نام کمایا تھا، اسی سال عباس صاحب کو بنگال کے سیلاب کی تباہ کاریوں پر ایک فلم بنانے کو کہا گیا جس کا نام ''دھرتی کے لال'' تھا۔ عباس صاحب نے بلراج ساہنی کو اس فلم میں ایک کلیدی رول کے لئے کاسٹ کیا۔ یہ فلم بھی 1946 میں ہی ریلیز ہوئی۔ اسی سال اُنکی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام تھے ''دور چلیں'' اور ''بدنامی''۔ چار فلمیں ریلیز ہونے کے باوجود بلراج ساہنی کو کوئی پہچان نہ ملی۔ اُنکا شمار جونیئر آرٹسٹوں میں ہی ہونے لگا۔

وہ چھوٹے موٹے رول ادا کر کے اپنا گھر چلاتے رہے۔ ساتھ ہی وہ تھیٹر سے بھی وابستہ رہے۔ تھیٹر میں کام کرتے کرتے چیتن آنند کے ساتھ اُنکی گہری دوستی ہو گئی۔ چیتن آنند بھی جدو جہد ہی کر رہے تھے حالانکہ اُنکے چھوٹے بھائی دیو آنند فلمی اُفق پر دھیرے دھیرے اُبھرتے جا رہے تھے۔ بلراج ساہنی نے 1947 میں ایک فلم کی جس کا نام ''گڑیا'' تھا۔ اس فلم کی ہیروئن اُنکی دھرم پتنی دمنیتی تھی۔ یہ فلم کب آئی، کب چلی گئی لوگوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ یہ فلم بلراج ساہنی کے لئے فقط دو وقت کی روٹی پیدا کرنے کا زریعہ بنی رہی۔ اسی سال اُن کی زندگی میں ایک دلدوز حادثہ پیش آیا۔ اُنکی بیوی بہت ہی کم عمری میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ ایسا گہرا صدمہ تھا جس نے بلراج ساہنی کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا۔ ایک طرف وہ معاشی بدحالی سے جوجھ رہے تھے تو دوسری طرف ہم سفر نے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ معصوم بچوں کی پرورش کرے یا گھر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کام کرے، یہ فیصلہ کرنا اُنکے لئے مشکل ہو پا رہا تھا۔ دو سال بعد اُنہوں نے اپنی ایک خالہ زاد بہن سنتوش چنڈھوک سے شادی کی جو کہ خود ایک بہت بڑی رائٹر تھیں۔

بلراج ساہنی دن رات اپنا پسینہ بہاتے رہے۔ فلمیں ملیں، کام کیا مگر

ان فلموں سے اُنہیں کوئی تسکین نہ ملی۔شہرت کی دیوی جیسے اُن سے روٹھی ہوئی تھیں۔اُنہیں صیح پہچان نہیں مل پارہی تھی۔اُنکے اندر بے پناہ صلاحیتیں چھپی تھیں مگر کوئی اُنہیں اپنی صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ کرنیکا موقع فراہم نہیں کر رہا تھا۔چیتن آنند کے توسط سے وہ دیوآنند اور گورودت کے ساتھ بھی دوستانہ مراسم قائم کر چکے تھے۔بیکاری کے دنوں ہی اُنہوں نے ایک فلم اسکرپٹ لکھا جس کا نام ''بازی'' تھا۔اس اسکرپٹ پر گورودت نے فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔

چیتن آنند کے آفس میں ''بازی'' کی کہانی پر بحث ہوتی رہتی تھی۔بلراج ساہنی کے پاس اُن دنوں اپنی کوئی سواری نہیں تھی اسلئے وہ اکثر بمبئی کی بی۔ایس۔ٹی بسوں میں سفر کرتے تھے۔وہ ایک ایسی بس میں زیادہ سفر کرنا پسند کرتے تھے جس کے کنڈکٹر کا نام بدرودین تھا۔وہ بڑا مزاحیہ آدمی تھا۔جب بھی بس میں بیٹھو وہ کچھ نہ کچھ اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔اُسکی ان حرکتوں سے مسافر محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ایک دن بلراج ساہنی نے بدرودین کو الگ لے جا کر پوچھا۔''کیوں بھائی ایکٹنگ کرنے کا شوق ہے کیا؟'' بدرو میاں پہلے کچھ جھینپے پھر اثبات میں سر ہلایا۔بلراج ساہنی نے بدردین سے وعدہ کیا کہ وہ اُسے کسی بڑے پرڈیوسر سے ملوادیں گے

مہینوں بیت گئے بلراج ساہنی اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔جب بھی وہ ماہم سے گزرتے تو بدرو سے ملنا نہیں بھولتے۔بدرو اُن کو اُن کا دیا ہوا وعدہ یاد دلاتے تھے۔بلراج ساہنی شرمندگی محسوس کرتے تھے۔اصل میں اُن کی کہانی ''بازی'' میں ایک شرابی کا کردار تھا جو وہ بدرو کو دلانا چاہتے تھے پر کیسے۔ایک دن بیٹھے بیٹھے اُنہیں ایک ترکیب سوجھی۔بدرودین شرابی کی اداکاری اتنی عمدگی سے کرتا تھا کہ جو بھی اُسے شرابی کی طرح جھومتے ہوئے دیکھتا تھا اُسے یہی لگتا تھا کہ وہ پیئے ہوئے ہے۔اُنہوں نے بدرو کو چیتن آنند کے آفس میں آنے کے لئے کہا اور ساتھ ہی اُسے اپنی اداکاری کا ایسا نمونہ پیش کرنے کے لئے کہا کہ جو بھی اُسکی اداکاری کو دیکھے وہی دنگ رہ جائے۔

چیتن آنند، دیوآنند، گورودت اور بلراج ساہنی آفس میں بیٹھے تھے اور کہانی پر ڈسکشن چل رہا تھا کہ باہر ہنگامہ مچ گیا۔ایک شرابی آفس میں گھس گیا تھا اور اُسنے اپنی اُلٹی سیدھی حرکتوں سے پورے اسٹاف کو پریشان کیا تھا۔جب یہ خبر گورودت کو ملی تو اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شرابی اُنکے آفس میں کیسے گھس گیا۔جب اس شرابی کی حرکتیں حد سے تجاوز کر گئیں تو اُنہوں نے اپنے اسٹاف کو حکم دیا کہ وہ اس شرابی کو دھکے مار کر باہر نکال دیں۔اس سے پہلے کہ وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے لے جاتے، اتنے میں بلراج ساہنی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک زور کا قہقہہ لگا کر گورودت سے بولے۔

''بھئی یہ کوئی شرابی نہیں ہے ۔ یہ تو بدرو ہے۔بدر دین۔ بہت اچھا ایکٹر ہے یہ۔یہ اپنی ایکٹنگ کا نمونہ پیش کر رہا تھا''

جب بدرودین نارمل انداز میں باتیں کرنے لگا تو گورودت پھٹی پھٹی آنکھوں سے بدرودین کی طرف دیکھنے لگا۔تھوڑے توقف کے بعد گورودت نے بدرودین سے کہا کہ وہ اُسے فلموں میں بریک دیں گے مگر اس شرط پر جب وہ اپنا نام جانی واکر رکھ دیں گے۔بدرودین کی قسمت بدل گئی۔وہ بدرو سے جانی واکر ہوگیا اور گورودت کی زندگی کا ایک جزولانفیک بن کر رہ گیا۔ایسے تھے بلراج ساہنی۔

تین سال تک وہ بے کاری کے دور سے گزرتے رہے۔یہ اُنکی زندگی کا انتہائی بدترین دور تھا۔ڈائرکٹر شاہد لطیف نے اُنہیں اپنی فلم ''بزدل'' میں مرکزی کردار کے لئے سائن کیا۔اُنکے ڈریس تک بن گئے۔بلراج ساہنی کی بدنصیبی دیکھئے کہ شاہد لطیف کا من بدل گیا اور اُسنے بلراج ساہنی کو ہیرو کی جگہ ایک چھوٹا سا رول کرنے کے لئے کہا۔بلراج ساہنی نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اُنہوں نے فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ گھر کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔حالت یہ تھی کہ گھر چلانے کے لئے اُنکے بیٹے اجے کو بھی فلموں میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔وہ کے۔آصف کی فلم ''ہلچل'' میں کام کر رہا تھا۔دلیپ کمار کا بڑا بھائی ایوب خان بلراج ساہنی کا دوست تھا۔وہ ایک دن بلراج ساہنی کو کے آصف کے پاس لے کر گئے اور اُنہیں اُنکی فلم ''ہلچل'' میں ایک اہم رول دلا دیا۔بلراج ساہنی کو پہلی بار دلیپ کمار اور نرگس کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔یہ وہ دور تھا جب دلیپ صاحب کا توتی بولتا تھا۔بلراج ساہنی اپنی قسمت پر نازاں تھے کہ اُنہیں اتنے بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔مزے کی بات یہ تھی کہ اس فلم میں باپ بیٹے دونوں کام کر رہے تھے۔بلراج ساہنی اس فلم میں ایک پولیس انسپکٹر کا رول ادا کر رہے تھے۔جس وقت اس فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی بلراج ساہنی جیل میں بند تھے۔آصف صاحب کی کاوشوں سے اُنہیں شوٹنگ کرنے کی اجازت مل گئی لیکن مشکل یہ تھی کہ ہر دن شوٹنگ کرنے کے لئے اُنہیں پولیس حکام سے اجازت لینی پڑتی تھی۔صبح صبح پولیس والے اُنہیں وین میں بٹھا کر سیٹ پر لے آتے تھے۔وہ جیل کے کپڑے اُتار کر انسپکٹر کا کاسٹیوم پہنتے تھے۔شام تک شوٹنگ کرتے تھے۔پھر وین میں بیٹھ کر جیل چلے جاتے تھے۔سیٹ پر لوگ پیٹھ پیچھے اُنکا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ارے کس نے اس آدمی کو ایکٹر بنا دیا۔نہ چال نہ ڈھال نہ چہرہ نہ مہرہ بننے آئے ہیرو۔یہ سچ ہے کہ اُن دنوں بلراج ساہنی کافی کمزور اور بیمار نظر آرہے تھے۔دراصل جس طرح کی غذائیں اُنہیں ملنی چاہئے تھیں، اُنہیں مل نہیں پا رہی تھیں۔جسکے سبب اُنکا چہرہ بالکل اُتر گیا تھا۔ساتھ ہی وہ دلیپ کمار اور نرگس کے سامنے شاٹ دیتے وقت گھبرا جاتے تھے جسکے سبب اُنہیں ٹیک پر ٹیک دینا پڑتا تھا۔کبھی وہ اپنی لائینیں بھول جاتے تھے تو کبھی اُنکی جسمانی حرکتیں غیر متوازن ہوا کرتی تھیں۔وہ نرگس اور دلیپ کمار کے سامنے انتہائی خفت اور شرمندگی محسوس کرتے تھے۔وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ جب دلیپ کمار اور نرگس اپنا شاٹ دینے آتے تھے تو وہ بڑے آرام اور اطمینان سے شاٹ دے کے نکل جاتے تھے۔ایک بار اُنہوں نے دلیپ کمار سے پوچھا کہ وہ اس طرح کی فطری اداکاری کیسے کر پاتے ہیں تو اُنہوں نے جواب میں کہا کہ وہ اپنے سنیروں کی فلمیں دیکھتے ہیں اور اپنے دوستوں سے ایکٹنگ کے ٹپ لیتے رہتے ہیں۔بلراج

ساہنی بھی فطری اداکاری کرنے کی کوشش میں سرگرداں تھے مگر وہ کرنہیں پار ہے تھے۔اُنکی بناوٹی اداکاری پر یونٹ والے فقرے کستے رہتے تھے۔معصوم اجے کے دل ودماغ پران منفی باتوں کا بہت برااثر پڑتا تھا۔وہ جب بھی اپنے والد سے ملتے تھے تو اُن تک یہ ساری باتیں پہونچادیا کرتے تھے۔بلراج ساہنی اپنے بچے کواپنے سینے سے لگا کر کہتے۔میں جانتا ہوں لوگ پیٹھ پیچھے کس طرح میری برائی کرتے رہتے ہیں ۔پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ایک دن میں ان سب کودکھادوں گا کہ میں کیا ہوں۔

نتن بوس دلیپ کماراوراشوک کمارکولیکرایک فلم بنارہے تھے جس کا نام ''دیدار'' تھا۔اُسمیں اُنہوں نے بلراج ساہنی کے بیٹے اجے کودلیپ کمار کے بچپن کا رول ادا کرنے کے لئے چنا تھا۔اجے کی ماں دمینتی اُسکے فلموں میں کام کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فلموں کے چکر میں اُسکی پڑھائی خراب ہوجائے مگر بلراج ساہنی کام کرنے کے حق میں تھے کیونکہ اُن دنوں اُنکی مالی حالت اس حد تک تنگ تھی کہ روز پانی پینے کے لئے کنواں کھودنا پڑتا تھا۔اجے کواس فلم میں پندرہ سوروپے کے معاہدے پرسائن کیا گیا تھا۔پندرہ سواُس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ایک دن بلراج ساہنی اسٹوڈیو سے گزرے تو اُنہوں نے سوچا کہ اجے کی شوٹنگ دیکھ لیں۔وہ جب اسٹوڈیو میں داخل ہوئے تو کیا دیکھا کہ اُنکا بیٹا جنگل میں اکیلا کھڑا ہے۔طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں۔پیڑ اُکھڑ کے گر رہے ہیں۔کہانی کے مطابق اجے کے اوپرایک پیڑ گرتا ہے جس کے کارن وہ اندھا ہوجاتا ہے۔جب بلراج ساہنی نے اپنے بیٹے کواس طوفانی ماحول میں چیختے چلاتے دیکھا تو اُن سے رہا نہیں گیا۔وہ نتن بوس پر برس پڑے۔نتن بوس کا قد انڈسٹری میں بہت اونچا تھا۔بڑے بڑے اسٹاراُنکے سامنے جھک کے کھڑے رہتے تھے۔اُسی نتن بوس کوبلراج ساہنی نے سب کے سامنے ڈانٹ دیا تھا۔امیش کول جو کہ نتن بوس کے اسسٹنٹ تھے اُسے الگ لے جاکے بولے کہ یہ آپ نے کیا کیا۔آپ نتن بوس پر چلائے ۔بہت غلط کیا آپ نے۔بہت غلط کیا آپ نے۔

بلراج ساہنی کواپنی غلطی کا احساس تو ہوا مگر بہت دیر بعد۔

1951 میں بلراج ساہنی کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں ۔''مالدار'' ''ہلچل''اور''ہم لوگ''۔''ہم لوگ'' کی کہانی ضیاسرحدی نے کے آصف کے لئے لکھی تھی اوردلیپ کمار کو ذہن میں رکھ کر یہ کہانی لکھی تھی۔ کے آصف اور ضیا سرحدی میں کسی بات کو لے کراختلاف پیدا ہوگیا جسکے سبب دونوں الگ ہوگئے۔ ضیاسرحدی نے چندولال شاہ المعروف سیٹھ جی کو یہ کہانی سنائی۔سیٹھ جی کو کہانی پسند آگئی اور وہ اس فلم میں پیسہ لگانے کے لئے تیار ہوگئے۔جب ضیا سرحدی بلراج ساہنی کولے کرسیٹھ جی کے پاس گئے تو سیٹھ جی بلراج ساہنی کودیکھ کر دنگ رہ گئے۔سیٹھ جی دلیپ کمار کوہیرو کے رول میں دیکھنا چاہتے تھے۔ضیاسرحدی نے کہا کہ بلراج ساہنی ہی اس رول کے لئے موزوں ہیں۔ضیاسرحدی کوسیٹھ جی کومنانے میں کافی دن لگ گئے۔بالآخر وہ مان گئے اورفلم سیٹ پر چلی گئی۔''ہم لوگ'' ایک جذباتی فلم تھی جسمیں بلراج ساہنی نے مدقوق نوتن کے بھائی کا رول ادا کیا تھا۔اس فلم کے ہدایت کار بھی ضیاسرحدی ہی تھے۔وہ بھی کیمونسٹ پارٹی کے فال رکن تھے۔اس فلم میں بلراج ساہنی کی جذباتی اداکاری کوکافی سراہا گیا۔فلم بیحد کامیاب رہی۔ضیاسرحدی کے بعدڈائرکٹرڈی ڈی کشپ نے بلراج ساہنی کواپنی فلم ''بدنام'' کے لئے بطور ہیروسائن کیا۔''ہم لوگ'' کی کامیابی کے باوجود بہت کم فلمساز بلراج ساہنی کو ہیرو کے رول کے لئے موزوں سمجھتے تھے۔''بدنام'' کی ہیروئن شیاما تھی اوراُنکے علاوہ شیلا رمانی اور ہیلن پہلی بار کیمرہ کا سامنا کر رہے تھے۔ 1952 میں اُنکی اکلوتی فلم ''بدنام'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بھی کب آئی کب اُتر گئی کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔

ایک دن وہ جوہو بیچ پر اپنے بچوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے تبھی اُنکی نظرایک بنگالی بابو پر پڑی۔اُنہوں نے اُسے جھٹ سے پہچان لیا۔یہ اسیت سین تھے۔بمل رائے کے اسسٹنٹ۔بعد میں اُنہوں نے ایک کامڈین کے طور پراپنی پہچان بنالی۔وہ بلراج ساہنی کے پاس آگئے اوراُن سے کہا کہ بمل رائے اُنہیں یادکررہے ہیں۔بلراج ساہنی یہ خبرسن کر مارے خوشی کے رات بھرسونہ سکے۔اگلے روز وہ ایک قیمتی سوٹ پہن کے بمل رائے سے ملنے اُنکے آفس میں پہونچ گئے۔ بمل رائے نے جب بلراج ساہنی کودیکھا تو اُنہوں نے براسامنہ بنا کرساتھ میں بیٹھی اپنی ٹیم سے بنگالی میں پوچھا۔

''اسکی سفارش تم لوگوں نے کی تھی؟ مجھےتو یہ کسی بھی زاویے سے اپنی فلم کے لئے موزوں نہیں لگ رہاہے''

بمل رائے کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ بلراج ساہنی بنگالی زبان بولتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔بلراج ساہنی نے جب بمل رائے کی باتیں سنیں تو اُنکی ٹانگوں کوجیسے لقوہ مارگیا۔وہ اُٹھ کے جانا چاہتے تھے پروہ اُٹھ ہی نہیں پارہے تھے ۔اُنہیں ایسا لگ رہاتھا جیسے زمین نے اُنکے پاوں پکڑ لئے ہوں۔انہوں نے بڑی ہمت کرکے بمل رائے سے پوچھا۔

''آپ کی فلم میں کیارول ہے؟''

''ایک مظلوم کسان کا''

''اسطرح کارول تو میں فلم ''دھرتی کے لال''میں کرچکا ہوں۔شمبھو متر ااس فلم کے معاون ہدایت کار تھے۔اُنہوں نے اس رول کی ادائیگی میں میری بہت مدد کی''

شمبھو مترا کا نام لیتے ہی ماحول بدل گیا۔اسکے بعد رشی کیش مکھرجی بلراج ساہنی کواسٹوڈیو کے لان میں لے گئے اوراُنہیں ''دوبیگھہ زمین'' کی کہانی سنائی۔ کہانی سن کر بلراج ساہنی روتے رہے۔ ہدایت کار بمل رائے نے بلراج ساہنی کوفلم ''دوبیگھہ زمین'' کے لئے سائن کیا۔اس بار بلراج ساہنی نے عہد کیا کہ وہ اپنے کردار میں کسی طرح کی کوئی کمی رہنے نہیں دیں گے۔شوٹنگ سے پہلے وہ کلکتہ پہونچ گئے اورسائیکل رکھشا والوں کی طرح دھوتی کرتا پہن کرایک مہینے تک کلکتہ کی

سڑکوں پر رکھشا چلاتے رہے۔وہ اس سادگی کے ساتھ ان رکھشا والوں کے ساتھ رہے کہ کسی کو شبہ تک ہونے نہیں دیا کہ وہ مشہور اداکار اور قلم کار بلراج ساہنی ہیں۔پہلے دن جب وہ سیٹ پر پہونچے تو اُنہوں نے بمل رائے سے درخواست کی کہ وہ اپنی پسند کا ڈریس پہنیں گے اور اپنا میک اپ بھی خود ہی کریں گے۔جب وہ تیار ہو کے سیٹ پر آئے تو بمل رائے حیرت و مسرت سے اُنہیں دیکھتے رہے۔اس فلم کی شوٹنگ دوران بلراج ساہنی ننگے پاوں کلکتہ کی تپتی سڑکوں پر رکھشا چلاتے رہے۔اُنکے تلوے گرمی کے سبب جھلس گئے پھر بھی اُنہوں نے کوئی شکایت نہیں کی۔جب ''دو بیگھ زمین'' ریلیز ہوئی تو اس بار لوگوں نے بلراج ساہنی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔بلراج ساہنی کی فطری اداکاری دیکھ کر اُنکے رقیب بھی دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے۔اُنہوں نے سائیکل رکھشا والے شمبھو مہتو کے کردار کو جاوداں کر دیا تھا۔

فلم ''دو بیگھ زمین'' کو عالم گیر شہرت ملی۔ Cannes Film Festival میں اس فلم کو اعزاز سے نوازا گیا۔اس فلم کی بے پناہ کامیابی کے بعد بلراج ساہنی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔اب وہی پرڈیوسر جو کل تک اُن سے دور دور بھاگتے تھے اُنکے آگے پیچھے گھومنے لگے۔ایک فلم نے اُنہیں بین الاقوامی شہرت دلائی تھی۔وہ اب پوری دنیا میں پہچانے جانے لگے تھے۔اس فلم کے بعد بلراج ساہنی کو اُس دور کی ٹاپ کی ہیروئنوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔جیسے نرگس، مینا کماری وجینتی مالا اور نوتن۔امیہ چکرورتی جو سوشل موضوعات پر بڑی حساس فلمیں بنانے میں ید طولی رکھتے تھے، اُنہوں نے بلراج ساہنی کو اپنی فلم ''سیما'' کے مرکزی کردار کے لئے چن لیا۔اس فلم کو نوتن اور بلراج ساہنی کی فطری اداکاری نے چار چاند لگا دئے تھے۔یہ فلم باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔نرگس کے ساتھ اُنہوں نے 1958 کی فلم ''لاجونتی'' کی جو بیحد کامیاب رہی۔اسی سال اُنکی ایک اور کامیاب فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''گھر سنسار'' تھا۔1959 میں ''سٹہ بازار'' ریلیز ہوئی جسنے کامیابی کے ڈنکے بجا دئے۔اسی طرح ''کٹھ پتلی'' میں اُنہوں نے وجینتی مالا کے ساتھ کام کیا۔''چھوٹی بہن'' میں نندہ کے بڑے بھائی کا رول اُنہوں نے اس خوبی سے ادا کیا کہ فلم شائیقین اُنکی فطری اداکاری دیکھ کر عش عش کر اُٹھے۔بلراج ساہنی نے ہر طرح کے رول ادا کئے۔فلم ''حقیقت'' میں وہ میجر کے رول میں نظر آئے۔جب کہ فلم ''کابلی والا'' میں اُنہوں نے ایک سیدھے سادے پٹھان کا رول ادا کیا۔اُنکی یادگار فلموں میں ''وقت'' ''ان پڑھ'' ''ہمراز'' ''سنگھرش'' ''نیل کمل'' ''عزت'' ''دنیا'' ''تلاش'' ''ننھے فرشتے'' ''ایک پھول دو مالی'' ''دو راستے'' ''پوتر پاپی'' ''نانک دکھیا سب سنسار'' ''پرایا دھن'' ''ہندوستان کی قسم'' ''ہنستے زخم'' ''گرم ہوا'' اور ''امانت'' قابل زکر ہیں۔بلراج ساہنی یاروں کے یار تھے۔شاعر کشمیر مہجور اُنکے بہت قریبی دوست تھے۔اُنہوں نے اپنے دوست کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے ایک فلم بنائی جس کا نام ''شاعر کشمیر مہجور'' تھا۔یہ فلم ہندی اور کشمیری میں بنی۔بلراج ساہنی جتنے عظیم اداکار تھے اُتنے ہی وہ عظیم انسان تھے۔فلموں کے ساتھ ساتھ بحیثیت ادیب اُنہوں نے خوب نام کمایا۔اُنہوں نے دو رپورتاژ لکھے۔میرا پاکستان کا سفر اور میرا روس کا سفر۔وہ ہمہ جہت فن کار تھے۔اُنکی خوش اخلاقی اور منکسر مزاجی کی آج بھی فلمی جگت میں چرچا ہوتی ہے 13 اپریل 1973 کو 59 سال کی عمر میں وہ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے اور اپنے پیچھے چھوڑ گئے یادوں کا ایک خزانہ۔

- بقیہ -

آخری نشان

سیتلا دیوی سورج کو روکنے کے لئے آگے بڑھیں تب تک ایک گولی اس کے سینے میں آ لگی۔سورج نے سوگندھا پر فائر کر دیا۔دونوں پاگل ہو چکے تھے۔سبھاش نے سورج کا نشانہ لیا، ادھر سورج نے سبھاش کو خون میں نہلایا۔دھنپت رائے کے صحن میں گیارہ لاشیں پڑی تھیں اور دونوں چشم و چراغ سورج اور سبھاش ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔باہر کھڑے لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ہوا تھم سی گئی تھی جیسے وہ بھی گریہ زار ہو۔تبھی سورج یادو کا چھوٹا بیٹا جو حویلی کے کسی کمرے میں سو رہا تھا۔آنکھیں ملتے ہوئے باہر آیا۔اسے دیکھ کر فوراً سبھاش نے بندوق اٹھانے کی کوشش کی مگر پھر جانے کیوں اس کے ہاتھ رک گئے۔سبھاش نے اپنے زخموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا جو قریب ہی پڑا ٹمٹماتی آنکھوں سے سبھاش کو دیکھ رہا تھا۔سبھاش نے کراہتے ہوئے کہا۔

''بھیا! تمہارے چُھٹکے بابو اشوک کو چھوڑ دیت ہیں خاندان کا یہ آخری نشان زندہ رہے''۔یہ کہتے ہوئے اس کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔سورج نے بھی آخری سانس لی۔

ننھا اشوک صحن میں اکیلا کھڑا اپنے والدین، چاچا چاچی اور بھائی بہنوں کی لاشیں دیکھ رہا تھا ایک ساتھ تیرہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔کبھی دوڑتا ہوا بھائی کی لاش کے قریب جاتا، کبھی بہن کو پکارتا، آخر کار اپنی ماں کے سینے پر گر پڑا۔

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

پیارے بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

آپ کے ارسال کردہ چہارسو کے دونوں پیکٹ بہت انتظار کے بعد موصول ہوئے اور آپ کے لیے دل سے بے شمار دعائیں نکلیں۔ آپ نے اس دُورافتادہ کے لیے اس قدر محبت اور اپنائیت کا ثبوت دیا اور وہ بھی اس صورت میں کہ ابھی ہم ایک دوسرے کے شکل آشنا بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص ہنر سے نوازا ہے لہٰذا یہ گوشہ نہ صرف اچھا بلکہ بہت ہی بہتر اور لاجواب ہے۔ اس سے عمدہ گوشہ نکالنا ممکن نہیں تھا۔ میرے پاس آپ اور آپ کے قاری لیے شکریہ کے الفاظ نہیں۔ بہرکیف ہماری دوستی اور تعلق کا آغاز آپ نے جس عمدگی سے کیا ہے یہ ہمیشہ قائم ودائم رہے گا۔

عبدالصمد (پٹنہ، بھارت)

محبی گلزار جاوید، سلام۔

تازہ شمارے میں آپ کا افسانہ پڑھا۔ طویل مدت سے آپ کا افسانہ ایک متعینہ اور منفرد راستے پر رواں دواں ہے۔ یوں لگتا ہے دنیا نے جو کچھ آپ کو دیا اسے نستالجیہ کا شکار بنے بغیر، موزوعیت سے گریز کرتے ہوئے، ممکنہ معروضیت کے ساتھ فکشن نگاری پر اپنی مہارت سے کام لیتے ہوئے، لوٹانے میں پورے انہاک اور خلوص کے ساتھ جُٹے ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر افسانہ بیانیے کے اساس پر جانچا جائے تو زبان کی حد تک ادبِ عالیہ (کلاسیک) اور ادبِ حالیہ (موڈرن ازم) سے آمیز ہے۔ بیانیے میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے وہ ’’سلائیس آف بریڈ‘‘ کے آس پاس ہے۔ پلاٹ کے پردے کے پیچھے ہے لیکن کلاسیکی ارتقا کے سارے مراحل کی پابندی کے ساتھ۔ پرولوگ، رائزنگ ایکشن، کلائمکس، ڈنومنٹ اور انٹی کلائمکس اور سبھی کچھ۔ اس افسانے کا حقیقی معنوں میں کردار فرحت باجی کی بے ساختہ ہنسی کا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کے چلے جانے کے بعد بھی یہ نشر ہوتی رہتی ہے۔ ہائے گلزار جی! کیا افسانہ لکھا ہے۔ جھلکیوں جھلکیوں میں جان نکال کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دی ہے۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

برادرم گلزار جاوید، سلام۔

تازہ چہارسو ملا جسے پڑھ کر طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی بالخصوص آپ کا افسانہ ’’فرحت باجی‘‘ موبائل پر پڑھا۔ رُلا دیا یارو!

کیا زبان کی روانی! کیا کردار نگاری!! کیا جذبات کی عکاسی!!! کس کس کی تعریف کروں بھائی میرے!

افسانے کی حقیقت سے میں واقف تھا۔ اس لیے افسانہ پڑھتے ہوئے سوچتا رہا ’’اللہ کرے، کبھی مجھے پنڈی آنے کا موقع ملا تو آپ کو لے کر میں کراچی جا کر فرحت باجی کے درشن ضرور کروں گا۔‘‘ افسانے کے اختتام پر پہنچا تو جانا یہ درشن میرے نصیب میں نہیں ہیں۔ اب نصیب میں تو صرف اور صرف دعا کرنا ہی لکھا ہے۔ دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ فرحت باجی کو کروٹ کروٹ جنت بخشے۔ آمین!

نگہت افروز کے کردار کو خاموش رکھ کر آپ نے اسے بلندی پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ کامران بھی اپنی جگہ پیر جمائے نظر آتا ہے۔ جذبات کی سرحد پر آ کر بھی وہ یکسر اپنے آپ کو پاک ثابت کرتا گذر جاتا ہے۔ اتنے صاف ستھرے اور پاکیزہ افسانے کے لیے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

انل ٹھکّر (ہبلی، بھارت)

گلزار بھائی، آداب۔

تازہ چہارسو میں صفحات کی قلت کے سبب آپ نے میرے افسانے کے بجائے اپنا افسانہ شائع کر دیا۔ گھٹنا پیٹ کی جانب نہ جھکے تو بیمار کہلائے گا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ صحت مند ہیں، غصے کی حالت میں فوراً آپ کا افسانہ پڑھ ڈالا۔ آپ کی ذہانت کی داد دینی پڑی۔ آپ کا افسانہ میری کہانی سے بہت بہتر ہے۔ آپ نے درست فیصلہ کیا۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہی فیصلہ کرتا (یعنی آپ کا افسانہ ہی شائع کرتا) بلکہ لغت سے رجوع کرنا پڑا تو انکشاف ہوا کہ ’’جائے ماندن پائے رفتن‘‘ کا محاورہ دونوں طرف سے مستعمل ہے۔ آپ کی کہانی سادہ، رواں، حقیقت سے قریب اور رشتوں کی عظمت کی کہانی ہے۔ یہ بندھن واقعی بہت خوبصورت ہوتے ہیں آپ نے حق ادا کر دیا۔ خداوند کریم مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

میرے گلزار،

آج تمہیں گل وگلزار کہنے کو جی چاہتا ہے۔ وجہ بتلانا ضروری ہے اور نہ میں اس تکلف کو جائز سمجھتا ہوں۔ حسبِ سابق اس بار بھی ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کی شکل میں تم نے ایک نادر جواہر پارے کو نہایت خوبصورتی اور ہنرمندی سے تراش کر کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اُن کا فن قاری سے گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ اس بار براہِ راست کے سوالات نے بہت متاثر کیا۔ کاش ڈاکٹر صمد صاحب بھی اُسی شوق اور توجہ سے جوابات دیتے جس لگن، محنت اور ذہانت سے تم نے سوالات ترتیب دیے۔

اس بار بھی محترمہ پروین شیر کے سفرنامے نے گرفت میں لیے رکھا۔ یہ خاتون جنّات کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ دنیا کے اُس کونے تک پہنچ جاتی ہیں

جہاں ہم جیسے سابق ہواباز کوسوچتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔آپ کوعلم ہے کہ میں ڈاکٹر فیروز عالم کوسوہنڑا منڈا یعنی خوبصورت لڑکا کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔اُن کی کہانی پڑھ کر مجھے اپنی رائے پر پختہ یقین ہوگیا ہے کہ وہ خوبصورت لڑکے ہی نہیں بہت خوبصورت قلم کار بھی ہیں اور ترجمے میں تو اُن کے جوہر اُمڈ اُمڈ کے سامنے آرہے ہیں۔تابش خانزادہ اپنے ناول میں جس طرح نئے موضوع اور نئے ماحول کو ہنرمندی سے برت رہے ہیں وہ بھی بے پناہ داد کے مستحق ہیں۔ دیپک کنول کا کیا کہنا۔ایسی صدا بہار شخصیت کم کم دیکھنے میں آئی ہیں جو ایک موضوع کو ہمہ رنگی سے برتنے کے ہنر میں اس قدر مشاق ہیں (یا ہو چکے ہیں) کہ چہارسو کھولتے ہی اُن کا مضمون پڑھنے کو دل بے چین ہو جاتا ہے۔

ویسے تو چہارسو میں بلند قامت شعراء کا کلام شامل ہوتا ہے مجھے خاص طور پر آصف ثاقب،عرش صہبائی،غالب عرفان،نسیم سحر،عارف شفیق،نوید سروش،زاہدہ عابد حنا،حسین سحر اور ابراہیم عدیل کے علاوہ شبنم رومانی مرحوم،ڈاکٹر ریاض احمد اور آپا جمیلہ شبنم نے بہت متاثر کیا۔ہو سکے تو تمام احباب بالخصوص آپا جمیلہ شبنم کو میرا اسلام اکرام پہنچایئے۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی،بھارت)

جناب گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

چہارسو باقاعدہ وقت پر شائع ہونے کے پیچھے آپ کی اور آپ کے رفقاء کی محنت اور آپ کی مستقل مزاجی ہے۔پاکستان میں کچھ بھی ہو رہا ہو،کتنی بھی مشکلات کا سامنا ہو چہارسو اپنے وقت پر شائع ہو جاتا ہے۔اس شمارے میں عبد الصمد صاحب کا افسانہ ''گومڑ'' حقیقت اور افسانہ کے درمیان چل رہا تھا،افسانہ ہٹ گیا حقیقت سامنے آ گئی۔عذرا اصغر صاحبہ کا افسانہ ''بے ڈھب'' فیمینز اسے متعلق ہے، یہ سماجی حقیقت نگاری کے لحاظ سے بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔آپ کا افسانہ ''فرحت باجی'' آپ کے منفرد اسلوب کا ایک حسین نمونہ ہے۔اس میں آپ نے بہت نزاکت کے ساتھ کامران اور فرحت باجی کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ دوسری جانب فرحت باجی کا سلیقہ،ان کی انتظامی صلاحیتیں،مہمان نوازی اور خاص طور پر ان کی مترنم ہنسی۔فرحت باجی جو مونگ پھلی اپنے دانتوں سے چٹخا رہی تھیں وہی اکلوتی مونگ پھلی کامران کو دی اور جب کامران نے اُسے اپنے دانتوں سے توڑا تو اس پر فرحت باجی کا شرما جانا افسانے کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

محترم گلزار صاحب،تسلیمات!

صمد صاحب پر گوشہ خوب ہے۔ صمد کو مبارک باد۔لیکن آپ نے انہیں سوالوں کے گھیرے میں لیا ہے اور صمد گھبرائے گھبرائے سے نظر آرہے ہیں۔

صمد کبھی کوئی تنازعہ مول نہیں لیتے۔ وہ ناقد کو سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھتے ہیں۔ وہ یا تو خود پر لگائے گئے الزام تسلیم کر لینگے یا خاموش رہیں گے۔ ناول شکست کی آواز کے تعلق سے عتیق اللہ کے ریمارک پر آپ کے سوال کے جواب میں ان کا یہ کہنا کہ " عتیق اللہ ایک بے حد اہم تنقید نگار ہیں۔ ان کی رائے سر آنکھوں پر۔ میں اس میں کوئی مطلب نکالنے کی جرت نہیں کرسکتا " افسوس ناک بیان ہے جس سے مصلحت پسندی کی بو آتی ہے۔ کیا عتیق اللہ اللہ میاں ہیں کہ ان کے تنقیدی فرمان کی کوئی کاٹ نہیں ہے۔ صمد کا یہ جواب تخلیق کار کے قد کو چھوٹا کرتا ہے۔ اگر کسی نے متعصب ہو کر کچھ لکھا اور غلط رائے دی ہے تو تخلیق کار کا فرض ہے کہ اپنا دفاع کرے کیوں کہ تخلیق اولاد کی طرح ہوتی ہے۔ فاروقی کا خط بھی دلچسپ ہے۔ پتہ چلا کہ صمد نے افسانہ بھیجا تو پانچ سو کی رقم بھی عنایت کی۔ یہ ایک طرح کی پی آر شپ ہے۔ اس لیے صمد کے سبھی دوست ہیں اور صمد کی شان میں رطب الساں رہتے ہیں۔ افسانہ ہونی انہونی میں صمد کا یہ جملہ ملاحظہ کیجیے " وہ یونہی نہیں گیے بلکہ اپنے ساتھ اس کی گردن بھی اتار کر اپنے ساتھ لے گے۔ یہاں " اپنے ساتھ " کی تکرار بیانی میں نقص پیدہ کرتا ہے۔ اتنا ہی لکھنا کافی تھا" اس کی گردن بھی اتار کر لے گئے۔ " اپنے ساتھ " کا لفظ غیر ضروری ہے۔ ظاہر ہے جب گردن اتار کر لے گئے تو اپنے ساتھ ہی لے گئے ہونگے ایسی مثالیں صمد کے یہاں اور بھی ملتی ہیں۔

شعری حصّہ پسند آیا۔آصف ثاقب کا یہ شعر " پکڑ کر ہاتھ میرا چلنے والا؛ ہتھیلی کا پھپھولا ہو نہ جائے " یہ شعر عدم تحفظ کے اس احساس کی غمّازی کرتا ہے جو آج آدمی کے لاشعور میں ہوا میں لمس کی طرح موجود ہے۔ عبداللہ جاوید کا یہ شعر " ہجرتیں ختم ہی نہیں ہوتیں؛ کوچ کر جاینگے یہاں سے بھی " اپنے دامن میں ثقافتی پس منظر رکھتا ہے اور ہجرت کے درد کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن غالب عرفان نے تک بندی کی ہے۔ انہیں چاہئے کہ کچھ دن آرام فرمائیں۔ آپ نے فرحت باجی سے خوب ملاقات کرائی۔۔۔زندگی سے بھرپور کردار اور آپ کا اسلوب بھی حسن سے بھرپور۔۔۔

شموئل احمد (پٹنہ،بھارت)

بھائی گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا شمارہ جولائی اگست ۲۰۱۶ء موصول ہوا جس کے لیے ممنون ہوں۔یہ شمارہ میرے لیے کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل نکلا۔سب سے پہلے یہ کہ میں نے اس سے قبل عبدالصمد کی کوئی تخلیق یا کوئی افسانہ نہیں پڑھا جب کہ وہ افسانوں کی دنیا میں مشہور ہیں۔اب آپ کے جریدے نے اُن کا بھرپور تعارف کروا دیا ہے تو پھر ناواقفیت کیسی؟ اُن کے بارے میں جان کر مسرت ہوئی اور اُن کے افسانے پڑھ کر طمانیت بھی! شہناز خانم عابدی کے دونوں افسانچے معاشرے کے دو رُخ پیش کرتے ہیں۔ایک میں مشرقی معاشرہ تو دوسرے میں مغربی معاشرہ! اپنے تلخ حقائق پیش کر رہا ہے۔عذرا اصغر جتنی پرانی افسانہ نگار ہیں اتنی ہی بھرپور کہانیاں لکھتی ہیں۔''بے ڈھب'' میں انہوں نے جس تلخ حقیقت کی نشاندہی کی ہے اُس سے ہمارا گھر بھی متاثر ہوتے ہوتے بچا ہے۔یہاں کراچی میں گھر کا کام کرنے والی عورت کو ''ماسی'' کہتے ہیں۔ایسی ہی ایک ماسی گذشتہ

دنوں اپنی جوان بیٹی کے ساتھ کام کرنے آئی تو اُس کی بیٹی نے مجھ جیسے عمر رسیدہ شخص سے بھی پینگیں بڑھانے میں تکلف نہ کیا پھر بیگم پر دو ماہ میں ہی حقیقت اجاگر ہوگئی اورانہوں نے پیشگی تنخواہ دے کر دونوں کو رخصت کر دیا! بہرحال عذرا اصغر کے افسانوں میں کردار مرد کا ہوتا ہے لیکن بولتی عورت ہے! افسانہ پسند آیا۔ سب سے پیاراا ور خوبصورت افسانہ ''فرحت باجی'' عجیب کیفیت کا حامل تھا گلزار جاوید نے بہت دنوں کی غیر حاضری کو اپنے ایک افسانے کی پیش کش میں ہی دور کر دیا۔ افسانے کی روانی، جملوں کی ساختگی اور فرحت باجی کی کردار نگاری نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا بلکہ میں تو کہوں گا کہ افسانہ، افسانہ نگار پر بیتے ہوئے دنوں کی یادگار ہے جس میں مقام اور کرداروں کے فرضی نام ہیں۔ یوں تو کئی مقامات کے مکالمے یاد رکھے جانے کے قابل ہیں لیکن انداز بیان میں صفحہ ۶۵ کے دوسرے کالم کی دوسری عبارت کے الفاظ ''ہم نے بھی فوری طور پر اُس مونگ پھلی کو دانتوں میں دبا کر توڑ لیا۔ ہمارے اس عمل پر فرحت باجی کے چہرے پر حیا کی لالی آ گئی اور وہ شرماتی ہوئی دوسری جانب چل پڑیں۔'' یقیناً مکمل غزل کی فضا لئے ہوئے ہیں۔ مبارکباد!

''ایک صدی کا قصہ'' اس بار ''نمی'' کی حیات کے چند گوشوں پر محیط تھا لیکن میں ذاتی طور پر نمی کی فلم ''امر'' نہیں بھول سکتا جس میں اُس نے دلیپ کمار اور مدھوبالا جیسے LEGEND کے آگے ناقابل فراموش اداکاری کر کے اپنا لوہا منوایا تھا۔ فلم کی ناکامی کے کئی اسباب تھے جس میں سب سے بڑا سبب کہ یہ فلم شاید جب ریلیز ہوئی تو وہ اپنے وقت سے بہت پہلے تھی پھر بھی دیپک کنول کے یہ الفاظ ''یہ فلم باکس آفس پر اوندھے منہ گری'' انتہائی نامناسب لگے۔

غالب عرفان (کراچی)

گل و گلزار بھیا، جیتے رہو! شاد و آباد رہو!!

عینِ عالمِ انتظار میں ماہِ اگست ۲۰۱۶ء کا چہارسو موصول ہوا۔ اگرچہ پرچہ نیٹ پر آ چکا تھا مگر نیٹ پر پڑھنے میں وہ مزا کہاں! حسبِ معمول سب سے پہلے ''براہِ راست'' کا مطالعہ کیا۔ آپ کے تیکھے سوالات اور اُن کے برجستہ جوابات سے لطف اندوز ہوئی۔ پھر گوشے کے دیگر مندرجات پڑھے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ ضرورت سے زیادہ مدیر کی توصیف کی جائے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ آپ کھوج کھوج کر ایسے پائے کی شخصیات سے متعارف کراتے ہیں اور پرچے کو معیاری، عمدہ نگارشات سے سجاتے ہیں تو جناب تعریف تو لامحالہ آپ کی کرنا پڑے گی نا۔ اس سارے کام میں آپ کی شب و روز کی محنت کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ اس مرتبہ آپ نے جناب عبدالصمد سے ملوایا۔ ''چہارسو'' دونوں ملکوں کے درمیان ادبی سفارت کا کام انجام دے رہا ہے۔ یوں آپ سفیرِ ادب ٹھہرے۔ زندہ باد گلزار جاوید اور پائندہ باد ''چہارسو''۔

عبدالصمد صاحب کا افسانہ ''گومڑ'' اور مضمون ''بھیڑ میں اکیلا شخص'' دیدہ زیب رہے۔ موصوف کا اندازِ تحریر دلنشیں اور لائق مطالعہ ہے ''گومڑ'' کا موضوع گو وہم پر استوار عام سا ہے لیکن پورا افسانہ دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ البتہ ناول کا ایک باب وہ توجہ حاصل نہ کر سکا۔ ناول جب تک تسلسل کے ساتھ نہ پڑھا جائے مزا نہیں دیتا۔ تاہم پورا گوشہ بہت خوب ہے۔ عبدالصمد صاحب پر لکھنے والوں نے بھی حق ادا کیا ہے۔ شہناز خانم عابدی کے افسانچے حقیقت پر مبنی ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نیّر اقبال علوی اچھے افسانہ نگار ہیں مگر ''استخوانی پنجرہ'' مجھ کم فہم کے پلّے نہیں پڑا۔ جانے وہ کیا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ البتہ گلزار جاوید کا افسانہ ''فرحت باجی'' ایک عمدہ اور دلپذیر افسانہ ہے۔ فرحت باجی کا کردار بہت خوبصورت انداز سے ابھارہ گیا ہے۔ افسانے میں کچھ جانے پہچانے لوگوں کے عکس بھی موجود ہیں۔ میرے نزدیک اس مرتبہ ''چہارسو'' کا سب سے بہتر افسانہ یہی ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم اب اپنے قارئین کو تراجم پر ٹالنے لگے ہیں۔ ہم ان کے افسانے پڑھنے کے خواہشمند ہیں۔ توجہ دیجیے۔

''ایک صدی کا قصہ'' نمی کی داستانِ حیات دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ نمی اپنے دور کی پسندیدہ اداکارہ تھی۔ مضمون پڑھتے ہوئے دیکھی ہوئی فلموں کے مناظر آنکھوں میں پھر گئے۔ میں نے اپنے بیٹے سے چند پرانی فلمیں دیکھنے کی فرمائش کی لیکن مارکیٹ میں یہ فلمیں دستیاب نہیں ہیں۔

میں شعراء حضرات سے معذرت خواہ ہوں۔ شاعری کا ذکر ہونے لگے تو بات طول پکڑ جاتی ہے۔ البتہ ''گورا قبرستان'' از فیصل عظیم، کینیڈا۔ ''والدہ محترمہ کی یاد میں'' ڈاکٹر انیس الرحمٰن، سکھر ''ہم سفر کی یادیں''۔ یوگیندر بہل تشنہ، کینیڈا کی نظمیں دل کو چھو لیتی ہیں۔ آپا جمیلہ شبنم کی تحریریں بتاتی ہیں کہ ان میں بہت صلاحیت ہے۔ میں ان سے یادداشتیں لکھنے کی فرمائش کرتی ہوں۔ ماہِ اگست کے اس شمارے میں انتہائی قابل توجہ تحریر نقشبند قمر نقوی بخاری کا مکتوب ہے۔ خط نے بہت محظوظ کیا۔ سچ جانئے ان کا پتہ درج ہوتا تو میں براہِ راست خط لکھ کر ان کی تحریر کی تعریف کرتی۔ کم از کم ایک خط تو ان کے کھاتے میں ہوتا۔ ہمیں بھی آدھی صدی تو گزر گئی براہِ راست کسی نیک بخت کا خط موصول نہیں ہوا۔ غالباً ۱۹۷۲ء میں پشاور سے مشہد تک ہم یعنی میں اور اصغر مہدی ان کے ہمسفر رہنے کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت موصوف شکاریات پر کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر میں نے بچوں کے لیے ایک کہانی لکھی تھی عنوان تھا ''شیرنی کا شکار'' کہانی میں شیرنی انتقاماً انسان کا شکار کرتی ہے۔ یہ کہانی بچوں کے معروف جریدے تعلیم و تربیت میں چھپی تھی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں میرے ماہنامہ تجدید کے کاتب نے قمر صاحب کی ایک کتاب شاعری کی مجھے دکھائی تھی۔ سعید صاحب ان کی کتابوں کی بھی کتابت کرتے تھے جو کہ مقبول اکیڈمی سے چھپ رہی تھی۔ وہ کتاب عمدہ چکنے کاغذ پر تھی اور خوشنما رنگیں بیل بوٹوں سے آراستہ تھی۔ قابلِ رشک حد تک خوبصورت کتاب تھی۔ اب تو انہوں نے دیارِ غیر میں مستقلاً بستی بسا لی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں شاد و آباد رکھے۔ میرا خط بھی خاصا طویل ہو گیا ہے۔ لہٰذا خدا حافظ

آپ کے اور ''چہارسوٗ'' کے لیے بہت سی دعاؤں کے ساتھ!

عذرا اصغر (کراچی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ نے چہارسو کا تازہ شمارہ اردو ادب میں انعام یافتہ ناول۔ افسانے اور خاکے تحریر کرنے پر عبدالصمد صاحب کے نام منسوب کر کے اُنہیں بجا طور پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عبدالصمد صاحب نے جدید افسانہ نگاری کے اسلوب سے ہٹ کر شفاف حقیقت نگاری کا جو انداز اپنایا ہے اُسے بہت پسند کیا گیا ہے اور یہ اُن کی شناخت بن گیا ہے۔ ان کے تحریر کردہ افسانے اور ناول بہت مقبول ہیں۔ اپنے ناول ''دوگز زمین'' میں انہوں نے دلچسپ کردار تخلیق کرتے ہوئے تقریباً سو برس پر پھیلے ہوئے شمالی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے تہذیبی اور سیاسی حالات کا باریک بینی سے احاطہ کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔

اس دفعہ بہت اچھے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ آپ کا تحریر کردہ افسانہ ''فرحت باجی'' ایک سچی اور حقیقی جذبات پر مشتمل دل کو چھو جانے والی کہانی محسوس ہوئی اور دیر تک ذہن پر چھائی رہی کیونکہ افسانہ کا اختتام ہی ایسا افسوس ناک تھا۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا انتخاب ''دوگز زمین میں'' بھی پڑھ کر دل اُداس ہو جاتا ہے کہ اسی زمین پر بسنے والے انسانوں کے حالاتِ زندگی میں کتنی تفاوت ہے۔ نیّر اقبال علوی کا ''استخوانی پنجرہ'' اور شہناز خانم عابدی کے ''افسانچے'' مختصر مگر دلچسپ ہیں۔

اسی طرح بہت سی عمدہ نظمیں وغیرہ بھی شامل کی گئی ہیں جن میں غالب عرفان کی ''حمد باری تعالیٰ'' سبیلہ انعام کی نعت، مامون ایمن کی ''میری کہانی'' آپا جمیلہ شبنم کی ''موت اور زندگی'' یوگیندر بہل تشنہ کی ''ہمسفر کی یاد میں'' اور ڈاکٹر انیس الرحمٰن کی ''والدہ محترمہ کی یاد میں'' سچے اور پر خلوص جذبات پر مبنی نہایت متاثر کن تحریریں ہیں۔

حافظ محمد احمد نے ایک قطعہ ''بگ بینگ'' لکھ کر جیسے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ قرآن کی سورۃ ۲۱ کی آیت نمبر ۳۰ میں ایک لفظ ''رتقاً'' استعمال ہوا ہے جس کا معنی ایک ایسا مادہ ہے جس سے دوسرے اجسام جنم لے سکیں اور پانی بھی اس عمل کے لیے لازمی قرار پایا جو جاندار کی تخلیق کا سبب ہے۔''

سو سال سے کم عرصہ ہوا کہ سائنس والوں نے اپنی تحقیق سے اخذ کیا کہ تمام اجسام فلکی پہلے باہم ایک ہی مادہ میں موجود تھے جو ایک گرجدار آواز سے علیحدہ ہو گئے۔ یہی بات چودہ سو سال پہلے قرآن میں درج ہے کہ سب کچھ پہلے باہم یکجا تھا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ راز کی بات ایک عظیم ہستی کو صدیوں پہلے کس نے بتا دی اور اسی کی دیگر باتیں بھی درج ہیں جواب ثابت ہو رہی ہیں۔ جیسے کہ تمام کائنات پھیل رہی ہے۔ آخر میں نقشبند قمر نقوی صاحب کا طویل خط رس رابطے میں شامل کرنے کا شکریہ جو دلچسپ لگا۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

محترم عبدالصمد صاحب کے قرطاس اعزاز کے ساتھ ''چہارسوٗ'' ملا۔ بہت شکریہ۔ ''قرطاسِ اعزاز'' چہارسو کی مستقل علمی و ادبی شناخت کا مقام و مرتبہ پا چکا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اصنافِ ادب کی جریدے میں قسط وار شمولیت بھی مطالعاتی جہتوں کو تنوع اور ندرت سے ہمکنار کرتی ہے۔ تخلیق کاروں کی شعری ونثری نگارشات کے علاوہ انگریزی ادب سے تراجم، ناولز کے بالاقساط ابواب، سفرنامے، نشانِ راہ، ایک صدی کا قصہ دلچسپ اور معلومات افزا فلر، دیس بدیس کا حال احوال اور بہت کچھ قاری کی ذہنی سرشاری کے لیے چشم براہ رہتا ہے۔ یوں زندگی کے ساتھ ساتھ چہارسو کے اوراق، حرفوں کی پذیرائی، مفاہیم کی شناسائی اور طرزِ ادا کی دلربائی لئے پلٹتے چلے جاتے ہیں۔

''فرحت باجی'' پُر لطف بیانیے کے ساتھ شگفتہ اُسلوب میں لکھا گیا اور بین السطور مزاح کی زیریں لہریں مزید دلچسپی کا بڑھاتی ہیں۔ نگہت افروز اپنی تمام تر نایاب خوبیوں اور کمیاب اچھائیوں کے باوجود پس منظر میں رہیں جبکہ فرحت باجی کا جادو سر چڑھ کے بولتا رہا۔ کیوں کہ جن اوصاف و اطوار سے وہ ہمکنار تھیں انہوں نے نہ صرف دیگر بلکہ کامران بھائی کو بھی اُن کا معترف و مداح ہی نہیں بلکہ مترنم ہنسی سے تادمِ آخر مسحور بھی کئے رکھا ہیں۔ یہ مستنز ادمری اور ایوبیہ کے سفر پکنک کی سی کیفیت اور تفریحاتی سماں کی عکاسی کرتے ہیں جس میں قارئین برابر اُن کے ہمسفر اور جملہ مراحل میں شریک رہے جو مطالعے کے اسیر ہونے کے مترادف ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

چہارسو ابھی چند روز قبل ملا ہے۔ اتنا عمدہ جریدہ اس باقاعدگی سے نکالنا یقیناً آپ کا اختصاص ہے جس پہ آپ مبارک باد کے اہل ہیں!

اس کی شاندار روایت ہر دفعہ اک گوشہ مخصوص جہاں آپ چُن چُن نگینے جمع کرتے ہیں، پچھلا گوشہ محترمہ طاہرہ اقبال پہ تھا جو یقیناً ہمارے شہر کا فخر ہیں اور اس دفعہ آپ نے محترم عبدالصمد صاحب سے ملاقات کروادی، اُن پہ عمدہ مضامین ہی نہیں اُن کے افسانوں نے بھی ایک انوکھی دُنیا وا کی مجھ پہ! بلاشبہ ایک بڑا تخلیق کار۔

ابھی جریدے کا مطالعہ جاری ہے۔ چیدہ چیدہ کچھ تحاریر جو نظر سے گزریں نے روک لیا ٹھہر جانے پہ مجبور کر دیا! اُن میں شامل آصف ثاقب، غالب عرفان، نسیم سحر اور ڈاکٹر جواز جعفری کا کلام ہے۔

افسانوں میں ابھی نیّر اقبال علوی صاحب کو پڑھا، روح کے تجربوں کو بیان کرنے کی جو مہارت درکار ہوتی ہے وہ اُن کے افسانے کو پڑھ کر نظر آئی کہ پختہ تجربہ تھا۔ ایک کالم جاوید چودھری کا پڑھا تھا جس میں روح کے وزن کی بات کی تھی جو یہی بیس گرام تھے۔ اس بیس گرام کا پانچ سو کلومیٹر فی سیکنڈ دوڑتی اس

کائنات میں کیا جلوہ ہے دیکھ لیجیے۔!

فرحت باجی گر اجازت دیں تو میں اِسے خاکہ کہوں گی آپ، آپ کے دکھ درد زندگی اس میں اتنے حاوی تھے اور فطری کہ مجھے یونہی لگا کہ آپ نے اپنی عزیز ہستی کا خاکہ بیان کیا۔ سادہ اور دلنشیں ۔۔۔ اثر پزیر!

دیپک کنول نے ''نمی'' کی حیات کا ورق، اک سنہرا دور سامنے رکھ دیا، اچھا لگا۔

سیمیں کرن (فیصل آباد)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''رس رابطے'' (خطوط) کے بعد ''براہ راست'' کا مطالعہ کیا۔ آپ کے گہرے اور تیکھے سوالات کے جوابات دلچسپ تھے مگر کچھ سوالوں کے جوابات عبدالصمد صاحب گول کر گئے۔ آپ نے ایک نئے اور اچھے (میرے لیے) تخلیق کار سے ملوایا ہے جس کے لیے ممنون ہوں۔ ''ہونی ان ہونی'' افسانہ بہت مضبوط ہے۔ کہانی میں تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے۔ ناول کا باب ''اجالوں کی سیاسی'' ابتدا ہی سے اپنی گرفت میں قاری کو باآسانی لے لیتا ہے۔ فجل، فجلو اور فجل امام (مولوی فضل امام) دلچسپ کردار ہے۔ شافع قدوائی کا مضمون ''باریابی تمنا کی'' عبدالصمد کے ناول ''شکست کی آرزو'' پر بامعنیٰ تحریر ہے اور ناول کو تخلیقی اظہار کے یکسر حسی بیانیہ کو قائم کرتا ہے۔'' آغا سہیل نے ناول ''دو گز زمین'' پر مختصر مگر منفرد تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی ترجمہ کردہ کہانی ''دو گز زمین'' ذہن و روح کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ''ہرش'' کی انسان دوستی، انسانیت کا اعتبار قائم کرتی ہے۔ سیاہ فام سے سفید فام طبقے کا جانوروں سے بھی بدتر سلوک بہت تکلیف دہ ہے۔ آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ناانصافی اور ظلم کا طریقہ ضرور بدلا ہے۔ بوڑھے غم زدہ باپ کا یہ مکالمہ نوحہ ہے۔

''اس کا سانس تھوڑا بہتر ہوا تو ۔۔۔ میرا بیٹا کم عمر اور دبلا پتلا تھا وہ اتنا بھاری نہیں تھا۔'' (ص۔۷۶)

شہناز خانم عابدی کے افسانچے ''روزی کمانے کا طریقہ'' میں پیش کی گئی کہانی سے ہمارا ہر دن واسطہ پڑتا ہے۔ ''پروٹیکشن'' کا آخری مختصر اقتباس اضافی ہے۔ افسانچہ 'میری کو اپنے ساتھ لے گئے'' اس جملے پر ختم ہو جاتا ہے۔ محترمہ عذرا اصغر کا افسانہ ''بے ڈھب'' متاثر کن ہے اُن کا بیانیہ سادہ ہے مگر جاندار ہے۔ شب و روز کی تلخیوں اور رشتوں کی بے اعتباری کے درمیان گلزار جاوید کا افسانہ ''فرحت باجی'' مطمئن زندگی اور نیت کی پاکیزگی کی ایسی پُر اثر کہانی ہے جو مشرقی خاندان روایات اور رشتوں کے احترام کی یاد دلاتی ہے۔ یہ نعمتیں اب ہمارے معاشرے سے ختم ہوتی جا رہی ہیں اس کا کسے دوش دیں۔ افسوس آج کل ہر چینل پر ایسے ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں جس میں رشتوں کی بے اعتباری اور خاندان کے افراد میں معمولی معمولی باتوں پر اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے نہ جانے کس کے ایجنڈے پر کام ہو رہا ہے۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول نے پچاس کی دہائی میں ہزاروں لوگوں کے دلوں پر راج کرنے والی پرکشش اداکارہ ''نمی'' کی داستان حیات کو دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ محترمہ پروین شیر نے ''چند سیپیاں سمندروں سے'' میں ایک سحر قائم کیا ہوا ہے لاجواب اندازِ تحریر ہے۔ بہت خوب، حسن منظر صاحب کی زندگی کے چند اوراق ''گردشِ ایام' انتہائی دلچسپ اور اپنے اندر ایک تاریخ لیے ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ حسن منظر ایک منفرد افسانہ نگار و ناول نویس ہیں اُن کی کئی کتابیں آ چکی ہیں۔ یونس صابر کی نظم ''ایسا نہ ہوا تو پھر لب پہ دعا ہے'' ہمارا سیاسی نوحہ ہے۔ ڈاکٹر انیس الرحمٰن کی ''والدہ محترمہ کی یاد میں'' نظم میں عقیدت و محبت کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ فیصل عظیم اور یوگیندر بہل تشنہ کی نظمیں موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے اچھی لگیں۔ آصف ثاقب اور عبداللہ جاوید کی غزلوں میں سادگی بلا کی ہے۔ محمود شام، نسیم سحر، عارف شفیق، ڈاکٹر جواز جعفری، ابراہیم عدیل کی غزلوں کے اشعار میں داخلی و خارجی کیفیت کے مختلف زاویے نمایاں ہیں۔ غالب عرفان کی ''حمد'' اور سبیلہ انعام صدیقی کی ''نعت'' میں عاجزی کے ساتھ فکر کے دریچے روشن ہیں۔ شگفتہ نازلی نے بصورت نظم تخلیق کار اور اداکار کمال احمد رضوی کو خراج تحسین پیش کیا ہے جو کہ بہت اچھا لگا۔ محترم فاری شا نے ''وسعت بیاں'' میں اہم اور بڑے قلمکاروں کے خطوط کے اقتباسات سے عبدالصمد کی تخلیقی صلاحیتوں اور فکر کو خوب صورتی سے نذرِ قرطاس کیا ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

مکرمی و محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

جولائی اگست ۲۰۱۶ء کا ماہنامہ چہارسو موصول ہوا بے حد خوشی ہوئی۔ اس مرتبہ قرطاس اعزاز کا شرف جناب عبدالصمد کا مقدر ٹھہرا۔ اُن کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کی نگاہ انتخاب ٹھیک جگہ پر پڑی۔ وہ ایک منجھے ہوئے قلم کار ہیں اُن کے قلم پر جدیدیت کا اثر بہت گہرا ہے۔ وہ پڑھنے والوں کو اپنے طرزِ بیان کے حصار میں جکڑ لیتے ہیں جس کا اثر دیر تک ذہن پر طاری رہتا ہے۔ براہِ راست میں آپ کے سوالوں پر اُن کے جوابوں کی روشنی میں اُن کی فکر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ افسانوں میں اس دفعہ بڑے لوگوں کے افسانے شامل تھے۔ لیکن مجھے آپ کا افسانہ ''فرحت باجی'' بہت پسند آیا۔ آپ نے ایک خوبصورت اور یادگار کردار تخلیق کیا۔

حرف و بیان پر آپ کو بڑی دسترس حاصل ہے۔ میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ چہارسو میں چھپنے والی ہر تحریر قابل توجہ ہوتی ہے۔ فیروز عالم صاحب کا ترجمہ ایک خاصے کی چیز ہے۔ البتہ ''زہریلا انسان'' آہستہ آہستہ اپنا تاثر کم کرتا جا رہا ہے۔ پروین شیر کا سفر نامہ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' پسندیدہ سفر نامہ ہے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

...... مقالاتِ سلطان باہوؒ ......

شعبہ پنجابی نے حضرت سلطان باہوؒ کی دینی وملی خدمات اوران کی شاعرانہ وصوفیانہ کلام کی تشہیر کے لیےاور عام لوگوں تک ان کے پیغام کو پہنچانے کے لیے جس احسن طریقے سے سلطان باہو سیمینار کا انعقاد کیا ہے لائقِ تحسین بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔اس سیمینار میں پیش کیے جانے والے مضامین ومقالات کو کتابی شکل میں ترتیب دیا گیا اور اس کتاب کو ادارہ تصنیف وتالیف وترجمہ نے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے تا کہ یہ مقالات باہوشناسی کے فروغ میں مثبت کردار ادا کرسکیں اور ان سے اساتذہ اور طلبہ بھی فیض حاصل کرسکیں۔میرے نزدیک یہ ایک احسن اقدام ہے اور اولیاء اور صوفیاء کی تعلیمات کو عام کرنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں بخشش کا ذریعہ بھی ہے اس لیے میں کتاب کے مرتبین ڈاکٹر طاہر تونسوی اور ڈاکٹر عاصمہ غلام رسول کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ جنہوں نے ان تحریروں کو کتابی شکل میں محفوظ کردیا ہے۔مجھے امید ہے کہ یہ کتاب باہوشناسی اور باہوفہمی میں معاون ثابت ہوگی۔

......**ڈاکٹر ذاکر حسین رانا**

قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد۔

...... مکالمہ ......

مکالمہ۔۲۳، جون تا اگست ۲۰۱۶ء منظر عام پر آ گیا ہے۔حرفِ آغاز کے عنوان سے اسد محمد خاں۔ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی، ظفر اقبال۔درگشت ۲، ڈاکٹر اسلم انصاری/ ہما عمانوئل۔عزیز احمد کے افسانوں کا اسلوبیاتی اور عمرانی مطالعہ: مختصر گفتگو، پروفیسر سحر انصاری۔ڈاکٹر اسلم فرخی کی چند یادیں، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی۔اردو رسم الخط معنویت اور اندیشے، ارسلا ولز جونز/ باقر نقوی۔چوبی شوہر، احفاظ الرحمٰن۔بے زبانی ایک سفر کی یاد، بکھرتی ہوئی کہانیاں، بھیس بدل کر حملہ کرنے والا وغیرہ۔ایلس فیض/ سید مظہر جمیل۔بنام فیض، اصغر ندیم سید۔شاکر علی کے ہمعصر ادیب، انتظار حسین کے لیے، خواجہ رضی حیدر۔چہ باید کرو، علی تنہا۔ذکا الرحمٰن اپنے فن کے تناظر میں، ڈاکٹر رؤف پاریکھ۔کچھ اردو الفاظ ومرکبات اور اُن کی اصل، نجیبہ عارف۔راگنی کی کھوج میں، حسن عباس رضا۔ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، طاہر مسعود۔دکھیاری پھوپھو، رضی مجتبیٰ۔نعتیہ ادب کی ایک اہم دستاویز، کرن سنگھ۔نجم الحسن کے بہترین افسانے، ایم خالد فیاض۔دریا کے سنگھ تنقیدی مطالعہ۔

......**محمد انعام الحق**

قیمت: ۳۰۰، دستیابی: اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی۔

...... وقت کا صحرا ......

منیرہ احمد شمیم کا دوسرا افسانوی مجموعہ ’’چاہت ایک سمندر‘‘ ان کے پہلے مجموعہ کی طرح اپنے دامن میں ایسی کہانیاں لئے ہوئے ہے جو سادہ مگر موثر بیانیہ میں زندگی کی مختلف قدروں اور تعلقات سے جنم لیتی ہیں۔منیرہ نے اپنے پہلے مجموعہ کے دیباچے میں لکھا تھا کہ ’’محبت اور درد کا رشتہ میرے افسانوں کا مرکزی موضوع ہے‘‘ اس مجموعے کی کہانیاں بھی محبت اور درد کے ان رشتوں کی مختلف جہتوں کی ترجمانی کرتیں ہیں۔ یہ رشتے فرد سے اجتماع تک مختلف حوالوں سے اپنی پہچان کراتے ہیں۔منیرہ احمد شمیم کا فنی کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان احساسات کو کہانی کی شکل عطا کی ہے۔ایک ایسی کہانی جو اپنی تاثیر سے، اور یہ تاثیر ان کے اندازِ بیاں کی مرہونِ منت ہے، قاری کو تادیر اپنی سحر انگیز فضا میں لئے رہتی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ’’تنہائی میرے اندر کہانیاں بنتی ہے‘‘ یہ تنہائی دراصل وہ تخلیقی کرب اور الاؤ ہے جس میں پک کر رشتے انمول ہوتے ہیں۔تنہائی اضطراب کی ایک کشفی صورت ہے اور مضطرب رہنا تخلیقی جہت کی نمائندہ ہے۔منیرہ نے اپنی تنہائی سے جو امرت کشید کیا ہے وہ ان کی کہانیوں میں ایک تخلیقی مٹھاس پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی معنویت میں دبازت پیدا کرتا ہے۔تنہائی کے ساتھ ایک مثبت وابستگی شامل نہ ہو تو الجھاؤ جنم لیتے ہیں۔منیرہ کی تنہائی ایک مثبت پہلو لئے ہوئے ہے اسی لیے ان کی کہانیاں الجھاؤ کا شکار ہیں۔ان میں زندگی کی ہماہمی اور دکھ درد دونوں پہلو موجود ہیں۔ان کے اسلوب میں جو ایک رومانوی شیرینی ہے اُس نے ان کی کہانیوں میں تاثیر تو پیدا کی ہی ہے، قاری کے لیے بھی مسرت کا ایک پہلو شامل کردیا ہے۔انہیں احساس اور واقعہ کو کہانی بنانے کا فن آتا ہے اور اسے بیان کرنے کا انداز انہیں ایک منجھے ہوئے کہانی کار کا رتبہ عطا کرتا ہے۔

......**ڈاکٹر رشید امجد**

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: سانجھ پبلی کیشنز، لاہور۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
جیا کومیتی کے سپنے
جیت پہار
دستک
(افسانے)
محبت سے خالی دنوں میں
علی محمد فرشی